فکشن ہاؤس کا کتابی سلسلہ (22)

سہ ماہی

# تاریخ

خاص نمبر: کولونیل ازم برصغیر ہندوستان میں

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی


مشاورتی بورڈ

قاضی جاوید

ڈاکٹر سید جعفر احمد

سعود الحسن خان


18- مزنگ روڈ لاہور

## مجلّہ ''تاریخ'' کی سال میں چار اشاعتیں ہوں گی

### خط و کتابت (برائے مضامین)


بلاک 1، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ

فون: 6665997

ای میل: lena@brain.net.pk


### خط و کتابت (برائے سرکولیشن)


| | | |
|---|---|---|
| پبلشرز | ☚ | فکشن ہاؤس |
| | ☚ | 18- مزنگ روڈ لاہور |
| فون | ☚ | 7249218-7237430 |
| قیمت فی شمارہ | ☚ | 100 روپے |
| سالانہ | ☚ | 400 روپے |
| قیمت مجلد شمارہ | ☚ | 150 روپے |
| بیرون ممالک | ☚ | 2000 روپے (سالانہ معہ ڈاک خرچ) |

رقم بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام فکشن ہاؤس لاہور، پاکستان

| | | |
|---|---|---|
| اہتمام | ☚ | ظہور احمد خاں |
| کمپوزنگ | ☚ | فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور |
| پرنٹرز | ☚ | حاجی حنیف پرنٹرز لاہور |
| سرورق | ☚ | عباس |
| تاریخ اشاعت | ☚ | جولائی 2004ء |

# ضمیر نیازی کی یاد میں

# فہرست



## مضامین

## نقطۂ نظر



## تحقیق کے نئے زاویے



## تاریخ کے بنیادی مآخذ

ہندوستان کی معاشی تاریخ سے اقتباسات (جلد اول و دوم)

مصنف: رمیش دت

مترجم: غلام ربانی تاباں

ترقی اردو بورڈ نئی دہلی

# ابتدائیہ: تاریخ کانفرنس

ڈاکٹر مبارک علی

سہ ماہی تاریخ کی اشاعت کے ساتھ ساتھ، اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ ملک کے تعلیمی اداروں کے ساتھ مل کر تاریخ کے مختلف موضوعات پر کانفرنسیں کرائی جائیں تاکہ تاریخ کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں وہ دور ہوں، اور وہ تاریخ کے پہلو کہ جنہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے انہیں سامنے لایا جائے۔

اس مرتبہ چھٹی تاریخ کانفرنس کراچی میں ریجنٹ پلازہ ہوٹل میں ''ماہنامہ بدلتی دنیا'' اور ''اردو یونیورسٹی'' کے تعاون سے ہوئی، جس میں تقریباً 400 افراد نے شرکت کی اور آخر وقت تک خاموشی سے طویل اور تحقیقاتی مقالوں کو بغور سنا۔ سیشن کے آخر میں سوالات و جوابات میں بھی حاضرین نے حصہ لیا۔

اس کانفرنس کی کامیابی میں سہ ماہی تاریخ خاص طور سے ''بدلتی دنیا'' اور اس کے کارکنوں کا مشکور ہے کہ جنہوں نے دن رات کی محنت سے اسے کامیاب کرایا۔ اردو یونیورسٹی کی جانب سے پروفیسر توصیف نے یونیورسٹی کا بھرپور تعاون حاصل کیا، جس کی وجہ سے طالب علموں اور اساتذہ کی بڑی تعداد نے اس میں شرکت کی۔ فکشن ہاؤس نے حسب معمول اس کانفرنس کے انعقاد اور تیاری میں برابر کا حصہ لیا۔

اس شمارے میں وہ تمام مضامین شامل ہیں کہ جو اس کانفرنس میں پڑھے گئے۔ ادارہ مصنفین کا مشکور ہے کہ جنہوں نے محنت سے ان تحقیقی مقالات کو لکھا۔ اور اپنے خرچ سے اس کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے اور ''شام غزل'' میں پرویز مہدی نے اپنی موسیقی اور مترنم آواز

سے سامعین کو احساس مسرت دیا۔ خاص طور سے کراچی میں لوگ ایسی شاموں کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ اسلم گورداسپوری بھی اس سفر میں ہمارے ساتھ تھے ہم ان کے بھی مشکور ہیں۔ کانفرنسیں اور محفلیں دوستوں کے تعاون سے کامیاب ہوتی ہیں۔ اس کانفرنس میں کراچی کے دوستوں نے مالی تعاون کیا اور تمام اخراجات برداشت کئے، اس سلسلہ میں محمود بادیجہ خاص طور سے تعریف کے مستحق ہیں کہ وہ ان کاموں میں ہمیشہ آگے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی

جون 2004ء لاہور

# وضاحت: کولونیل ازم کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

کولونیل ازم کا اردو ترجمہ نوآبادیات کیا جاتا ہے، جو ایک طرح سے صحیح ہے۔ اس لئے جب اس اصطلاح کو ہندوستان اور دوسرے یورپی مقبوضہ ممالک کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ ملک کولونیل ازم، یا نوآبادیات کے دائرے میں نہیں آتے تھے۔ اس مسئلہ پر 19 اور 20 صدیوں میں برطانیہ بھی بحث ہوئی، کیونکہ اس اصطلاح کو امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، یا ان افریقی ملکوں کے لئے کہ جہاں یورپی آباد ہوئے اور اپنی نوآبادیات قائم کیں، وہاں تو یہ صحیح ہے، مگر ہندوستان اور دوسرے ایشیا و افریقہ کے ملکوں میں جہاں نوآبادیاتیں قائم نہیں ہوئیں، وہاں اس اصطلاح کا استعمال صحیح نہیں ہے۔

دراصل کولونیل ازم کی یہ اصطلاح رومیوں سے لی گئی ہے، جن کا یہ دستور تھا کہ مقبوضہ علاقوں میں اپنی نوآبادیات قائم کرتے تھے تاکہ ان کے ذریعہ سے مقامی لوگوں پر اپنے تسلط کو برقرار رکھ سکیں۔ اس لئے مقبوضہ علاقوں کے لئے کولونیل ازم کی اصطلاح استعمال ہونے لگی۔ اصطلاحات وقت کے ساتھ اپنے معنی بھی بدل دیتی ہیں، اس لئے آج اس کو جس مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے، وہ سیاسی تسلط اور اقتدار کے لئے ہے، اور اس مفہوم میں اب یہ استعمال ہوتی ہے۔

تاریخ میں جب کوئی ملک کولونیل ازم کا شکار ہوا، تو اس کے نتیجہ میں اس کی اپنی تہذیب، کلچر اور روایات ٹوٹیں، اور تہذیب کا جو تسلسل چلا آ رہا تھا، اس میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں، اس کے برعکس کولونیل طاقتوں نے اپنی تہذیب اور کلچر کو مقبوضہ علاقوں پر مسلط کیا۔ سب سے بڑھ کر یہ

مقبوضہ علاقوں کے ذرائع کا استحصال کر کے، وہاں کے عوام کو افلاس سے دوچار کیا۔ ان کی تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے ان کی اقتصادی صورت حال کو بگاڑا، اور صورت حال یہاں تک پہنچی کہ مقبوضہ ممالک مکمل طور پر ان پر انحصار کرنے لگے۔ لہٰذا اب کولونیل ازم کی اصطلاح کو انہیں معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے، اور اسی نقطۂ نظر سے اس کے اثرات کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔
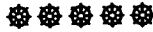
❁❁❁❁❁

مضامین
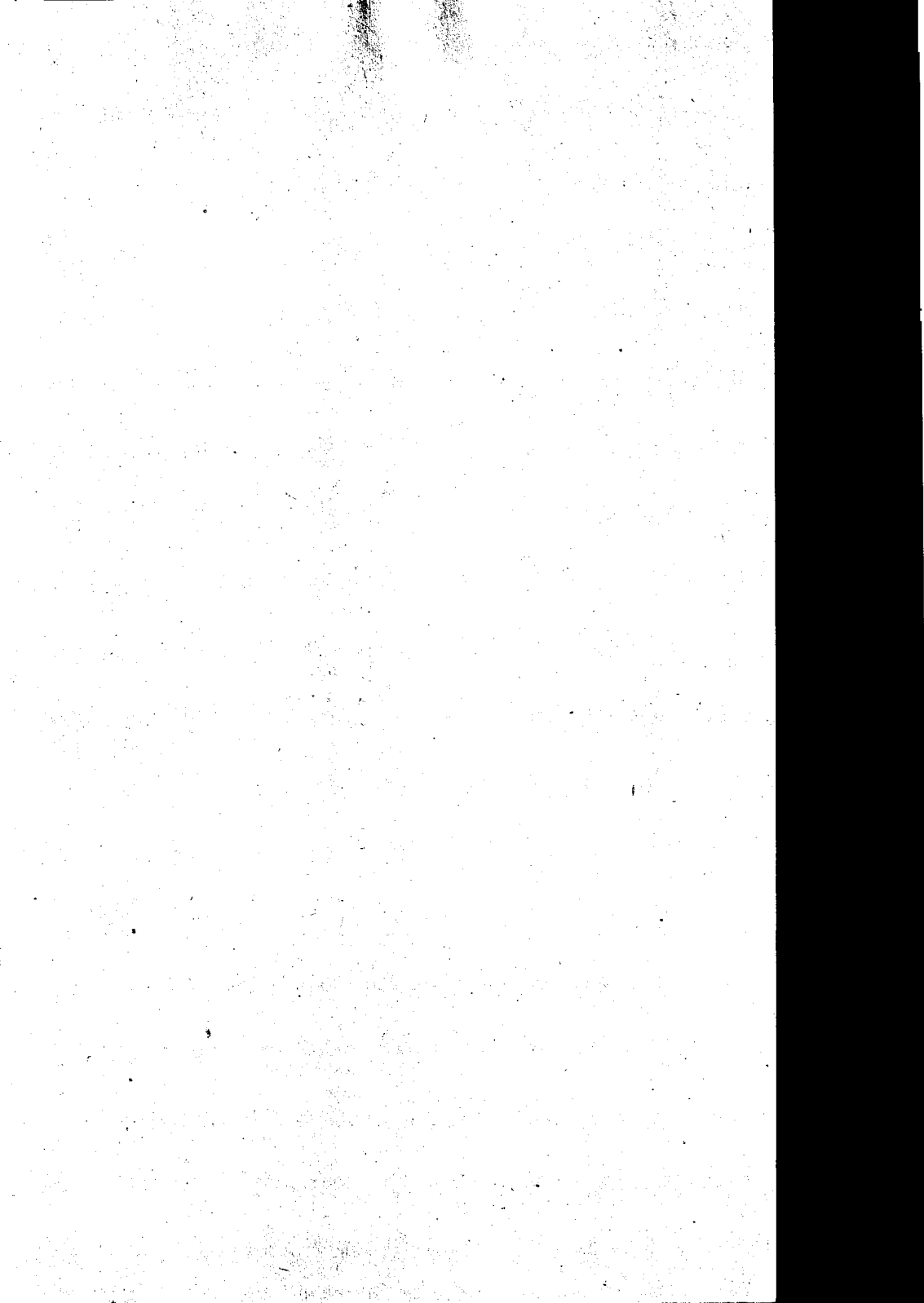
# کولونیل آئڈیالوجی اور اس کی بنیادیں

ڈاکٹر مبارک علی

ایس۔ایچ۔الاتاس نے کارل من ہائم (Karl Manuheim) کے خیالات کو اخذ کرتے ہوئے آئیڈیالوجی کی تعریف اس طرح سے کی ہے کہ یہ خیالات وافکار اور عقائد کا وہ نظام ہے جو ایک خاص سیاسی، سماجی، اور معاشی نظام کو صحیح اور درست تسلیم کرتا ہے۔ ساتھ ہی وہ ان خیالات وعقائد کی مخالفت کرتا ہے کہ جو اس سے متضاد ہوں۔ آئیڈیالوجی اپنے بنیادی نظریات کو پس پردہ رکھتی ہے، اور ایسے منصوبوں کو سامنے لاتی ہے کہ جو بظاہر غیر جانبدار معلوم ہوتے ہیں، مگر در پردہ وہ اس کے بنیادی مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں۔ مزید برآں اس میں مطلق العنانیت ہوتی ہے کہ جس کی وجہ سے وہ دوسرے خیالات کو برداشت نہیں کرتی ہے۔ چونکہ فکری طور پر یہ محدود دائرے میں ہوتی ہے، اس لئے یہ ایک خاص جماعت اور گروپ کے مفادات کو پورا کرتی ہے، جب یہ اقتدار میں آتی ہے تو اس صورت میں اپنے ماننے والوں، اور ان لوگوں پر کہ جن پر اس کا تسلط ہو۔ ان میں ایک جھوٹا شعور پیدا کرتی ہے۔ خود کو درست اور صحیح ثابت کرنے کی غرض سے یہ سائنس، تاریخ، اور دوسرے علوم کے خیالات وافکار کو مسخ کر کے پیش کرتی ہے۔(1)

اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے، جب ہم کولونیل آئیڈیالوجی کی تشکیل کے پس منظر کو دیکھتے ہیں، تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نئے سمندری راستوں کی دریافت، نئی دنیا تک پہنچ، اور رینا ساں کے بعد سے نئے خیالات وافکار کی تخلیق، اس کی تعمیر میں شامل ہے۔ جے تندر بجاج نے اپنے مضمون، ''بیکن، جدید سائنس کا پہلا مفکر'' میں کولونیل آئیڈیالوجی کی تشکیل کے پہلے مرحلہ کا ذکر

کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے فلسفہ کا سب سے زیادہ اثر یہ ہوا کہ، اس نے علم کو خیر و شر سے آزاد کردیا، علم کا مقصد طاقت کا حصول اور دوسروں پر تسلط حاصل کرنا تھا۔ اس طرح اس نے عیسائیت کی رحم دلی اور محبت کو افادیت اور طاقت کے تصور میں بدل دیا۔ اس کے نزدیک طاقت کے نزدیک اچھائی اور برائی کا کوئی فرق نہیں، بلکہ اس کا اولین مقصد حصول دولت و اقتدار ہے۔ لہٰذا وہ حکمرانوں کو مشورہ دیتا ہے کہ طاقت و اقتدار کے حصول کی خاطر نالج پر کنٹرول کریں، کیونکہ جب تک ریاست کا اس پر کنٹرول رہے گا، اس وقت تک اقتدار بھی محفوظ رہے گا۔

طاقت کے بارے میں بیکن کا تصور ہے کہ اس کا اولین مقصد فطرت پر قابو پانا ہونا چاہئے، اس سلسلہ میں لوگوں پر تسلط بھی آ جاتا ہے، کیونکہ لوگ بھی فطرت کا ایک حصہ ہوتے ہیں، اس طرح اس میں اقوام پر تسلط بھی شامل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا طاقت کو نہ صرف فطری ذرائع کے استحصال میں استعمال کرنا چاہئے، بلکہ اس کے ذریعہ دوسری اقوام کو بھی غلام بنا کر انہیں اپنے مفادات کے لئے کام میں لانا چاہئے۔ (2)

کولونیل آئیڈیالوجی کی مرحلہ وار تشکیل کے عمل میں، اس کے حامی اپنے نظریہ کی سچائی پر کامل یقین رکھتے تھے، اس لئے ان میں تشدد کے جذبات پوری طرح سے کارفرما ہو جاتے تھے۔ وہ ان تمام عناصر کو تباہ و برباد کرنا چاہتے تھے کہ جو ان کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ اس شدت کا مظاہرہ ہم یورپی تسلط شدہ کالونیز میں دیکھتے ہیں کہ جہاں انہوں نے ہر مخالفت اور بغاوت کو تشدد اور سختی کے ساتھ کچل دیا تھا۔

اٹھارہویں صدی میں یورپ میں صنعتی انقلاب، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں نے اس میں ایک نیا اعتماد پیدا کیا۔ یورپی ترقی کو انہوں نے بطور ''معجزہ'' کے لیا، کہ جس میں ایک جانب الٰہی رضامندی اور برکت شامل تھی، تو دوسری جانب یورپی اقوام کے کردار کی خصوصیات کہ جن کی وجہ سے وہ دوسری اقوام کے مقابلہ میں ترقی کر رہے تھے۔ اس لئے ترقی کا نظریہ تاریخ میں اس عمل کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ جس میں قومیں بغیر کسی رکاوٹ کے برابر آگے کی جانب چلی جاتی ہیں۔ یہ سیدھی لکیر (Linear) والا نقطۂ نظر، اس سے مختلف تھا کہ جس میں قومیں ایک سرکل میں گردش کرتی تھیں۔ اور اس سے باہر نکلنے کے لئے ان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا ترقی کے

اس نظریہ کی بنیاد ''الٰہی مشن'' اور ''تہذیبی برتری'' پر تھی۔ اس الٰہی مشن کی کامیابی وہ ان نشانات سے سمجھتے تھے کہ جو فتوحات کے ذریعہ انہیں مل رہے تھے۔ اس لئے جب اہل برطانیہ نے ہندوستان میں مسلسل کامیابیاں حاصل کیں، تو ان میں انہیں خدا کی رضا شامل نظر آئی، رچرڈ کانگریو (Richard Congreve) جو بشپ آف آکسفورڈ تھا، اس نے اس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''خدا نے ہندوستان کو ہمیں عطا کیا ہے تا کہ ہم اسے اپنے تسلط میں رکھیں۔ لہٰذا یہ ہمارا کام نہیں کہ اس فرض سے دستبردار ہو جائیں۔'' (3)

1877 میں دہلی میں دربار سے خطاب کرتے ہوئے'' گورنر جنرل اور وائسرائے لارڈ لٹن (Lytten) نے کہا کہ ہندوستان میں برطانیہ کی کامیابی مشیت ایزدی کے مطابق ہے۔ یہ الٰہی خواہش اور مرضی تھی کہ جس نے ہندوستان کو ان عظیم حکمرانوں کے نالائق جانشینوں سے چھین لیا کہ جنہوں نے اس ملک کے امن وامان اور خوش حالی کو برباد کر دیا تھا۔ تیمور کے جانشین ہندوستان کی ترقی میں ناکام رہے، لہٰذا اس ملک کا اقتدار خدا نے اہل برطانیہ کو دیا ہے تا کہ وہ یہاں امن و امان قائم کر کے اسے خوش حال بنائیں۔ (4)

کولونیل ازم کا دوسرا مشن تہذیبی تھا۔ مہذب، اور غیر متمدن و وحشی کے درمیان فرق کو اہل برطانیہ نے آئر لینڈ پر قبضہ کے بعد اختیار کیا، تا کہ اس کی بنیاد پر وہ اس پر حکومت کر سکیں۔ کیونکہ ایک مرتبہ جب کسی قوم کو غیر متمدن یا انسانیت سے گرا ہوا ثابت کر دیا جائے تو پھر یہ مہذب اقوام کا حق ہو جاتا ہے کہ ان پر حکومت کریں اور ان کی تربیت کریں۔ بعد میں اس نظریہ کا اہل یورپ اور خصوصیت سے برطانیہ نے امریکہ، افریقہ، اور ہندوستان پر اطلاق کیا۔ تہذیبی مشن میں ہم کولونیل طاقت، اور مفتوح کے درمیان اس فرق کو اور کئی طرح سے دیکھتے ہیں: مثلاً ترقی شدہ و پس ماندہ، ایماندار و بے ایمان، محنتی و سست وغیرہ۔ یورپی اقوام، خود کو دوسری قوموں کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ اور باصلاحیت سمجھ رہی تھیں۔ اس لئے ان کی دلیل تھی کہ وہ سیاسی و معاشی تسلط کے ذریعہ دوسری قوموں کو نہ صرف مہذب بنائیں گی، بلکہ ان کے ذرائع کو استعمال کر کے انہیں خوش حالی بھی دیں گی۔ اس دلیل کے مطابق جو قومیں اس قابل نہیں کہ اپنے ذرائع کا استعمال کر سکیں۔ ان کا یہ حق نہیں رہتا کہ وہ ان کی ملکیت کا دعویٰ کریں۔ یہ ان اقوام کی ذمہ داری ہے کہ وہ

جو مہذب، ترقی یافتہ، اور باصلاحیت ہیں وہ ان ذرائع کو استعمال کر کے انسانیت کی خدمت کریں۔ اس دلیل کو آگے بڑھاتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ وہ قومیں جنہوں نے مشینیں ایجاد کی ہیں، ٹیکنالوجی کو آگے بڑھایا ہے، وہی ان کے استعمال کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ پس ماندہ اقوام ان پیچیدہ مشینوں اور ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے استعمال سے ناواقف ہوتی ہیں، اس لئے انہیں اس سے دور رہنا چاہئے اور یورپی اقوام کو یہ حق دینا چاہئے کہ وہ ان کے استعمال سے، ان کے ملک کے ذرائع کو دریافت کریں، اور پھر ان کا استعمال کریں۔ (5) اہل برطانیہ دوسری یورپی اقوام کے مقابلہ میں خود کو اور زیادہ مہذب سمجھتے تھے۔ اس لئے جب ان کی امپائر میں پھیلاؤ آیا، تو ان کا یہ تہذیبی مشن کولونیل آئیڈیالوجی کی بنیاد بن گیا۔

1828 میں ہیس کی سن (Huskisson) نے کہا تھا کہ

> انگلستان ایک محدود علاقہ میں رہنا پسند نہیں کر سکتا ہے...... ہم نے دنیا کے ہر حصہ میں آزادی، تہذیب اور عیسائیت کے بیج بو دیئے ہیں۔ دنیا کے ہر حصہ میں ہم اس زبان، آزاد اداروں اور قانون کے نظام کو لے گئے ہیں کہ جو اس ملک میں موجود ہیں۔ دنیا کے ہر علاقے میں ہماری موجودگی کی وجہ سے ترقی اور خوش حالی میں اضافہ ہو رہا ہے...... ہم اس پرانی دنیا کے سب سے اولین خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنی شان و شوکت اور عظمت کے حصول پر خوش ہونا چاہئے، جو خوش حالی اور مسرت ہمارے پاس ہے، ہمیں اسے دوسری اقوام کو بھی دینا چاہئے، جو کہ رشتہ، عادات اور جذبات میں ہم سے تعلق رکھتی ہیں۔ (6)

خاص بات یہ ہے کہ اس میں مفتوح اقوام شامل نہیں ہیں اس لئے کولونیل آئیڈیالوجی کے تہذیبی مشن کے اہم عناصر یہ تھے کہ: کالونی کے سرمایہ اور ذرائع پر کنٹرول کرنا، سیاسی اقتدار کو حاصل کرنا کالونی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا کم سے کم استعمال کرنا اور اس کی تجارت پر اپنی اجارہ داری کو مضبوط کرنا۔ لہٰذا ان کا خیال تھا کہ مہذب قوموں کی نگرانی میں رہتے ہوئے پس ماندہ قومیں خود کو بہتر بنا سکتی ہیں۔

ہندوستان میں جو برطانوی منتظمین آئے تھے، وہ پبلک اسکولوں کے تعلیم یافتہ تھے، کہ

جہاں ان کا آئیڈیل رومن امپائر تھی: اس کی تاریخ، اور اس کا کارنامے پڑھنے کے بعد وہ برطانوی امپائر کو بھی اسی ماڈل پر تشکیل کرنا چاہتے تھے۔ اس ماڈل میں حکمراں طبقوں اور شکست خوردہ اقوام کے درمیان زبردست فرق تھا۔ اقتدار کا ذریعہ فوجی طاقت وقوت اور تشدد پر تھا۔ اس وجہ سے ان میں برتری، فعالیت اور عظمت کا احساس تھا۔ جب کہ اہل ہندوستان ان کے لئے کم تر مخلوق تھے۔ اس ذہنیت نے انہیں کالونی اور اس کے لوگوں لے بارے میں منفی جذبات پیدا کرنے میں مدد دی۔ مثلاً اہل برطانیہ کے نزدیک اہل ہندوستان کا مذہب توہمات کا مجموعہ، اور ادب لغویات کا مرقع تھا۔

مہذب بنانے کے عمل میں جو کارروائی ہوئی، اس نے اہل ہندوستان کا فطرت سے رشتہ توڑ دیا، ان کی زراعت اور فصلوں کی پیداوار کو تبدیل کر دیا، کلچر کے تنوع کو ختم کر کے یکسانیت کو پیدا کیا گیا۔ نالج کے بارے میں یہ کہا گیا کہ صرف یورپی نالج مفید ہے، جب کہ مقامی نالج اور اس کی مختلف قسموں کو ختم کر دیا گیا۔ مقامی ٹیکنالوجی کو نظر انداز کر کے یورپی ٹیکنالوجی کو رائج کیا گیا، جس کی وجہ سے کالونی ہر پہلو میں ان کے زیر تسلط آ گئی۔ (7)

الاتاس نے کولونیل آئیڈیالوجی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یورپ میں جب صنعتی انقلاب آیا تو اس کی وجہ سے وہاں سے فیوڈل ازم کا خاتمہ ہو گیا، مگر کالونیز میں انہوں نے فیوڈل ازم کو برقرار رکھا۔ یورپی معاشرہ میں امیر وغریب کا طبقاتی فرق تھا، مگر کالونیز میں سب یورپی ایک ہو جاتے تھے۔ یورپ میں صنعتی عمل کے ذریعہ فیکٹریاں قائم کی گئیں، مگر کالونیز میں نہیں، اس کے برعکس یہاں پر ایسی فصلوں کو روشناس کرایا گیا کہ جو ان کی صنعت کے لئے خام مال کا کام دیں، چونکہ کالونیز میں صنعتی ترقی نہیں ہوئی اس لئے سائنس اور ٹیکنالوجی میں بھی یہ پس ماندہ رہیں۔ (8)

## ہندوستان اور کولونیل آئیڈیالوجی

ہندوستان میں اہل برطانیہ کا جیسے جیسے سیاسی اقتدار قائم ہوتا چلا گیا، اسی طرح سے کولونیل آئیڈیالوجی کی تشکیل بھی عمل میں آتی رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور کو ''مشرقی دور'' کہا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب کمپنی ہندوستان میں اس وقت اپنا اقتدار برقرار رکھ سکتی تھی

جب کہ اسے ہندوستانی کلچر سے واقفیت ہو۔ وارن ہسٹنگز (1783-1774) تک یہ رجحان رہا۔ اسی دور میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی (1784) قائم ہوئی۔ اور برطانوی مستشرقین نے ہندوستان کے ماضی کی دریافت اور شناخت میں پورا پورا حصہ لیا، کیونکہ کولونیل آئیڈیالوجی میں نالج یا علم کے ذریعہ رعایا پر کنٹرول کرنا اس کا ایک اہم حصہ تھا۔ لہٰذا ہندوستان کی تاریخ، اور کلچر کے بارے میں معلومات اکٹھی کی گئیں، ان کا انتخاب کیا گیا، اور پھر ان معلومات کو سیاسی طور پر استعمال کیا گیا۔ ہندوستانی معاشرے کو پس ماندہ اور روایتی ثابت کیا گیا تا کہ اس کی کولونیل مفادات کے تحت تشکیل کی جا سکے۔ اس لئے معاشرے میں قدیم و جدید کے درمیان ایک کش مکش کو پیدا کیا گیا، علم کے ذریعہ معاشرہ کو کنٹرول کرنے کی غرض سے نہ صرف مقامی زبانوں کو سیکھا گیا تا کہ مقامی لوگوں پر انحصار نہ رہے اور کمپنی کے منتظمین آزادانہ طور پر معاشرہ اور لوگوں تک رسائی حاصل کر سکیں، اس غرض سے زبانوں کی گرائمر کی تشکیل دی گئی اور ان کے رسم الخط بھی بنائے گئے۔ آثار قدیمہ کی دریافت کے بعد ان کی اشیاء کی نمائش کی گئی۔ تا کہ اس ذریعہ تہذیبی عمل کو سمجھا جائے۔ نجی جائیداد کے ادارے کو روشناس کرایا گیا، مردم شماری کا سلسلہ شروع ہوا، ہندوستان کے نقشے بنائے گئے اور زرعی نظام کو اپنے مفادات کے تحت شکل دی گئی۔

ہندوستانی ادب کو دریافت تو کیا گیا، مگر اس کا استعمال مفادات کے تحت کیا گیا۔ مثلاً کالیداس کے ڈرامہ شکنتلا کو ہندوستانی ادب کا قیمتی ہیرا کہا گیا، مگر اسے نصاب میں شامل نہیں کیا گیا، کیونکہ اس میں ایسی غیر اخلاقی باتیں ہیں کہ طالب علموں کے ذہن کو خراب کرتیں، لہٰذا اس نقطۂ نظر کے تحت مغربی ادب اخلاقی اور مشرقی ادب غیر اخلاقی ہو گیا، جب نصاب کا سوال آیا تو یہ دلیل دی گئی، طالب علموں کا ذہن بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ انہیں فارسی ادب سے نفرت دلائی جائے، تا کہ وہ اپنے ماضی پر فخر نہ کریں۔ (9) آگے چل کر جب انگریزی ادب تعلیمی نصاب کا حصہ ہوا تو، رومی، حافظ، سعدی، اور فردوسی کی جگہ، شیکسپیئر، ملٹن، شیلے وغیرہ نے لے لی۔ لہٰذا فارسی ادب، یا ہندوستانی ادب دنیا اور اخلاق کے بارے میں جو نقطۂ نظر پیدا کرتا تھا، اب اس کی جگہ یورپی نقطۂ نظر آ گیا کہ جس کے ذریعہ دنیا اور اس کے معاملات کو دیکھا جانے لگا۔

میکالے کے آتے آتے تعلیم کے بارے میں کولونیل نقطۂ نظر بدل گیا۔ 1835 میں اس نے حقارت سے کہا کہ عربی و فارسی علوم کے لئے صرف ایک شیلف چاہئے۔ اس لئے یورپ نے

جو علم پیدا کیا ہے اس کو ایک خاص حد تک، کولونیل مفادات کے تحت پڑھانا چاہئے۔ دلیل یہ تھی کہ مشرقی علوم کی سرپرستی نہیں کی جائے، کیونکہ اس کی وجہ سے ہندوستانی لوگ برطانوی حکومت سے دور ہو جائیں گے، اگر برطانوی نسلیں مشرقی ہو گئیں تو پھر حکمراں طبقوں اور رعایا کا فرق ختم ہو جائے گا۔

## ہندوستان اور زوال پذیر معاشرہ

کولونیل آئیڈیالوجی کا ایک اہم عنصر ہندوستانی معاشرہ کے زوال کا نظریہ تھا۔ اٹھارہویں صدی میں جب مغل خاندان انتشار کا شکار ہوا، تو خانہ جنگیوں، سازشوں، اور جوڑ توڑ نے حکومت اور اس کے اداروں کو ناکارہ بنا دیا تو اس کے اثرات معاشرے پر بھی ہوئے۔ اس کے نتیجہ میں مغل ریاست کی مرکزی حیثیت ختم ہوئی، علاقائی طاقتیں ابھریں، صوبائی حکومتیں قائم ہوئیں، تو اس تبدیلی کو اس طرح پیش کیا گیا جیسے ہندوستان اور اس کا معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ لہٰذا انتشار، بے چینی اور عدم تحفظ کے جذبات معاشرہ پر چھائے ہوئے تھے۔ ان حالات میں ایسٹ انڈیا کا اقتدار میں آنا صحیح ثابت ہو جاتا تھا، کیونکہ اس نے ہندوستان کو عدم استحکام سے نکال کر استحکام دیا، خانہ جنگی کی جگہ امن دیا، اور انتشار کی جگہ خاندان کی بالادستی دی، اس وجہ سے زوال برطانوی اقتدار کا ایک جواز ہے۔

زوال کو ایک اور نقطہء نظر سے بھی دیکھا گیا کہ اہل ہندوستان کا تعلق آریہ نسل سے ہے، جو کہ ایک برتر اور پاکیزہ نسل ہے، اہل یورپ کا تعلق بھی اسی نسل سے ہے، اس لحاظ سے دونوں میں یہ قدر مشترک ہے، مگر تاریخی عمل نے ہندوستان کی آریہ نسل کو آلودہ کر دیا ہے، یہاں پر مختلف نسلیں اور قومیں آتی رہی ہیں اور آریہ نسل کو آلودہ کر کے اس کی خاصیت کو ختم کرتی رہی ہیں، اس کے نتیجہ میں ہندوستانی آریہ اپنی نسلی خوبیاں ختم کر چکے ہیں۔ ان میں اس قدر بگاڑ آ چکا ہے، یہ اس حد تک زوال پذیر ہو چکے ہیں کہ ان کی آلودگی اور خرابی کو اب دور نہیں کیا جا سکتا ہے، یہ اب مستقل طور پر کمتر رہیں گے، اور یورپی نسل اپنی برتری کی بنا پر ان پر حکومت کرے گی۔ (10)

ایک اور نقطہء نظر میں زوال پر بحث کرتے ہوئے، اس کا اشارہ کیا کہ مسلمان معاشرہ بشمول ہندوستان کے مسلمان مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر زوال پذیر ہیں، اسی وجہ سے وسط ایشیا

میں روس ان کے ملکوں پر قابض ہو گیا ہے تو ایشیا و افریقہ میں یورپی اقوام نے انہیں شکست دے کر اپنا تابع بنالیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی اندرونی تخلیقی توانائی ختم ہو چکی ہے، لہٰذا اس کو جہاں سیاسی اعتبار سے اسی طرح دیکھا گیا کہ ان پر حکومت کرنا اب آسان ہے، وہاں مذہبی طور پر یہ سمجھا گیا کہ اس پس ماندگی اور خستہ حالی کی وجہ سے انہیں عیسائی بنانا بھی آسان ہے۔ اس سلسلہ میں ایورل پاؤل (Avril Powel) نے جرمن مشنری پمفانڈر کے خیالات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انیسویں صدی میں ہندوستان میں مسلمان معاشرے کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ، اسلامی ریاستوں کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ان کے ہاں باعزت اور ایماندار اشرافیہ طبقہ کمزور ہو گیا ہے، اس وقت تک مغرب میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ طبقہ اعلیٰ معاشرے کی اخلاقی حالت کو بہتر رکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی دلیل کے مطابق ہندوستان میں مسلمان اشرافیہ اخلاقی طور پر زوال پذیر ہے، اور خود غرضانہ جذبات و خواہشات نے اسے معاشرے کے لئے برائی کی جڑ بنا دیا ہے۔(11)

زوال اور کولونیل ازم کی آئیڈیالوجی کا تجزیہ کرتے ہوئے جدید تحقیق میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ہندوستانی معاشرہ کو زوال شدہ قرار دینے سے اہل برطانیہ اپنی حکومت کا جواز تلاش کر رہے تھے کیونکہ اس دلیل کے تحت ہندوستان اور اس کے حکمراں طبقے ملک میں سیاسی استحکام پیدا کرنے میں ناکام ہو گئے۔ سماجی اور معاشی طور پر جو افراتفری تھی اس کا کوئی حل ان کے پاس نہیں تھا، اس لئے برطانوی اقتدار نے ایک لحاظ سے اس خلاء کو پورا کیا۔ لیکن تاریخی حقائق اس کے برعکس ہیں، کیونکہ مغل خاندان کے زوال کو پورے ہندوستان کا زوال نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس وقت جب کہ دہلی کی مرکزی حیثیت کمزور ہو رہی تھی، مغل روایات اور ادارے صوبائی حکومتوں میں ایک تسلسل کے ساتھ جاری تھے۔ اودھ، دکن، بنگال اور دوسری ریاستیں ثقافتی سرگرمیوں میں مصروف تھیں۔ معاشی طور پر ہندوستان مسلسل ترقی کر رہا تھا۔ اس کی تفصیل بیلی نے اپنی کتاب ''حکمراں، شہری، اور بازار'' Rulers, Towmsmen and Bazaars (1988) میں تفصیل سے دی ہے۔ مغل امپائر اور اس کے زوال پر آندریا ہنٹ زے (Andrea Hintze) کی کتاب ''مغل امپائر اور اس کا زوال'' (1988) پر تفصیل سے اس کی مختلف تھیوریز پر بحث کی گئی ہے۔ اب ایک نقطۂ نظر کے تحت اسے زوال کے بجائے ''مرکزیت کا ٹوٹنا''

(Decentralisation) بھی کہا جا رہا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ابتدائی دور میں مغل سلطنت کی بہت سی روایات اور اداروں کو برقرار رکھا اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ جن میں سے ایک دربار کی رسم ہے۔ برطانوی حکومت نے یہ دربار 1877، 1908، اور 1911 میں منعقد کرائے، جن میں اپنے ماتحت راجاؤں، نوابین، اور روساء کو مدعو کر کے ان سے اظہار وفاداری کرایا۔ دربار کی اس رسم کو گورنر جنرل، صوبوں کے گورنروں، اور برطانوی افسران نے جاری رکھا۔ مغلوں کی رسومات کہ جس میں خلعت دینا، خطابات عطا کرنا، اور وفادار امراء کو مراعات دینا تھا ان سب کو جاری رکھا۔

آریاؤں کے بارے میں جدید تحقیق ہے کہ یہ کوئی ایک نسل نہیں تھی، جیسا کہ ابتدائی دور کے مورخوں اور محققین نے اسے سمجھا اور اس بنیاد پر آریاؤں کی نسلی برتری کا مفروضہ قائم کیا۔ اس کے لفظی معنی ''شریف'' کے ہیں مگر جو گروپس ہندوستان میں آئے ان کا تعلق مختلف اتھنک طبقوں سے تھا۔ مزید برآں اب کسی بھی شکل کی خالصیت اور پاکیزہ کا دعویٰ کرنا ایک فریب ہے، کیونکہ ہر نسل ملاپ و اشتراک کے بعد اپنی خالصیت کو کھو چکی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں مختلف اقوام آئیں، مگر یہ صرف ہندوستان کی تاریخ ہی میں نہیں ہوا، بلکہ دنیا کے ہر ملک میں باہر کی قومیں بطور فاتح اور بطور مہاجر کے آئیں، اور اس کے اشتراک اور ملاپ سے معاشروں کو توانا کیا، کمزور نہیں کیا۔

## مشرقی مطلق العنانیت

کولونیل آئیڈیالوجی میں مشرقی مطلق العنانیت (Oriental Despotism) کا نظریہ اہم رہا ہے۔ اس کے تحت مشرق میں حکومت کا طریقہ کار یہ تھا کہ رعایا پر سختی، جبر، اور تشدد کے ذریعہ حکومت کی جائے، یہ اس لئے ضروری تھا کیونکہ ان ملکوں میں ریاست کے ادارے جیسے قوانین، نجی جائیداد، اور عوامی حقوق کا کوئی تصور نہیں تھا۔ لہٰذا ہندوستان کی تاریخ کو بھی اس نقطہ نظر سے دیکھا گیا، ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کو ظالم اور جابر حکمرانوں کی تاریخ کے طور پر پیش کیا کہ انہوں نے تلوار اور طاقت کے ذریعہ حکومت کی اور ہندوؤں کو اپنا غلام بنائے رکھا۔ ایلیٹ نے اپنی کتاب ''ہندوستان کی تاریخ، ہندوستان کے مورخوں کی زبانی'' میں فارسی

ماخذوں سے ایسے اقتباسات کو پیش کیا ہے کہ جن سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ان کے عہد میں کوئی نظام نہیں تھا، اور حکومت کا طریقہ جبر اور تشدد کے ذریعہ تھا۔

اس لئے جب یہ سوال آیا کہ برطانوی حکومت کو بھی اسی طریقہ سے حکومت کرنی چاہیئے؟ تو جیمس اسٹوارٹ مل (James S. Mill) نے دلیل دی کہ غیر متمدن لوگوں پر حکومت کے لئے مطلق العنانیت ضروری ہے، لیکن اس کا مطمع نظر حالات کو سدھارنا ہونا چاہیئے۔(12) میکالے بھی اس کی حمایت کرتا ہے، مگر ساتھ ہی یہ کہتا ہے کہ مطلق العنانیت کو سرپرستانہ ہونا چاہیئے۔ اس کے کہنے کے مطابق برطانیہ کو ایک اچھی حکومت کا قیام تو ضرور کرنا چاہیئے، مگر ان اداروں کو روشناس نہیں کرانا چاہیئے کہ جو انگلستان میں قائم ہیں۔(13) اس کا مطلب یہ تھا کہ جمہوری ادارے انگلستان جیسے تہذیب یافتہ ملک میں ہونے چاہئیں، مگر ہندوستان جیسا پس ماندہ ملک جمہوری اداروں کے بجائے مطلق العنانیت چاہتا ہے۔

ہندوستان پر حکومت کے حق کو ثابت کرتے ہوئے جو دلائل دیئے گئے، ان میں سے ایک دلیل تو یہ تھی کہ ہندوستان میں آریاؤں سے لے کر، موجودہ دور تک ان لوگوں نے حکومت کی ہے کہ جو باہر سے آئے اور ہندوستان کو فتح کیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل ہندوستان کو حکومت کا فن نہیں آتا، ان پر ہمیشہ غیر ملکیوں کی حکومت رہی ہے۔ اس عمل میں وہ نااہل اور ناکارہ ہو گئے ہیں اس لئے انہیں سرپرستی کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تاریخ کا ایک تسلسل ہے۔ جس طرح سے ترک، افغان اور مغل آئے اسی طرح وہ فاتح بن کر آئے ہیں۔ بحیثیت فاتح کے ان کا یہ حق ہو گیا ہے کہ وہ ہندوستان پر حکومت کریں۔ فتح کے اس حق نے انہیں ملک پر قبضہ کا حق دیدیا ہے۔

ایک اور دلیل میں یہ کہا گیا کہ چونکہ اہل ہندوستان اور اہل یورپ کا تعلق آریہ نسل سے ہے، لہٰذا نسلی طور پر وہ ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں، اس لحاظ سے برطانیہ کی حکومت آریہ نسل کی حکومت کے تسلسل کا ایک حصہ ہے۔ بی۔ ہیول (B.Havell) کی کتاب ہسٹری آف آرین رول ان انڈیا" میں اس دلیل کو پیش کیا گیا ہے۔ مگر یورپی آریہ ہونے کی حیثیت سے وہ اہل ہندوستان کے مقابلہ میں برتر اور افضل ہیں۔

## جامد تاریخ کا نظریہ

ہیگل نے 1830 میں تاریخ پر لیکچر دیتے ہوئے ہندوستان کے بارے میں کہا تھا کہ ہندوستان کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اس سے اس کا مطلب یہ تھا کہ تاریخ حکمراں خاندانوں کی ہے، جنگ و جدل کی ہے، مگر خیالات و افکار کی تخلیق کی تاریخ نہیں ہے۔ جب تاریخ نویسی میں ''یورپی مرکزیت'' کا نقطۂ نظر مقبول ہوا تو اس بات کو بار بار دہرایا گیا، کیونکہ یہ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے درمیان ایک فرق کو قائم کرتا تھا۔ افریقہ کو تاریک براعظم کہہ کر اس کو تو بالکل ہی تاریخ سے خارج کر دیا گیا تھا، اس کا مطلب تھا کہ یورپ وہ براعظم تھا کہ جہاں خیالات و افکار تخلیق ہو رہے تھے اور تہذیب نشو و نما پا رہی تھی۔ اس لئے دوسری تہذیبوں سے انکار مغرب کی برتری کے لئے ضروری تھا۔

ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں جب یہ کہا گیا کہ یہ ایک جگہ ٹھہری ہوئی ہے، تو اس کی دلیل یہ دی گئی کہ ہندوستانی معاشرہ صدیوں سے ذات پات میں اسی طرح سے تقسیم ہے کہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی ناممکن ہے، لہٰذا ہر ذات اپنی جگہ پر جامد ہے، یہ متحرک نہیں ہے۔ جن ذاتوں کا تعلق مختلف پیشوں سے ہے وہ انہیں میں مصروف ہیں، یہ تاریخ کا گردش والا نظریہ تھا کہ جس میں اہل ہندوستان محو گردش تھے، اور جس سے باہر نکلنے کا یا نجات کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

ذات پات کے ساتھ ساتھ، دوسری صورت میں ہندوستان مختلف قبائل کا مجموعہ تھا۔ مذہبی طور پر یہ ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں وغیرہ میں بٹے ہوئے تھے۔ علاقائی طور پر بنگالی، سندھی، اور گجراتی وغیرہ تھے۔ لہٰذا ہندوستان کئی یونٹوں میں تقسیم ہوا ہوا تھا، جو ایک دوسرے سے رابطہ اور تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اس علیحدگی نے ان کی توانائی کو ختم کر دیا تھا اور وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ تاریخ کی تشکیل کر سکیں۔

تاریخ کے جامد ہونے کے بارے میں ایک دلیل یہ بھی تھی کہ ہندوستانی گاؤں ''چھوٹی ریپبلک'' کی مانند ہیں کہ جہاں ضرورت کی ہر چیز دستیاب ہو جاتی ہے۔ لہٰذا حکمراں خاندان بدلتے ہیں، جنگیں ہوتی ہیں، مگر گاؤں والے ان تبدیلیوں سے بے خبر اپنے روایتی ماحول میں صدیوں سے ایک جیسی حالت میں رہ رہے ہیں۔ اس لئے ہندوستان کی تاریخ کو سمجھنے کے بارے

میں یہ کہا گیا کہ ہندوستان کی موجودہ تاریخ (یعنی 19 صدی کا ہندوستان) یورپ کا ماضی ہے۔ اس لئے ہندوستان کی ہم عصر تاریخ کو سمجھنے کے لئے یورپ کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے، کیونکہ ہندوستان فیوڈل دور میں ہے، اور اس لحاظ سے ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔

جامد تاریخ کے اس نظریہ کو جدید تحقیق نے غلط ثابت کر دیا ہے، عرفان حبیب نے عہد سلاطین میں ہونے والی ان سماجی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جو نئی ٹکنالوجی کی وجہ سے آئیں، یہ ٹکنالوجی ترک وسط ایشیا سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے معاشرے میں ذات پات اور درجہ بندی کے حساب سے تبدیلیاں کیں۔ اس وجہ سے ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی میں اس پر افسوس کرتا نظر آتا ہے کہ کمین اور کم اصل لوگ دولت مند ہو گئے ہیں، اور سماجی طور پر باعزت مقام حاصل کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے وہ حکمرانوں کو مشورہ دیتا ہے کہ انہیں اعلیٰ عہدوں پر فائز نہیں کیا جائے۔ چاہے یہ کسی قدر باصلاحیت اور قابل ہی کیوں نہ ہوں۔

وانینا نے اپنی کتاب ''ہندوستان میں افکار اور معاشرہ: سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک'' Ideas and Society in India: Sixteen Century to Eighteen Century میں تفصیل سے خیالات و افکار اور سماجی و سیاسی تبدیلیوں کی جانب اشارہ کیا ہے کہ جو سولہویں سے اٹھارہویں صدیوں تک ہندوستان میں ہو رہی تھیں۔ ان میں خصوصیت سے اکبر کے عہد میں ہونے والی تبدیلیاں، بھگتی تحریک، صوفیاء کے سلسلے، شعراء کا ادبی سرمایہ اور اٹھارہویں صدی میں مغل خاندان اور اس کے زوال کا تجزیہ، یہ سب شامل ہیں۔ اکبر کے زمانہ میں جو سماجی تبدیلی آئی تھی، اس کا اندازہ ابوالفضل کی اس تقسیم سے ہوتا ہے کہ جس کے تحت اس نے معاشرہ کو تقسیم کیا ہے۔ یہ ترتیب اس طرح سے ہے: جنگ جو، دست کار و تاجر، مفکر، حکیم، ریاضی داں، اور کاشتکار۔ اس درجہ بندی میں دست کار اور تاجر دوسرے نمبر پر ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تجارت کی وجہ سے معاشرہ میں ان کا سماجی رتبہ بڑھ گیا تھا۔ (14) اکبر کے دربار میں مذہبی بحث و مباحثہ، سنسکرت کی کتابوں کے فارسی میں ترجمے، اور تقلید کے بجائے عقلیت پر زور ان سب عوامل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہنی طور پر معاشرہ کس قدر آگے بڑھ رہا تھا۔

اٹھارہویں صدی میں ہندوستان سیاسی اور سماجی طور پر ایک نئے شعور سے آگاہ ہوا۔ اس

عہد میں اردو ادب کا عروج ہوتا ہے، لیکن یہ شاعری عہد زوال کی عکاسی نہیں کرتی ہے، اس میں معاشرتی شعور اور ذہنی پختگی پوری طرح سے جھلکتی ہے۔

کولونیل عہد میں ہندوستان کی ماضی کی تاریخ جو اب تک گمنام تھی وہ بھی سامنے آئی، اشوک کے عہد کی معلومات، اس کے دور کے کتبات، گندھارا تہذیب اور اس کا یونانیوں سے رشتہ و تعلق ہیون سانگ اور فاھیان کے سفرناموں سے چین سے روابط کے بارے میں معلومات، 1819 میں اجنتا کے غاروں کی دریافت، 1920 میں ہڑپہ اور موہنجودڑو کی کھدائی، اس نے ہندوستان کی تاریخ کے سلسلہ کو اور آگے بڑھایا۔ جدید دور میں کوسمبی اور رومیلا تھاپر نے قدیم ہندوستان کی تاریخ کی تشکیل کر کے اس کے بہت سے مخفی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تاریخی عمل اپنی تمام سرگرمیوں اور تبدیلیوں کے ساتھ جاری تھا، یہ ایک جگہ ٹھہرا ہوا جامد نہیں تھا۔

## سُست اور کاہل کا تصور

کولونیل آئیڈیالوجی کا ایک اہم عنصر یورپی نسلی برتری کا تھا۔ اس کے تحت مقامی لوگ نہ صرف ذہنی طور پر کم تر ہوتے تھے۔ بلکہ سُست و کاہل بھی ہوتے تھے۔ ایس۔ ایچ۔ الاتاس نے اپنی کتاب "سُست و کاہل مقامی لوگوں کی متھ" (The Myth of the Lazy Native) میں ملایا اور فلپائن کے حوالہ سے اس کا تجزیہ کیا ہے۔ اس کی تحقیق کے مطابق مقامی لوگوں کے بارے میں سستی و کاہلی کا نظریہ اول اول سیاحوں، مشنریوں، تاجروں، اور کولونیل منتظمین نے دیا۔ اس تصور سے وہ اپنے لوگوں کو متاثر کرنا چاہتے تھے، ابتداء میں اس کا تعلق مقامی لوگوں سے نہیں تھا۔ لیکن جب یورپی طاقتیں اقتدار میں آگئیں، تو اب یہ ان کی پالیسی کا ایک اہم حصہ تھا کہ مقامی لوگوں کو ذلت و حقارت سے دیکھیں، انہیں ڈر تھا کہ مقامی لوگ ان کے خلاف بغاوت نہ کر دیں۔ لہٰذا اس کے پس منظر میں نسلی برتری اور کم تری کے جذبات کام کر رہے تھے۔ فلپائن کے سلسلہ میں 1842 میں ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ: "یہ ضروری ہے کہ مقامی لوگوں کے فخر اور اعتماد کو کچل دیا جائے۔ تاکہ تمام حالات میں وہ خود کو اہل ہسپانیہ سے کم تر سمجھیں، اور کسی بھی طور پر خود کو ان کے برابر نہ گردانیں۔" الاتاس نے انیسویں صدی محنت کے تصور کے پس منظر میں سستی کے بارے

میں لکھا ہے کہ "سستی اس حالت کو کہا گیا کہ جب کام سے لگاؤ نہ ہو، کام کی خواہش نہ ہو، کام کے دوران کسی توانائی کا اظہار نہ ہو، کام کے عوض کیا نتیجہ نکلتا ہے، اس کی پرواہ نہ ہو۔ کولونیل حکومتوں نے مقامی لوگوں کو اس وقت سُست اور کاہل کہنا شروع کیا کہ جب انہوں نے ان کے پیداواری نظام کا حصہ بننے سے انکار کر دیا۔ مقامی لوگوں کے لئے کام کی خواہش اس وقت ختم ہو گئی کہ جب تمام عہدے کولونیل سے متعلق اشرافیہ کو دیدیئے گئے، اور ان کے لئے آگے بڑھنے اور ترقی کے امکانات ختم ہو گئے، اس صورت حال میں وہ سماجی طور پر بہت پیچھے رہ گئے اور کام سے ان کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ ان کی سستی اور کاہلی کو بطور مزاحمتی ہتھیار کے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ (15)

مقامی لوگوں کے سُست اور کاہل ہونے کی متھ ہندوستان میں بھی تھی۔ اس کو کبھی آب وہوا اور فطری ماحول سے منسوب کیا جاتا تھا کہ جو لوگوں کو سُست و کاہل رکھتا تھا۔ کبھی یہ دلیل دی جاتی تھی کہ سیاسی وسماجی اثرات نے اہل ہندوستان کو غلامی کا عادی بنا دیا ہے۔ اس لئے انہیں سرپرستی اور نگرانی کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے گورنر جنرل کارنوالس نے تو یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہر ہندوستانی بدعنوان ہے۔ نسلی برتری کا یہ نظریہ اور مقامی لوگوں کو غیر انسانی بنانے کا یہ عمل کولونیل تسلط کو قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا۔

کولونیل آئیڈیالوجی کے ذریعہ اہل برطانیہ نے ہندوستان پر نہ صرف اپنا سیاسی تسلط قائم کیا، بلکہ معاشی اور سماجی طور پر بھی ہندوستان اور اس کے معاشرہ کو اپنے دائرہ اثر میں لے لیا۔ اس سلسلہ میں آئیڈیالوجی کے دو اہم طریقوں کو استعمال کیا گیا: ایک طاقت و تشدد کو اور دوسرا علم یا نالج کو تاکہ اس کے ذریعہ ہندوستان کے بارے میں معلومات اکٹھی کی جائیں، اور پھر اس نالج کا تسلط کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس سلسلہ میں دو نقطہائے نظر تھے: ایک میں ہندوستان کو مختلف کمیونٹیز میں تقسیم کر دیا گیا، تاکہ ان کے راہنماؤں کے ذریعہ لوگوں پر کنٹرول کیا جائے۔ دوسرے طریقہ میں، ہندوستان کو فیوڈل معاشرہ تسلیم کرتے ہوئے، مقامی امراء کے طبقے کے تعاون کو حاصل کیا گیا، تاکہ وہ اپنی رعایا کو مطیع و فرماں بردار بنانے میں ان کا ساتھ دیں۔ (16)

1857 کے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ڈھانچہ میں تبدیلی آ گئی، کیونکہ اب یہ تاج برطانیہ کا ایک حصہ ہو گیا۔ اور بقول کوہن (Cohn) کے یہ آؤٹ سائڈرز (غیر ملکی) سے ان

سائڈرز (ملکی) ہو گئے۔ 1858 کے ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے تحت مقامی حکمرانوں اوران کی ریاستوں کو تحفظ دیدیا گیا۔(17) اب ہندوستان دوحصوں میں واضح طور پر تقسیم ہو گیا۔ برطانوی اور ریاستی۔ اس تقسیم کی وجہ سے ہندوستان میں غیر مساوی ترقی ہوئی۔ اور 1/3 ہندوستان جو ریاستوں کے ماتحت تھا، برطانوی حکومتوں نے صرف انہیں ریاستوں کو باقی رکھا کہ جو اس کی وفادار تھیں۔ میسور کی ریاست جو جدیدیت کی طرف جارہی تھی، اسے خطرہ سمجھ کر ختم کردیا گیا تھا۔ اس لئے مقامی ریاستوں کی پس ماندگی ان کے حق میں تھی۔

یہی صورت حال برطانوی علاقے میں تھی، جہاں ایک یورپی تعلیم یافتہ طبقہ پیدا کیا گیا، جس نے ہندوستانی معاشرہ کو جدید اور روایتی میں تقسیم کردیا۔ برطانوی ہندوستان شہری اور دیہاتی آبادی کے فرق کی وجہ سے ذہنی طور پر ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے۔

یہ اس کولونیل آئیڈیالوجی کا اثر تھا کہ جب برطانوی حکومت کا خاتمہ ہوا ہے تو ہندوستانی معاشرہ سماجی طور پر ٹکڑوں میں بٹا، تاریخی طور پر مسخ شدہ، معاشی طور پر نڈھال، اور ذہنی طور پر پس ماندگی کا شکار تھا۔ کولونیل آئیڈیالوجی کی جڑیں اس قدر گہری تھیں کہ انگریزوں کے جانے اور آزادی کے بعد، اسے حکمراں طبقوں نے اختیار کر کے اس کی بنیاد پر اپنی بالادستی کو قائم کئے رکھا ہے۔ یہ بات بڑی حد تک پاکستان کے حکمراں طبقوں پر پوری طرح سے صادق آتی ہے۔

# References

1. S.H.Alatas: *The Myth of the Lazy Native.* Frank Cass: London 1977. P. 1; For Furthers details see, Karl Manuheim: *Ideology and Utopia.* Rantledge & Kegarn Pail 1960, Reprinted 1976.
2. Jatinder K. Bajaj: Francis Bacon, The First Philosopher of Modern Science: A Non Western View. *In Science, Hegemony and Violence,* edited by Ashish Nandy, Oxford Delhi Fifth Reprint, 1998, PP. 46, 47.
3. Ashish Nandy: *The Intimate Enemy.* Oxford Delhi, Eight impression 1994, P. 34.
4. Thomas R. Metcalf: *Ideologies of the Empire,* Cambridge 1995, PP. 2, 3, 6.

   Bernard S. Cohn: Representing Authority in Victorian India. In: *The Invention of Tradition,* ed. by Eric Hobsbawm and Tervence Rangor, Cambridge 1983, P.205.
5. Clande Alvaves: Science, Colonialism and Violence. In: *Sceince, Hagemony and Violence,* P. 90.

6. C.C.Eldridge: *Victorian Imperialism.* Hodden Stoughton tavon-1978, PP. 50-51.

7. Claude, P. 91.

8. Alatas, P. 19.

9. Gauri Viswanathan: *Mask of Conquest.* Faber and Faber London 1989, PP. 5-6.

10. Metcalf: P. 90.

11. Avril Powell: *Muslims & Missionaries in Pre-Mustiny India.* Curzon Press Lond 1993, P. 153.

12. Alan Ryan: Introduction. In: *J.S.Mill's Encounter with India.* Edited by Martin I. Mair, University of Toronto 1999, P. 4.

13. C.C.Eldridge, P. 61.

14. Engenia Vanina: *Ideas and Society in India from Sixteenth to Eighteenth Centuries.* Oxford Delhi 1996, P.35.

15. Alatas, PP. 22, 27, 7, 73.

16. Cohn, P. 190.

17. Ibid., P. 165.

# کولونیل ازم: نظریہ اور برصغیر پر اس کا اطلاق

طاہر کامران

پاکستان کے تعلیمی نصاب کا جائزہ لیا جائے تو حیرت ہوتی ہے مطالعہ پاکستان، تاریخ سیاسیات یا پھر لازمی مضامین سے متعلق نصاب میں کلونیل دور یا کلونیل ازم کے نظریہ کا ذکر سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔ ہمارے یہاں سوشل سائنسز (سماجی علوم) یا ہیومینٹیز (علومِ انسانی) کے ذریعے سے پاکستانی تشخص کی تشکیل کا موضوع زیر بحث لایا جاتا ہے تو دیگر بعدِ نوآبادیاتی سماجوں کے بالکل برعکس ہندوؤں کو ''other'' یعنی ''دوسرا'' قرار دیا جاتا ہے مزید برآں دوقومی نظریے کی مسلسل تکرار کے نتیجے میں طلباء و طالبات کے ذہنوں میں جو تاثر ثبت کر دیا جاتا ہے اس کے تحت ہندو ہی پاکستانی مسلمانوں کے ازلی دشمن کے طور پر سامنے آتے ہیں اور ہندو بھی صرف وہ جو ہندوستان کے باسی ہوں (اگر کوئی بھی ہندو نیپال کا رہنے والا ہو تو اس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ پاکستان میں رائج دوقومی نظریے سے متاثر ذہنوں کا قطعاً مختلف ردعمل ہوگا یا پھر ایک ملین ہندو جو کہ سندھ کے باسی ہیں یقیناً اس نفرت کے مستحق نہیں گردانے جاتے اگرچہ اُن سے روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک کو قابلِ ستائش نہیں سمجھا جا سکتا۔) اِس ساری صورتحال میں انگریز نوآبادکاروں کا ذکر یا تو سرے سے آتا ہی نہیں اور اگر کہیں ذکر آتا بھی ہے تو ضمناً۔ اس طرح کلونیل ریاست اور اس کے پسِ منظر میں قوتِ محرکہ کے طور پر موجود کلونیل نظریے کو بہت حد تک حذف کر دیا گیا ہے چنانچہ موجودہ کنفیوژن اور ابتلاء کے دور میں صحیح خطوط پر سیاسی سماجی اور اقتصادی تجزیہ ممکن ہی نہیں رہا کیونکہ پاکستانی ریاست اور اس پر مکمل غلبہ حاصل کئے ہوئے انتظامی و دفاعی نوعیت کے ادارے نیز ان اداروں کو تقویت فراہم کرنے والے بیشتر فکری و نظری ڈسکورسز

(Discourses) کلونیل عہد ہی کی پیداوار ہیں اور 14 اگست 1947ء کے بعد اِن ریاستی اداروں کہ جونوآبادیاتی ریاست ہی کا ورثہ ہیں ان کی سرگرمیوں کے نہ صرف دائرہ کار میں اضافہ ہوا ہے بلکہ انہیں کھل کھیلنے کے کہیں زیادہ مواقع میسر آ گئے ہیں۔ یہ بات کسی بھی طرح سے بلا جواز نہیں کہ آزادی کے نام پر نوآبادیاتی نظام کے تسلسل کا اہتمام کردیا گیا اور ہم یعنی پاکستانی عوام اور بالخصوص یہاں کے خواص اور Intelligentia کوئی متبادل نظام وضع کرنے میں یا یوں کہیئے کہ کوئی بھی متبادل فکر کو جنم دینے اور اس کا اس ملک میں اطلاق کرنے میں یکسر ناکام رہی ہے اور جن اصحاب نے ایسی کوئی کوشش کی انہیں گوشہ فراموشی میں دھکیل دیا گیا۔ گو کہ آج کی اس کانفرنس کے انعقاد کا خیال دیر سے آیا مگر آیا تو سہی یہی غنیمت ہے۔ اس اقدام پر تمام منتظمین اور ''تاریخ'' کے ایڈیٹر یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔

## (1)

آئندہ کی سطور میں کلونیل ازم کی تعریف وتشریح کے ساتھ ساتھ اس کی نظریاتی اساس اور اس کے کلونیل ریاست کی صورت میں سیاسی، اقتصادی استحصال اور ثقافتی غلبے کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ یوں تو کلونیل ازم کی یہ سب جہتیں طوالانی مباحث کی متقاضی ہیں لیکن حتی الوسع اختصار برتتے ہوئے کوشش ہو گی کہ مذکورہ بالا پہلوؤں کو اسی مقالے میں سمیٹ دیا جائے۔ چنانچہ Discursive اور تھیوریٹکل پیچیدگیوں سے پہلوتہی کرتے ہوئے کلونیل ازم کے بنیادی اصولوں کو واضح کیا جائے گا۔

لفظ کلونیل ازم کے لفظی معنی کو جاننے اور اس کی etymology کا مطالعہ کرنے کی غرض سے اگر آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کا سہارا لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ لفظ ''کلونیل ازم'' دراصل رومن لفظ ''کلونیا'' (Colonia) سے مشتق ہے جس کے معانی ''Form'' یعنی کھیت یا پھر سیٹلمنٹ یعنی بستی کے ہیں (1) اور یہ اصطلاح اُن جگہوں کے لئے استعمال ہوتا تھا جہاں رومن اپنے آبائی اوطان چھوڑ چھاڑ کر جا بسے تھے البتہ وہ ابھی بھی رومن شہری (Citizens) کے سٹیٹس کے حامل تھے۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں کلونیل ازم کے بارے میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

ایک نئے علاقے میں آبادکاری......افراد کا گروہ جو ایک نئی جگہ پر سکونت اختیار کرے اور ایسی قومیت کی تشکیل پا جائے جو خالص آبادکاروں اوران کی آئندہ نسلوں اور جانشینوں پر مشتمل ہو اوران سب کا تعلق اپنی آبائی ریاست کے ساتھ قائم رہے۔

A settlement in a new Country...... a body of people who settle in a new locality, forming a community subject to or connected with their parent state, the community so formed, consisting of the original settlers and their descendants and successors, as long as the connection with the parent state is kept up.(2)

عینیہ لومبا (Ania Loomba) کا کلونیل ازم کی اس تعریف کے بارے میں کہنا ہے کہ اس میں آبادکاروں یعنی Colonizers کے بارے میں تو صریحاً بات کی گئی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کالونائیزر ہی اس بیان میں واحدانی اہمیت رکھتے دکھائی دیتے ہیں جبکہ اُن آبادیوں کے اصلی باشندے جنہیں کہ مستشرقیت کی زبان میں مقامی یا Native کہا گیا کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے لہٰذا لفظ کلونیل ازم سے یہ مراد ہرگز نہیں لیا جا سکتا کہ دو طرح کے لوگوں میں کشمکش ہوئی ہو اور پھر وہ علاقہ جہاں ''مقامی'' آباد تھے اُسے فتح کر لیا گیا ہو اور کلونیل تجربے سے یہ بھی اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خطہ جہاں پر آبادکاروں نے اپنا تسلط قائم کر لیا تھا وہ بالکل ہی ''نیا علاقہ'' بالکل نہیں تھا اور وہاں پر نسلِ انسانی پہلے سے آباد تھی مزید برآں وہاں پر ''قومیت کو معرضِ وجود میں لانا'' بھی عینیہ لومبا کو جائز عمل محسوس نہیں ہوتا۔ غالباً اس کا کہنا یہ ہے کہ انسان نے اُن مفتوحہ علاقوں میں پہلے ہی سے قومیتیں بنالی تھیں اور یہ کوئی نیا عمل نہ تھا۔ اور کسی نئی سرزمین پر ''قومیت کی تشکیل'' سے لازماً یہی مراد ہے کہ وہاں پر پہلے سے موجود قومیتوں کی یا تو عدم تشکیل (un-formation) کی گئی یا پھر تشکیلِ نو (re-formation) کی گئی۔(3) جس کے لئے مختلف طریقہ ہائے کار اپنائے گئے مثلاً تجارت، لوٹ مار، مذاکرات، جنگ وجدل، نسل کشی، مقامیوں کو

غلام بنا لینا اور بغاوتیں وغیرہ۔ پوسٹ کلونیل دانشوروں یعنی ایڈورڈ سعید، گیاتری چکرابرتی، سپیوک اور ہومی بھابھا کا خیال ہے کہ اِن تمام سرگرمیوں نے متنوع تحریروں یعنی پبلک اور پرائیویٹ ریکارڈ، خطوط، تجارتی دستاویزات، حکومتی دستاویزات، ادب پاروں اور سائنسی علوم کو جنم دیا اور اس مختلف نوع قسم کے ریکارڈ نے بھی ایسی سرگرمیوں کو اثر انداز کیا۔(4)

اس طرح کلونیل ازم کو ہم دوسرے افراد کی سرزمین اور اشیاء پر قبضہ و کنٹرول کرنے کے عمل سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ لومباء نے کلونیل ازم کو محض سولہویں صدی ہی سے شروع ہونے والا غاصبانہ عمل قرار نہیں دیا بلکہ وہ اس کی تاریخ کا کھوج عہد قدیم سے لگاتے ہوئے اِسے (recurrent and wide spread feature of human history) کہتی ہیں اور مختلف مثالوں کے ذریعے سے اپنے اس بیان کو واضح کرتی ہیں جن میں سب سے پہلی مثال رومن ایمپائر کی ہے کہ جس نے دوسری صدی بعد عیسوی کے دوران اپنے آپ کو آرمیدیا سے بحرِ اوقیانوس تک وسعت دیدی تھی اسی طرح چنگیز خان نے تیرہویں صدی کے دوران مشرقِ وسطیٰ اور چین کے علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا بعینہ آزٹیک سلطنت (Aztec Empire) چودھویں صدی سے سولہویں صدی تک اس وقت قائم ہوگئی جب متعدد نسلی گروہوں میں سے ایک نسلی گروہ نے میکسیکو کی وادی میں سکونت اختیار کر لینے کے بعد دوسرے گروہوں کو اپنا مطیع بنالیا تھا۔ Aztecs نے مفتوحہ علاقوں سے خراج وصول کیا نہ صرف مادی وسائل کی صورت میں بلکہ بیگار کی صورت میں بھی! بالکل یہی طریقہ کار اِنکا(Inca) سلطنت نے بھی اپنایا جو کہ براعظم امریکہ کی قبل از صنعتی عہد سب سے بڑی ریاست تھی۔(5) اگر موضوع کو پھیر کر ہندوستان کو توجہ کا مرکز بنالیا جائے تو جنوبی ہند کی کئی بادشاہتیں وجیا نگر سلطنت کے زیرِ نگین ہوگئیں اور سلطنت عثمانیہ جس کا آغاز موجودہ مغربی ترکی بے ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی حیثیت سے ہوا وسعت اختیار کر کے ایشیائے کوچک اور بلقان تک پھیل گئی۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز تک جب عثمانی سلطان اُس عظمت وسطوت سے کچھ حد تک محروم ہو چکے تھے جو اس سے پیشتر ان کا طرہ رہا تھا ان کے زیر کنٹرول علاقوں کی حدود بحیرۂ روم سے بحر ہند تک پھیلی ہوئی تھیں۔(6) مشرق کا جب بھی ذکر ہو تو چین کے بغیر وہ ذکر مکمل نہیں ہوتا مغرب کے عروج سے قبل چین کی سلطنت بھی اس قدر وسیع تھی کہ یورپ اس کا چنہ ہی دیکھ سکتا تھا۔

جدید یورپی کلونیل ازم کا مطالعہ مشرق و مغرب کے ابتدائی روابط کو نظر انداز کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ کلیسائی جنگیں، سپین پر مسلمانوں کا قبضہ، منگولوں کی جارحانہ کاروائیاں اور اِنکا دور میں دولت و ثروت کی دیو مالائی کہانیاں یا پھر مغل دور کے ہندوستان کی ''سونے کی چڑیا'' کے طور پر شہرت نے یورپی سیاحوں کو مشرق کا سفر کرنے کی تحریک دی۔ یورپیوں کے اِن اسفار نے بعد ازاں ایسی کلونیائی روشوں کی بنیاد رکھی کہ جدید کلونیل ازم نے دنیا کو بالکل ہی بدل کر رکھ دیا کہ اس سے قبل کے کلونیل تجربوں کے باعث نوآبادیوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں وہ اس کا عشر عشیر بھی نہ تھیں۔

اب سوال یہ ہے کہ عہد قدیم یا عہد وسطیٰ میں کلونیل تجربات اور عہد جدید کے یورپی کلونیل تجربے میں کیسے امتیاز کیا جائے۔ ایک فرق تو یہ بھی ہے کہ یورپی طاقتوں نے اپنے ممالک سے بہت دور کلونیائی سلطنتیں قائم کر لیں۔ دوسرا فرق شاید یہ ہو کہ وہ اپنی پیش رو استعماری طاقتوں کی نسبت زیادہ بے رحم اور متشدد تھے! یا پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہتر خطوط پر منظم تھے یا نسلی اعتبار سے وہ کہیں اعلیٰ پایے کے تھے۔ یہ سب ایسے بیانات ہیں جو یورپی کلونیل طاقتوں کے غلبے کا ادراک کرنے کی کوشش میں مختلف لوگوں نے نتائج کی صورت میں اخذ کئے۔ مارکسی فکر نے اِن دو مختلف کلونیل نظاموں میں فرق کرتے ہوئے استدلال دیا ہے کہ جدید عہد سے قبل کے کلونیائی نظام سرمایہ دارانہ نظام کے مذموم مقاصد سے مبرّیٰ تھے۔(7) اور جدید کلونیل ازم مغربی یورپ میں کیپٹل ازم کے آغاز کے ساتھ ہی ظہور پذیر ہوا۔ اور جدید کلونیل ازم نے محض نوآبادیوں سے خراج اشیائے اور دولت ہی حاصل نہیں کئے بلکہ اُس نے اپنے مطیع علاقہ جات کی معیشتوں کے بنیادی ڈھانچے ہی کو تبدیل کر کے رکھ دیا اور نوآبادیوں کی معیشتوں کا اپنے (یعنی کلونیل ممالک کی معیشتوں کے) ساتھ بہت ہی پیچیدہ تعلق کچھ اس طرح سے قائم کر لیا کہ وسائل اور افرادی قوت کا باہمی تبادلہ ہونے لگا جو کہ دونوں سمتوں میں تھا یعنی غلاموں اور بیگار ہر کام کرنے والے مزدور اور مادی وسائل کلونیل ممالک ہی کو فائدہ ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ نوآبادیوں نے کلونیل صنعتی اور سرمایہ دارانہ ممالک اشیاء کے لئے منڈیوں کا کردار بھی ادا کیا۔ چنانچہ غلاموں کو افریقہ سے پکڑ کر امریکہ لیجایا گیا اور ویسٹ انڈیز کی پلانٹیشنوں پر چینی پیدا کرنے کی غرض سے گنے کی کاشت پر لگا دیا گیا۔ ہندوستان میں سے کپاس کو انگلستان منتقل کر کے اس سے کپڑا بنایا گیا اور

اُسے واپس ہندوستان لا کر فروخت کیا گیا جس کا ایک نتیجہ ہندوستان میں کپڑے کی صنعت کی تباہی کی صورت میں ہوا۔ غرض یہ کہ انسان اور وسائل جس بھی سمت گئے فائدہ ہر صورت میں ''مدر کنٹری'' (Mother Country) ہی کو ہوا۔

منافع جات اور افراد کی امریکہ کو منتقلی اور وہاں پر زرعی فارموں کی شروعات اور یورپیوں کی آبادکاری، تجارت خصوصاً ہندوستان کے حوالے سے اور افراد کی بڑی تعداد کی ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی جدید کلونیل ازم ہی کے ثمرات تھے۔ نوآبادیوں کے رہنے والے ''مقامی'' اور آبادکار دونوں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئے۔ اول الذکر تو غلاموں، بیگار کے مزدوروں، ذاتی ملازموں، سیاحوں اور تاجروں کی حیثیت سے جبکہ موخرالذکر منتظمین، لڑاکا سپاہیوں، تاجروں، آبادکاروں، سیاحوں، مصنفوں، گھریلو ملازموں، مبلغوں، استادوں اور سائنس دانوں کی حیثیت سے۔(8) لیکن بہت اہم نقطہ جسے کہ ذہن نشین کر لینے کی اشد ضرورت ہے۔ اُن متنوع طریقہ ہائے کار اور غلبہ پالینے کی تکنیکوں سے متعلق ہے جن کے ذریعے کلونیل ازم بعض معاشروں میں بہت ہی گہرائی تک سرایت کر گیا جبکہ بعض معاشروں سے اس کا واسطہ سرسری نوعیت ہی کا رہا۔ البتہ ہر نوع کی تکنیک کا لازمی نتیجہ یہی نکلا ہر نوآبادی میں اقتصادی عدم توازن پیدا ہو گیا جو کہ یورپی کیپٹل ازم انڈسٹری کے لئے لازم تھا۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلونیل ازم نے ایک ایسی دایہ کا کردار ادا کیا جس نے یورپی کیپٹل ازم کی پیدائش میں اہم ترین کردار ادا کیا اور یہ نتیجہ بھی بعید از قیاس نہ ہوگا کہ نوآبادیاتی تسلط کے بغیر یورپ میں کیپٹل ازم کی ابتداء نہ ہو پاتی۔

(2)

جہاں تک کلونیل ازم کی ہندوستان پر ورود کا تعلق ہے تو یہاں اس کی ابتداء اور استحکام کو تین مراحل میں بیان کیا جا سکتا ہے پہلے مرحلے کو یقیناً تجارت پر اجارہ داری اور وصولیوں یعنی ریونیو پر غاصبانہ قبضہ کہا جا سکتا ہے۔ اس مرحلے کے دوران دوسرے یورپی تاجروں یا پھر مقامی تاجر پیشہ افراد کے مقابلے میں تجارت پر انگریزوں کی مکمل اجارہ داری کو مستحکم کر دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی نہ صرف مالیہ کی صورت میں وصول ہونے والے روپے پیسے کے ساتھ ساتھ تمام تر Surplus پر تصرف حاصل کر لیا گیا اور جب کبھی ہنرمندوں یا دوسرے اہل حرفہ کو نوآبادیاتی ریاست اپنا ملازم

بنا لیتی تھی یا پھر کوئی کارپوریشن یا تاجر انہیں نوکری دیتے تو Surplus بے دھڑک ہتھیا لیا جاتا صنعتی سرمایہ کی طرح نہیں بلکہ سودخور تاجر کی طرح۔

کلونیل ریاست یا اس سے متعلقہ کارپوریشنوں کو نوآبادیوں میں یا پھر سمندروں میں جنگیں لڑنے کے لئے مالی وسائل کی ضرورت ہوتی تھی۔ مزید برآں اپنی بحریہ، چھاونیاں، فوجی دستوں اور تجارتی قافلوں کی حفاظت کے لئے قائم چوکیوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے بھی خطیر رقوم درکار تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کلونیل ممالک میں تیار کی جانے والی مصنوعات خریدنے کے لئے بھی کافی روپیہ پیسے چاہئے تھا اُس زمانے میں نوآبادیاں میٹروپولیٹن ممالک کی مصنوعات بہت ہی کم مقدار میں درآمد کرتی تھیں۔ وہ Surplus جسے کہ براہ راست ہتھیا لیا جاتا تھا وہ انگریز تاجروں، کارپوریشنوں اور میٹروپولس کے خزانے میں خالص منافع کے طور پر جمع ہو جاتا تھا وہ منافع جس کے لئے سرمایے کی انوسٹمنٹ درکار نہ تھی نوآبادی میں یورپی افسروں کی بڑی تعداد ملازمت کی غرض سے موجود رہتی تھی اور وہاں کے Surplus میں قابلِ ذکر حصہ ہڑپ کر جاتی۔ انہیں بھاری تنخواہوں کے علاوہ رشوت ستانی اور Extortion کی مدد سے اپنی جیبیں بھرنے کی کھلی چھٹی تھی۔(9)

پہلے مرحلے کے دوران لوٹ مار (Plunder) اور زائد سرمایہ Surplus کو براہ راست غصب کر لینے کا چلن عام تھا اور نوآبادی میں میٹروپولیٹن ملک (ممالک) کی مصنوعات کی درآمد کوئی خاص نہ تھی۔ اس دوران اہم ترین اور کلیدی نقطہ جسے سامنے لانا ضروری ہے یہ تھا کہ نوآبادی میں کسی قسم کی بنیادی تبدیلی نہ کی گئی نہ تو انتظامی امور میں اور نہ ہی عدالتی نظام میں۔ نقل وحمل، کمیونیکیشن زرعی و صنعتی پیداوار کے طریقہ ہائے کار، کاروباری معاملات کے اصول وضوابط یا معاشی انتظام و انصرام (سوائے Putting out System اور نوآبادی میں Plantations کے قیام کے) حتیٰ کہ نظامِ تعلیم، کلچر اور سماجی تنظیم غرض کہ ہر لحاظ سے پرانے نظام کو برقرار رکھا گیا۔ البتہ پہلے مرحلے کے دوران جن شعبوں میں تبدیلیاں لائی گئیں وہ فوجی تنظیم اور ٹیکنالوجی تھے۔(10) اسی طرح ریونیو وصول کرنے کے نظام کو بھی زیادہ اہل بنانے کی سعی کی گئی۔

پارتھا چیٹر جی نے فوجی تنظیم میں انگریزوں کی طرف سے کی جانے والی اِس تبدیلی کو

فسکالائزیشن آرمی (Fiscalization of Military) کا نام دیا ہے جس کے تحت مغلوں کے فوجی نظام کے برعکس انگریز سرکار نے فوج کو مرکزیت عطا کر دی تھی اور ان کی تنخواہ نقدی کی صورت میں دی جانے لگی۔(11)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابتدائی ایام میں نوآبادکاروں کو کسی بنیادی تبدیلی کی ضرورت کیوں محسوس نہیں ہوئی۔ بپن چندرا کا کہنا ہے کہ قدرِ زائد کو ہتھیانے کے نوآبادیاتی طریقہ کار کی بنیاد نوآبادی کی شہری مصنوعات اور Plantation کی پیداوار پر مکمل کنٹرول پر رکھی گئی تھی۔ اور خریدار (نوآبادکار) نے مکمل نوآبادی کے ریونیو پر مکمل اجارہ داری حاصل کر رکھی تھی۔(12) اِن حالات میں سماجی، معاشی اور انتظامی ڈھانچے میں کسی بھی بنیادی تبدیلی لانے کی ضرورت نہ محسوس کی گئی اور قدرِ زائد کو ہتھیانے کا طریقہِ کار موجود معاشی، سماجی، ثقافتی، نظریاتی و سیاسی ڈھانچے کو برقرار رکھتے ہوئے جبر نافذ کر دیا گیا۔ تب نوآبادیاتی طاقت نے نوآبادی کے دیہات تک اپنے دائرہ اثر کو پھیلانے کی بھی اتنی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ اُس وقت تک اُس کے لئے قدرِ زائد کو غصب کر لینے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ نوآبادیاتی طاقت کے کارپردازوں کو اپنی آئیڈیالوجی کو بھی تبدیلی کر لینے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ لہٰذا انہوں نے یہاں کی تہذیب، معاشرت، مذاہب، قوانین وغیرہ کو تنقید کا نشانہ بنانے کی بجائے انہیں سمجھنے کی کوشش کی۔

کلونیل ازم نے دوسرے مرحلے میں داخل ہو کر نیا قالب اختیار کر لیا۔ جب اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں کے دوران انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا تو وہاں پر صنعتی و کمرشل مفادات کا حامل سرمایہ دار گروہ ظہور میں آ گیا تھا۔(13) جس نے پہلے مرحلے کے دوران نوآبادی میں روا رکھے گئے طریقہ استحصال پر تنقید شروع کی اور اس کو اپنے مفادات کے تابع کرنے کی کوشش کی۔ اب یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ کلونیل کنٹرول ایک طولانی عمل ہوگا یعنی نوآبادیوں پر میٹروپولٹن ممالک کا قبضہ لمبے عرصے تک قائم رہے گا۔ اور یہ سرمایہ دار طبقہ ہندوستان میں Surplus کو ہتھیانے کا کوئی ایسا نظام وضع کرنے پر اصرار کر رہا تھا جس سے 'یہ سونے کا انڈہ دینے والی مرغی' بالکل ہی مردہ نہ ہو جائے اور ایسے حالات نہ ہو جائیں کہ Surplus کی regeneration ممکن ہی نہ رہے۔ اس خیال کے پیشِ نظر ہندوستان کے

انتظامی اور اقتصادی ڈھانچے میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں کی گئیں۔

چونکہ نئے ظہور میں آنے والے صنعتی بورژوا کے مفادات اس طرح سے ہوتی تھی کہ وہ اپنی روزافزوں مصنوعات کی کھپت کے لئے منڈیوں کا اہتمام کرے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ضرورت بھی محسوس کی جانے لگی کہ نوآبادی (ہندوستان) سے برآمدات بڑھائی جائیں۔ ہندوستانی برآمدات کو بڑھانے کی کئی ایک وجوہات تھیں۔

1- نوآبادی تبھی زیادہ مقدار میں درآمد شدہ اشیاء اپنے استعمال میں لا سکے گی اگر وہاں سے زیادہ برآمدات دوسرے ممالک (میٹروپولیٹن ممالک) کو جائیں گی۔ یہ برآمدات زرعی اجناس اور معدنی اشیاء پر مشتمل تھیں۔

2- میٹروپولس نے بیرونی ذرائع سے خام مال اور خوردنی اجناس کے حصول کو کم سے کم کرنے کے لئے نوآبادی میں کنٹرولڈ ڈویلپمنٹ کا سلسلہ شروع کیا تاکہ وہاں پر اُن وسائل کو زیادہ سے زیادہ کارآمد بنایا جاسکے جو زرعی و معدنی ذرائع پیدا کرتے تھے۔

3- سرمایہ دارانہ معیشت کے مطیع آلہ کار کی حیثیت سے نوآبادی کو میٹروپولیٹن ملک میں بسنے والی اشیاء کے لئے منڈی بنا کر نیز اپنی صنعتی ضروریات کے لئے خام مال پیدا کرنے کی ذمہ داری سونپ کر بین الاقوامی اقتصادی نظام کا حصہ بنادیا گیا۔ (14)

لہٰذا Surplus ہتھیانے کے اُس طریقہ کار کو بدلنا پڑا جو کہ پہلے مرحلے کا طرہ تھا اب ضروریات بدل گئی تھیں چنانچہ معاشی، سیاسی، انتظامی، سماجی اور کلچرل نیز نظریاتی ترتیب و تنظیم میں بھی تبدیلی لائی گئی۔ اس تبدیلی کو ڈویلپمنٹ اور ماڈرنائزیشن کا نام دیدیا گیا۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے نوآبادی کی معیشت کو بین الاقوامی کیپٹلسٹ سسٹم کا حصہ بنادیا گیا۔ ایسا کرنے کا اہم طریقہ غیر ملکی تجارت کو تمام پابندیوں سے آزاد کردینے کا تھا۔ خاص طور پر میٹروپولیٹن ملک کے ساتھ تجارت پر سے تمام قدغنیں ہٹادی گئیں۔ بپن چندرا کی رائے ہے کہ 'کافی عرصے تک نوآبادی میں اس قدر آزاد تجارت کی روش کو اپنایا جاتا رہا جو کہ میٹروپولیٹن ملک میں بھی عنقا تھی' میٹروپولس کے سرمایہ داروں کو نوآبادی میں پلانٹیشن کے لئے قطعات کی فراہمی، تجارت، ٹرانسپورٹ، کان کنی اور بعض دفعہ صنعتوں کے قیام کے لئے مکمل آزادی دیدی گئی۔ (15) نوآبادیاتی ریاست کی طرف سے سرمایہ داروں کی اُس وقت غیر معمولی مالی اعانت کی گئی جب میٹروپولس میں آزاد

معیشت(laissez-faire) کا طوطی بول رہا تھا۔مزید برآں نوآبادی کا زرعی ڈھانچہ بھی بنیادی تبدیلی کا متقاضی تھا تا کہ نوآبادی کو reproductive بنایا جا سکے۔ اس لئے وہاں Capitalisitc agriculture کو رائج کیا گیا تا کہ زرعی پیداوار کو بڑھایا جا سکے اور زرعی اجناس کی منڈی کو ترسیل کو سہل بنانے کے لئے آمدورفت اور نقل وحمل کے شعبہ جات میں بنیادی تبدیلی لائی گئی۔

دوسرے مرحلے کے دوران زیادہ بڑی تبدیلیاں انتظامی شعبے میں کی گئیں۔کلونیل انتظامیہ بہت جامع اور مفصل (detailed) ہو گئی تا کہ میٹروپولیٹن مصنوعات نوآبادی کے بہت ہی اندرونی نوآبادی سے وابستہ دیہی علاقے تک پہنچ سکیں اور ہر اس حصے سے جہاں تک ممکن ہو سکے زرعی خام مال کو حاصل کیا جا سکے۔ اسی طرح قانونی ڈھانچے میں بھی تبدیلی لائی گئی۔ اب معاہدے(Contract) کے تقدس اور اس کے صحیح طور پر اطلاق ونفاذ کو ہر لحاظ سے حکومتی تحفظ دیدیا گیا۔ تاکہ درآمدات اور برآمدات کے نظام میں کوئی تعطل پیدا نہ ہو۔ اسی ہی مرحلے کے دوران ہندوستان میں مغربی قانونی وعدالتی نظام کو رائج کر دیا گیا۔ گوکہ کریمنل لاء، لاآف کنٹریکٹ، سول لاء پریسیجر، پرسنل لاء وغیرہ کو جوں کا توں ہی رہنے دیا گیا۔(16) اور اس سے چھیڑ چھاڑ مناسب نہ سمجھی گئی۔ ایک اور اہم اور قابلِ ذکر تبدیلی ایجوکیشن سے متعلق تھی تا کہ نئی مگر وسیع انتظامی مشینری کو موثر طور پر چلانے کے لئے اہل افراد کے حصول کو ممکن بنایا جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ نوآبادی کو اس کے مادی وسائل کو regenrate کرنے کے قابل بنانے اور 'مقامیوں' میں وفاداری پیدا کرنے کے لئے جدید ایجوکیشن بہت ہی اہم ذریعہ ہو سکتی تھی۔

کلونیل ازم کے دوسرے مرحلے کے دوران انگلستان کے سیاستدانوں کے ایک طبقے میں یہ سوچ کافی مقبول ہونے لگی کہ نوآبادی میں رہنے والوں کو اگر جمہوریت اور سیلف گورنمنٹ کا گر سکھا دیا جائے تو یہ بہتر انسان اور شہری بن جائیں گے۔ اور لاء اینڈ آرڈر کی برکات نیز بزنس کنٹریکٹ کے تقدس، آزاد تجارت اور اقتصادی ترقی وغیرہ کو مستقل بنیادیں فراہم کر کے اگر میٹروپولیٹن ملک نوآبادی سے اپنا سیاسی وانتظامی کنٹرول ہٹا بھی لے تو اس کے اقتصادی مفادات کو گزند نہ پہنچ پائے گی۔(17)

جب یہ سوچ لیا گیا کہ نوآبادی کے سماجی واقتصادی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی لائی جائے

گی تو اب ضروری ہوا کہ ہندوستان کے عصری کلچر اور سوسائٹی کو کمتر اور پسماندہ ثابت کیا جائے تبھی اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کا جواز پیدا ہوگا۔ چنانچہ 19 ویں صدی میں جو تھیوری آف ڈویلپمنٹ وضع کی گئی اس کے اہم خدوخال اس طرح ہیں 1- لاء اینڈ آرڈر کو یقینی بنانا 2- زمین کو ذاتی ملکیت میں دینے کی روایت کا آغاز 3- غیر ملکی سرمائے کو نوآبادی میں انوسٹ کر کے یہاں کی اقتصادی زبوں حالی کو دور کرنے کی کوشش کرنا 4- رسل و رسائل اور نقل وحمل کے ذرائع کو ترقی دینا 5- غیر ملکی تجارت کو فروغ دینا 6- جدید تعلیم کے ذریعے 'مقامیوں' کی تربیت کر کے انہیں اس قابل بنانا کہ وہ جدید اقتصادی تقاضوں کو سمجھ سکیں 7- جدید کلچر کی ترویج تا کہ مقامیوں میں فضول خرچی جیسے قبیح رجحان کی حوصلہ شکنی کی جا سکے۔(18)

کلونیل ازم کے ذریعے نوآبادی کے استحصال کا تیسرا مرحلہ تب شروع ہوا جب بین الاقوامی معیشت میں کئی اہم ترین تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یورپ کے کئی ممالک میں صنعتکاری کا جال بچھ گیا بعدازاں امریکہ جاپان بھی اس صف میں شامل ہو گئے۔ سائنسی علوم کے صنعت پر اطلاق سے صنعتی عمل بہت ہی تیز ہو گیا اور بین الاقوامی منڈی کی وحدت میں رسل و رسائل اور آمدورفت میں انقلاب آ جانے سے مزید استحکام آیا۔(19) ان حالات کے پیشِ نظر نئی اور محفوظ منڈیوں کے لئے تگ ودو میں شدت آ گئی تا کہ ہر میٹروپولیٹن ملک زیادہ سے زیادہ زرعی یا پھر معدنی خام مال پر اپنا تصرف قائم کر لے اور بعد میں اسی خام مال سے تیار کی جانے والی مصنوعات کو نوآبادیوں ہی میں لا کر فروخت کر سکے۔ میٹروپولیٹن ملک میں صنعتکاری کے باعث اور نوآبادیوں کے استحصال کے طفیل 'سرمائے' کی بڑی مقدار جمع ہونے لگی تھی اس کے ساتھ ساتھ کئی ترقی یافتہ ممالک میں بینکوں کے سرمائے کا صنعتی سرمائے کے ساتھ ادغام ارتکازِ سرمایہ کا باعث بنا تھا۔ چنانچہ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ برآمدات زیادہ سے زیادہ کی جائیں تا کہ یہ مرتکز سرمایہ گردش میں آ سکے۔ اس کے لئے نہ صرف نوآبادی میں ڈویلپمنٹ کے عمل میں تیزی لائی گئی تا کہ وہاں پر ایسے حالات پیدا ہوں جو کہ کلونیل مصنوعات کی کھپت کے لئے موافق ہوں۔ لہٰذا کیپٹل انوسٹمنٹ پر کلونیل اجارہ داری شدید کر دی گئی تا کہ نوآبادی سے حاصل ہونے والے وسائل کی ترسیل میں خلا نہ آئے اور وہاں کے افراد کی قوت خرید بھی برقرار رہے۔(20)

تیسرے مرحلے میں سیاسی اور انتظامی امور کے حوالے سے کلونیل ازم کی گرفت شدید تر ہو

گئی۔اور حالات کا تقاضا تھا کہ کلونیل ریاست ہندوستانی معاشرے کے ہر پہلو اور جہت کے اندر تک داخل ہو کر ہر اُس شے پر کہ جس سے اُسے کچھ بھی فائدہ پہنچ سکتا ہو کنٹرول حاصل کر لے۔ اب آزادی کی بات کو ترک کر کے Benevolent Despotism کے نظریے کو مقبول عام بنانے کی کوشش شروع ہو گئی۔نوآبادی کے باسیوں کو مستقلاً 'Child' اور 'immature' قرار دے کر نوآبادیاتی حکمران اُن کے مستقل ٹرسٹی بن بیٹھے ہندوستان کے جغرافیے اور یہاں پر رہنے والوں کی نسل، آب وہوا، تاریخ، سماجی تنظیم، کلچر اور مذہب کو تہذیب اور سیلف گورنمنٹ کی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بنا کر پیش کیا گیا۔یہ سوچ دوسرے مرحلے کے دوران مروجہ سوچ کے بالکل ہی برعکس تھی کیونکہ دوسرے مرحلے میں ہندوستانی لوگوں سے کلونیل آقاؤں کو یہ امید ضرور تھی کہ وہ تعلیم وتربیت کے بعد یورپیوں کی کاربن کاپیاں بن سکتے ہیں۔

اپنے نوآبادیاتی قبضے کو دوام بخشنے کے لئے سیاسی واقتصادی وسائل پر اپنا تصرف قائم کر لینے کے علاوہ انگریزوں نے 'مقامی کلچر' میں دخل اندازی کا آغاز کیا۔خاص طور پر '1813' کے چارٹر ایکٹ کے بعد سے برصغیر کے نظام تعلیم کو اسرنو مرتب کئے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔(21) مستشرقیت پر مبنی علم کے ذریعے مقامی حالات، سماجی طور اطوار، رسوم و رواج اور تاریخ کی نئے سرے سے توضیح کی جانے لگی۔ایتھنو گرافیکل سروے۔مردم شماری کے اعداد وشمار اور ڈسٹرکٹ گزیٹیرز کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سماج کی ذات پات کی بنیاد پر تقسیم پر خصوصی توجہ صرف کی گئی۔(22) اس طرح سے ہندوستانی سماج کو ایک واحدانی اکائی تصور کرتے ہوئے اُسے بعض مخصوص اوصاف کا مظہر قرار دیدیا گیا۔اور ہندوستان کے معاشرے میں موجود تنوع کو غیر لچکدار انداز میں مستقل بنیادوں پر تقسیم کر دیا گیا۔لہٰذا 19 ویں صدی کے بعد سے ہندوستانی معاشرہ سماجی اتھل پتھل کا شکار ہو گیا۔جس کی متعدد وجوہات میں سے ایک وجہ کلونیل جدیدیت (Colonial Modernity) بھی تھی۔صدیوں سے چلی آرہی روایات میں رخنہ پیدا کر کے غیر ملکی تعلیم وعلم کے ذریعے سے انہیں نئی بنیادیں فراہم کر دی گئیں جس کے سوتے انگلستان میں تھے نہ کہ ہندوستان میں۔اس حوالے سے ہندوستان میں انگریزی زبان وادب کو متعارف کروایا جانا بہت اہم اقدام تھا۔انگریزی ادب کو کلچرل سٹڈیز کے طور پر یہاں 1820ء کی دہائی میں متعارف کروایا گیا جبکہ اُس وقت انگلستان میں ابھی تک لاطینی کلاسیکی علوم ہی رائج تھے۔گاوری وشواناتھن کا تو یہ

کہنا ہے کہ انگریزی ادب کے ذریعے دراصل عیسائیت کی تبلیغ کے لئے راستہ ہموار کیا گیا۔(23)
اس مضمون کے ذیل میں وہ عنوانات نصاب میں شامل کر لئے گئے جن کا ہندوستانی تاریخ وادب، رسوم وروایات سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔ لارڈ میکالے اور چارلس گرانٹ کی جانب سے وضع کئے گئے اصولوں کی روشنی میں ہندوستان کے لئے ایسا تعلیمی نظام رائج کیا گیا جس کے ذریعے مغربی علوم سے کہ جو 'مغربی عقلیت' میں گندھے ہوئے تھے یہاں کے طبقہِ خواص کو بہرہ ور کیا جانے لگا۔
اس طرح 19 ویں صدی کے رُبع آخر تک اچھی خاصی کلچرل انجینئرنگ کر دی گئی تھی۔ کلونیل استبداد کی کہانی اُس وقت تک مکمل نہ ہوگی جب تک انگریزوں کے احساسِ برتری اور نسلی تفاخر کا ذکر نہ کیا جائے۔ ہندوستان میں اپنے اقتدار کو استحکام دے لینے کے بعد سے یہاں کی پسماندگی کی وجوہات مقامی کلچر اور نسل کی کمتری میں تلاش کی جانے لگیں۔ ہندوستان کی معاشرتی اقدار کو توہم پرستی، تلذذ اور غیر انسانی رسوم سے عبارت قرار دے کر مسترد کر دیا گیا اور اِس خیال کو رواج دینے کی حتی المقدور کوشش کی گئی کہ مشرق (ہندوستان) کی غیر متمدن عوام کو تہذیب وتمدن سے آشنا کرنے کی ذمہ داری انگریزوں کو خدا نے سونپی ہے۔ اسی نظریے (سوچ) کو White man burden کہا گیا۔ اورتو اور ہرڈر۔ ہیگل اور مارکس نے اورینٹل ڈسپاٹزم (24) کو مشرق کا بالعموم اور ہندوستان کا بالخصوص لازمی وصف قرار دیتے ہوئے نوآبادیاتی دخل اندازی (intervention) کو چھپی ہوئی برکت (Blessing in disguise) قرار دیا۔ اور نتیجہ اخذ کیا کہ یہاں کے فیوڈل اور ڈسپاٹک نظام کو توڑنے کے لئے نوآبادیاتی قبضہ بہتری کی جانب ایک اہم قدم تھا۔

ہندوستان کے طبقہِ اعلیٰ نے کلونیل ازم کی کلچرل برکات کو والہانہ انداز میں اپنایا اور انگریزی اطوار کو اپنا شعار بنا کر فخر کرنے لگے۔ جیمس مل، ولیم جونز، جان کلگرائسٹ، رچرڈ ٹمپل، ایلیٹ اور ڈاؤسن جیسے مستشرق ان کے علمی وفکری رہنما قرار پائے۔ ہندوستان میں رجنی پام دت۔ کنور محمد اشرف اور پروفیسر حبیب نے کلونیل استحصال کو آشکارا کیا بلکہ اس کی مذمت بھی تھی اِس روایت کو بعدازاں عرفان حبیب، بپن چندرا اور سبالٹرن (Subaltern) محققین نے قائم رکھا۔ انہوں نے ایڈورڈ سعید کے ساتھ ساتھ گرامچی۔ ای پی ٹامسن اور فرانز فنین سے خاطر خواہ علمی فیض حاصل کیا لیکن آزادی کے بعد پاکستان میں صورتحال اِس سے یکسر مختلف رہی۔

پاکستانی خواندہ طبقات کلونیل عہد کو خوشحالی، امن وسکون اوراعلیٰ تہذیبی اقدار کا حامل عہد تصور کرتے ہیں۔اب ضرورت اِس امر کی ہے کہ یہاں پر کلونیل عہد کا تجرباتی انداز میں مطالعہ کیا جائے اور پاکستانی ریاست اور معاشرے پر اِس عہد کے اثرات کو علمی ادبی وتحقیقی حلقوں میں زیر بحث لایا جائے۔

# حوالہ جات


1- عینیہ لومبا، ''کلونیل ازم: پوسٹ کلونیل ازم'' (روٹلیج۔لندن 1998) ص 1۔کلونیل ازم کی نظری تفہیم کے لئے مزید دیکھیں رابرٹ جے سی ینگ، ''پوسٹ کلونیل ازم: این ہسٹاریکل انٹروڈکشن'' (بلیک ویل پبلشرز آکسفورڈ 2001) ص 24-15۔

2- ایضاً۔

3- ایضاً ص 2۔

4- ایضاً۔

5- ایڈون ولیمسن، ''دی پین گوئن ہسٹری آف لیٹن امریکہ'' (پین گوئن بکس لندن 1992) ص 66-62۔

6- کیرن آرم سٹرانگ، 'اسلام۔ اے شارٹ ہسٹری' (فونیکس لندن، 2000)، ص 114-110۔

7- لومبا، ص 3۔

8- ایضاً۔

9- بپن چندرا، ''ایسیز آن کلونیل ازم'' (اورینٹ لانگ مین نئی دہلی 1999)، ص 63۔

10- ایضاً۔

11- پارتھا چیٹر جی، ''دی نیشن اینڈ اِٹس فریگمنٹس، کلونیل اینڈ پوسٹ کلونیل ہسٹریز'' (پرنسٹن یونیورسٹی پریس نیوجرسی، 1993)، ص 27۔

12- بپن چندرا، ص 64۔

13- ایضاً۔

14- ایضاً۔ص 65۔

15- ایضاً۔
16- ایضاً۔ص66۔
17- ایضاً۔ص67-66۔
18- ایضاً۔ص67۔
19- ایضاً۔ص68۔
20- ایضاً۔
21- گاوری وشواناتھن ''ماسکس آف کونکوسٹ ،لٹریری سٹڈی اینڈ برٹش رول اِن انڈیا'' (فیبر اینڈ فیبر لندن،1990)،ص23۔
22- برنارڈ کوہن ''کلونیل ازم اینڈ اِٹس فارمز آف نالج'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نئی دہلی)۔ص xiii۔
23- اِس تصور کو اِس کے صحیح پس منظر میں سمجھنے کے لئے دیکھئے ''رونلڈ اِنڈن، اورینٹلسٹ کنسٹرکشنز آف انڈیا''،''ماڈرن ایشین سٹڈیز''،20:(1986) ص445-401۔
24- گاوری وشواناتھن ،ص7۔

❁❁❁❁❁

# سرمایہ داری کی ترقی میں کولونیل ازم کا کردار

ظفر علی خان

اس بات پر تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ کسی معاشرتی ڈھانچے کی ہیت ترکیبی اور اس کے جاری و ساری ہونے کی بنیاد پیداواری عمل ہی ہوتا ہے۔لیکن اس کے لئے ایک خاص ثقافتی ماحول یعنی پیداواری ذرائع کی ملکیت پیداواری رشتوں اور پیداوار کی تقسیم میں مختلف عاملین کے حصوں پر اتفاق رائے یا ان کی عمومی قبولیت کی ضرورت ہوتی ہے یہ اتفاق رائے یا عمومی قبولیت ثقافتی زندگی کے ترغیباتی اور ممانعاتی پہلوؤں سے وجود پاتی ہے۔ترغیباتی پہلوؤں میں مذہب، سماجی اقدار، علوم و فنون، نظام تعلیم و ذرائع ابلاغ، رسوم و رواج اور ممانعاتی پہلوؤں میں ان سب کے علاوہ قانون، تعزیرات و تادیبات، عدالتیں، سزائیں، جرمانے، جیلیں، پولیس، فوج اور دیگر ریاستی ادارے ہوتے ہیں۔ترغیباتی ذرائع ملکیت واختیار کے درجہ بند نظام کے لئے مثبت محرک کے طور پر کام کرتے ہیں جبکہ ممانعاتی ذرائع منفی محرک۔اول الذکر اس نظام کی قبولیت پر اکساتے ہیں جبکہ دوسرے اس سے گریز کو روکتے ہیں۔مثبت محرکات درجہ بند نظام میں فرد یا گروہ کو اپنی معاشی، سماجی و سیاسی حیثیت دیتے ہیں اور ممانعتی محرکات اسے اس حیثیت میں پابند کرتے ہیں۔
یہ چاروں عوامل یعنی پیداواری عمل اور اس سے پیدا ہونے والے بنیادی و ثانوی رشتے مختلف عاملین میں تقسیم ہونے والے پیداواری حصے ترغیباتی و ممانعاتی ذرائع جب آپس میں موافق ہوتے ہیں تو معاشرہ اندرونی طور پر نسبتاً ہم آہنگ ہوتا ہے۔جب تک یہ توافق برقرار رہتا ہے معاشرے میں داخلی ہم آہنگی جاری رہتی ہے۔لیکن یہ زیادہ دیر برقرار نہیں رہتی۔
داخلی طور پر مستعمل ممانعتی ذرائع کی زیادہ منضبط و متشدد شکل یعنی فوج جس کی قوت میں

اضافہ حملوں جنگوں، فتوحات، سلطنتوں کے پھیلاؤ کی طرف لے جاتا ہے۔ پیداواری قوتوں میں اضافہ صنعت وحرفت اور تجارت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ لیکن تجارت کے لئے منڈیوں کی تلاش، تجارتی راستوں کی دریافت وحفاظت اِن پر کنٹرول، سستی افرادی قوت اور سستے خام مال تک رسائی اکثر عسکری قوت کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔ دوسری طرف جنگوں حملوں اور دوسرے ممالک پر قبضوں کے پیچھے بھی یہی مقاصد کارفرما ہوتے ہیں۔ تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ کم تر پیداواری سطح والی اقوام نے اپنی نسبتاً زیادہ کارگر عسکری قوت کی بنا پر متمول اور ترقی یافتہ قوموں کو زیرنگیں بنایا ہے۔ مثلاً صحرائے عرب کی پس ماندگی سے اٹھنے والے عربوں نے ایران اور روم کی بڑی ترقی یافتہ تہذیبوں پر یلغار کی اور بعدازاں صحرائے منگولیا سے آنے والے منگولوں نے تقریباً مہذب دنیا کو روندڈالا۔ گو کچھ عرصے بعد یہ ان تہذیبوں میں ضم ہو گئے اور نئی ہیتیں اور نئی شناختیں وجود میں آئیں لیکن ماضی قریب میں یورپ کی مختلف اقوام کی یلغاریں افریقہ، ایشیا، امریکہ، آسٹریلیا، لاطینی امریکہ وغیرہ میں لوٹ مار، جبر وتشدد سے تجارت اور قبضے کی شکل میں بعض اوقات قبضے اور تجارت کی صورت میں نمودار ہوئیں۔ یورپ نے کالونی گیروں کے ایک کلب کے طور پر سرمایہ داری کی مختلف منازل طے کیں اور کر رہا ہے اور سابق کالونیاں اس کے پیچھے پیچھے اس کے زیر سایہ ثانوی سرمایہ داری میں رینگ رہی ہیں۔ جدید سرمایہ داری کے ارتقاء کا پس منظر کالونیائی ہے۔ اس ارتقا کو کالونیائی پس منظر سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

ماہرین اقتصادیات و مورخین میں یہ بحث رہی ہے کہ مغربی ممالک میں سرمایہ داری کا عروج واستحکام اہل مغرب کی اپنی تخلیقی قوتوں کا مظہر ہے یا پھر اس میں ان کی کالونی گیری اور کالونیوں سے بڑے پیمانے پر ذرائع کی مغربی ممالک میں منتقلی کو دخل ہے؟

زیرنظر مضمون میں ہم نے کوشش کی ہے کہ مغربی سرمایہ داری کے عروج واستحکام کو تاریخی تناظر میں دیکھا جائے۔ پہلے ہم داخلی طور پر ایک ہم آہنگ معاشرے کے اجزائے ترکیبی کا تذکرہ کریں گے پھر مغربی ممالک کے ایشیا، افریقہ، شمالی و لاطینی امریکہ میں ان کی کالونی گیری و تجارت۔ اور پھر قبضے کی صورت میں مقامی معیشتوں کی تباہی اور ذرائع کی مغرب میں منتقلی کے علاوہ ان خاص حالات کا تذکرہ کریں گے جس کے نتیجے میں صنعتی انقلاب رونما ہوا اور بالآخر کالونیاں تو ثانوی سرمایہ داری میں پھنس کر رہ گئیں جبکہ کالونی گیر ممالک میں سرمایہ داری مستحکم و

ارتقا پذیر ہوئی۔

1492 میں سپین سے سلطنتِ غرناطہ کے خاتمے کے بعد سپینی اور پرتگالی مہم جوؤں نے سمندروں کے راستوں کی دریافت اور فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ بحری اور برّی راستے جواب تک مسلمانوں کے قبضے میں تھے ان پر مسلمانوں کی اجارہ داری ختم کرنے اور تجارتی راستوں کو محفوظ بنانے کا بیڑا اٹھایا۔

پرتگال اور سپین سمندری طاقتیں بن گئے۔ سپین نے مغرب کی طرف سے ایشیا جانے کے لئے راستے کو دریافت کرنے کی جستجو کی جس کے نتیجے میں امریکہ دریافت ہوا۔ ہسپانویوں نے دولت اکٹھا کی، لوگوں کو عیسائی بنایا اور چرچ تعمیر کئے۔ جبکہ پرتگالیوں نے تجارت کی طرف توجہ دی اور ساتھ ہی عیسائیت کے فروغ پر زور دیا۔

یورپی باشندوں کو کھانوں کو محفوظ کرنے کے لئے مسالوں کی ضرورت کا احساس ہو گیا تھا جن کے استعمال سے خزاں کے موسم میں کھانے محفوظ رہ سکتے تھے۔ مشرق میں یہ وافر مقدار میں مہیا تھے۔ اس لئے مشرق کی دریافت کے لئے مہم جوئی شروع ہوئی اور بالآخر اس پر تسلط قائم کر کے کالونیاں بنالیں گئیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کہتے ہیں:

''انگریزوں اور فرانسیسیوں نے جزائر غرب الہند میں گنے کی کاشت شروع کی۔ چونکہ گنے کی کاشت کا کام محنت طلب تھا گورے اور مقامی لوگ بھی یہ کام کرنے کو تیار نہ تھے اس لئے افریقہ سے غلاموں کو لایا گیا۔ تین صدیوں میں تقریباً 10 ملین افریقی یہاں آئے۔ عورتیں، بچے، بوڑھے یہاں جبری محبت کرتے تھے اور یہاں سے شکر یورپ اور امریکہ کو برآمد کی جاتی تھی۔ وہاں سے اس کے عوض کھانا، کپڑے اور برتن خریدے جاتے۔ انگلستان کے تاجر صنعتی اشیاء کے عوض غلام خریدتے تھے اس کے نتیجے میں زراعت وصنعت میں ترقی ہوئی۔ برطانیہ کی صنعتی ترقی کی وجہ سے ایجادات میں اضافہ ہوا۔ نئی مشینیں بنیں تاکہ محنت کی جگہ لے سکیں۔ بالآخر اس نے صنعتی انقلاب اور سرمایہ داری کو تکمیل تک پہنچایا۔ (تاریخ کیا کہتی ہے مبارک علی)

لانڈس جیسے مورخین ''یورپی مرکزیت'' کا نکتۂ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق کالونیائی لوٹ جبر اور استحصال کی بجائے یورپی ترقی اس کے لوگوں کی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر

ہوئی ہے۔ مارکس بھی یورپی مرکزیت کے نکتہ نظر سے سرمایہ داری کے عروج کی تشریح کرتا ہے۔
اس کے برعکس (J.M.Blaut) سوال اٹھاتا ہے کہ یورپ میں سترہویں صدی میں کیوں صنعتی
انقلاب آیا اور کیوں اس نے سیاسی و معاشی اور سماجی ترقی کی؟ جبکہ 1492 سے پہلے یورپ اور
افریقہ کے معاشی حالات ان کے ذرائع اور نظام پیداوار ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہ تھے اور
یہ ممالک بھی نظام جاگیرداری سے زیادہ مختلف نہ تھے اور یہ نظام جاگیرداری سے سرمایہ داری کی
جانب آ رہے تھے۔ تاریخی شہادتوں سے یہ ثابت ہے کہ قرون وسطی میں یورپ ایشیا و افریقہ سے
آگے یا ترقی یافتہ نہیں تھا۔"

"1492 کو یورپ کی تاریخ میں اہم سال قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سال امریکہ یا نئی
دنیا کی دریافت ہوئی۔ اس نئی دنیا کی دریافت نے یورپ کو سرمایہ اور طاقت دی جس کی مدد سے
نظام جاگیرداری ختم ہوا۔ سترہویں صدی میں یورپی ملکوں میں صنعت کاروں اور سرمایہ داروں نے
سیاست اور معیشت اور سماج پر اپنا تسلط مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ اس دور میں کالونیائی نظام کی بنیاد
پڑی اور اس مرحلہ سے یورپ کی ترقی شروع ہوئی جس نے دوسرے ملکوں کو آہستہ آہستہ پیچھے چھوڑ
دیا۔"

"ایک اندازے کے مطابق 1646 میں 180 ٹن سونا اور 1700 ٹن چاندی امریکہ سے
یورپ گئی تھی۔ 1580 سے 1561 تک 85% فیصد چاندی امریکہ سے آئی۔ امریکی سونے اور
چاندی نے یورپ کو سرمایہ فراہم کیا۔ اس کی وجہ سے یورپی اس قابل ہوئے کہ وہ زمین کی خریداری
یا مزدوروں کو زیادہ تنخواہیں ادا کر سکتے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے بین الاقوامی تجارت کو کنٹرول
کرنا شروع کیا۔ اس وقت کے بحری مراکز جیسے سونالا، کالی کٹ، اور ملاکا ان کے قبضے میں آ گئے۔
امریکی سونے اور چاندی نے یورپ کے ابتدائی سرمایہ دار کو مؤثر ہتھیار فراہم کئے جس کی مدد سے
اس نے غیر یورپی سرمایہ دار سے مقابلہ کیا اور اسے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

(The Debate on Colonialism & Eurocentralism)

بلاٹ کی طرح آندرے گنتھر فرانک بھی کہتا ہے کہ "مغرب کی ترقی کو عالمی اقتصادی تاریخ
کے پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یورپ کے عروج سے پہلے بھی ایک عالمی اقتصادی نظام
موجود تھا۔ یعنی 1400 سے 1800 تک۔ اس عہد میں یورپ کے پاس برآمد کرنے کے لئے کچھ

نہ تھا۔اس وقت چین اور ہندوستان پیداوار کی زیادہ مقدار رکھتے تھے۔ ہندوستان میں کپڑے کی صنعت انتہائی ترقی یافتہ تھی جبکہ چین میں سلک، سرامک، چائے، سونے چاندی کے سکے اور زراعتی پیداوار کافی ہوتی تھی۔ یورپ ہندوستان اور چین کو نقد ادائیگی کرتا تھا۔ یہ ادائیگی امریکہ سے حاصل کی ہوئی چاندی سے ہوتی تھی۔''

سرمایہ داری کی ترقی میں کالونیل ازم کے کردار پر سب سے اہم کام اس شہر کے عظیم سپوت پروفیسر حمزہ علوی نے اپنے مضمون ''سرمایہ داری کے عروج میں کالونیل ازم کا کردار'' میں کیا ہے۔

حمزہ علوی کے مطابق سرمایہ داری شروع ہی سے ایک عالمی مظہر ہی ہے۔ جس کی بنیاد کالونیوں سے غیر مساوی تجارت کے علاوہ وہاں سے ہتھیائے گئے ذرائع پر تھی۔اس لوٹ نے میٹروپالٹن میں سرمائے کے ارتکاز کو مستحکم کیا۔ مارکسی تاریخ دانی سرمایہ داری کی ترقی میں میٹروپولیس اور کالونیوں کے تعلق کی مرکزی اور کلیدی حیثیت کو سمجھنے میں ناکام رہی ہے۔

وہ ویلرسٹائن پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مارکیٹ سرمایہ داری کے ڈھانچے کی تعریف نہیں کرتی بلکہ سرمایہ دارانہ نظام پیداواری کے لئے جو مرکزی اور خاص بات ہے وہ پیدا کار کی ذرائع پیداوار سے علیحدگی ہے۔ محض مارکیٹ کا پھیلاؤ اور تجارت کیپٹلزم نہیں ہے۔ ویلرسٹائن عالمی تجارتی عمل کو سرمایہ داری خیال کرتا ہے۔اسی طرح وہ ایلن ووڈ پر تنقید میں وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں ''ووڈ کو جاننا چاہئے کہ ارتکاز دولت (جس میں زر و جواہر محلات وغیرہ ہو سکتے ہیں) اور سرمائے کے ارتکاز میں بنیادی فرق ہے۔ کیونکہ سرمائے کا ارتکاز ہمیشہ بڑھتے رہنے والی پیداوار کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ سرمائے کا ارتکاز قدر زائد کو پیداواری سرمائے میں تبدیل کرنے کا عمل ہے جو آگے ذرائع پیداوار میں اضافے اور نتیجتاً پیداوار میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔اور یہ کہ سرمایہ داری جاگیرداری کے اندر نہیں ہوتی یہ اس کی مخالفت میں وجود میں آتی ہے۔ جاگیرداری کے غلبے کے اندر ایسی سماجی پرتیں ہوتی ہیں جن میں سرمایہ داری نمو پذیر ہوتی ہے اور سرمایہ داری کی قوتیں حاوی جاگیرداری کی قوتوں کی مخالفت میں ابھرتی ہیں۔ جاگیرداری نظام پیداواری کے اندر پیداوار (زرعی و حرفتی) بنیادی طور پر ضروری صرف کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔ ضرورت سے زیادہ ہونے والی پیداوار منڈی میں آتی ہے، خریدی اور بیچی جاتی ہے۔ لیکن تجارت

سے جاگیرداری تحلیل نہیں ہوتی۔تجارت نظام پیداواری کی وضاحت نہیں کرتی۔ جاگیرداری نظام پیداواری میں بھی تجارت ہوتی ہے اور عالمی پیمانے پر ہوتی ہے۔لیکن سرمایہ داری کا اصل انجن پیداوار اور اس سے حاصل شدہ قدر زائد کا پیداواری سرمائے میں بدلنا ہے۔

انگلستان میں تجارت کے پھیلاؤ میں علاقائی جاگیردار حائل تھے۔تجارتی مال کو ہر جاگیردار کی حدود پر لگان دینا پڑتا تھا۔ 1485 میں ہنری ہفتم کی بوسورتھ فیلڈ میں فتح کے بعد کنگ رچرڈ سوئم کا جاگیردار دھڑا ہار گیا۔ہنری ہفتم نے مقامی جاگیرداروں کی فوجیں ختم کر دیں، مرکزی فوج بنائی، جاگیرداروں کو دربار میں معزز مقام سے نوازا۔کسانوں پر ان کا جبر جاری رہا ابھرتے ہوئے تاجر طبقے نے اس مرکزی مطلق العنان بادشاہت کی حمایت کی اس کے لئے سرمایہ فراہم کیا۔ شاہراہ شاہ بنائی گئی جس نے پورے ملک کو مربوط کر دیا۔تاجروں نے شاہی فوج کے قیام اور شاہی بحریہ کے بڑھاوے اور اس کی ترقی کے لئے دل کھول کر سرمایہ کاری کی۔حتیٰ کہ برطانیہ سمندروں کی ملکہ بن گیا۔مرکز میں ایک مستقل پیشہ ور فوج اعلیٰ پائے کی بحریہ اور بادشاہ کا مکمل اختیار ابھرتے ہوئے تاجر طبقے کے تجارتی و کالونیائی پھیلاؤ کے لئے نہایت موزوں تھا۔لیکن یہ تبدیلی کوئی بورژوائی انقلاب نہ تھا۔تجارتی سرمایہ دار جاگیردارانہ نظام پیداواری کے ڈھانچے کے اندر ہی کام کر رہا تھا۔ایک مطلق العنان مرکزی ریاست کے وجود میں آنے کے باوجود پیداواری رشتے نہیں بدلے تھے۔ بلاواسطہ پیداکار اب بھی غیر آزاد تھا اور مقامی معززین کی دیہاتی قلمروؤں کا تابع تھا۔بادشاہ کے مقابلے میں علاقائی جاگیردار کمزور ہوئے لیکن مقامی رعایا ان کے زیر تسلط رہی۔ کسانوں کی زندگی و موت ان کے ہاتھ میں رہی۔کسانوں سے ہتھیائی ہوئی زائد پیداوار جاگیردار منڈی میں لاتا۔تجارتیت ابھی کیپٹلزم نہیں بنی تھی۔

مارکس کی پیش گوئی کے مطابق کالونیائی معاشروں میں سرمائے کے اثر کی بنا پر وہاں سرمایہ داری نظام پیداواری تو نہ بن سکا مگر نہ ہی وہ معاشرے کا قومیائے جانے سے پہلے کی طرح کے رہے۔ایسے معاشروں میں سماجی پرتوں نے مخصوص شکل اختیار کی۔مثلاً ہندوستان میں جو ڈھانچہ وجود میں آیا نہ تو وہ کالونیائے جانے سے پہلے والا تھا اور نہ ہی میٹروپولیٹن سرمایہ داری جیسا۔اسے حمزہ علوی کالونیائی نظام پیداواری کا نام دیتے ہیں۔

غلاموں کی تجارت کے حوالے سے امریکہ و ویسٹ انڈیز و افریقہ کی لوٹ کھسوٹ واستحصال

اور یورپ والوں کی ہندوستان اور مشرق بعید کے بحری راستوں کی دریافت نے سولھویں صدی تک عالمی تجارت کو تیزی سے ترقی دی۔ برطانوی صنعتی سرمایہ داری کو مہمیز لگانے اور برطانیہ میں سرمائے کے ارتکاز کو مستحکم کرنے میں ہندوستان اور مشرق بعید کا کردار فیصلہ کن ہے۔ قبل از سرمایہ داری لمبے فاصلوں پر ہونے والی تجارت وہ تناظر ہے جس میں برطانیہ نے ہندوستان اور دوسری جگہوں پر اثر ڈالا۔ اور اس میں اجارہ دار چارٹرڈ تجارتی کارپوریشنوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ انگلستان میں سولھویں اور سترھویں صدی میں بالٹک کمپنی، دی لیوانٹ کمپنی وغیرہ اور ان میں سب سے طاقتور ایسٹ انڈیا کمپنی تھی جس نے آئندہ ہندوستان کو فتح کرنا اور اس پر حکومت کرنی تھی۔ اس نے شاہی چارٹر 1600 میں حاصل کیا۔

اس وقت ہندوستان مشرق بعید، افریقہ اور مشرق وسطیٰ اور اس کے ذریعے یورپ کے ساتھ کپڑے کی بھرپور تجارت یورپیوں کے ہندوستان آنے سے بہت پہلے کرتا تھا۔ عمدہ اور نفیس کپڑے کی یہ تجارت ہندوستانی اور عربی جہازوں کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ زمینی مواصلات کے لئے خچر اور اونٹ استعمال ہوتے تھے۔ ہندوستانی حکمرانوں نے یورپ کی تاجر قوموں کو جن میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نمایاں تھی خوش آمدید کہا جس سے تجارت میں گرانقدر اضافہ ہوا۔ شروع میں مغل حکمرانوں اور ان کے مقامی گورنروں نے کمپنی کو تجارتی مقاصد کے لئے اپنی ''فیکٹریاں'' قائم کرنے کے لئے سہولتیں فراہم کیں۔

پندرھویں صدی میں یورپیوں کے ہندوستان کے لئے بحری راستہ دریافت کرنے سے ہندوستان کی روائتی برآمد کے لئے نیا دور شروع ہوا۔ مشکل زمینی راستوں کی بجائے بحری راستوں کے ذریعے بڑی مقدار میں مال سستے داموں یورپ کو برآمد کیا جانے لگا۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یورپ اور برطانیہ کو ہندوستانی کپڑے کی برآمدات میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا۔ یہ ہندوستان کی خوش حالی کا دور تھا۔ ہر چند کہ یہ دولت حاکم اشرافیہ کے تصرف میں آتی جو نہ تو اسے سرمائے کے پیداواری ارتکاز کی صورت دیتے اور نہ ہی عوامی فلاح و بہبود پر خرچ کرتے۔

History of the Cotton manufactures in 1835-1960ء میں وہ Great British میں قرون وسطیٰ کی ہندوستانی سوسائٹی یورپ کی اس وقت کی دستکاری کی بہترین مہارت کے ہم پلّہ مہارت حاصل کر چکی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی برطانیہ اور یورپ میں بہت

بڑی مقدار میں ہندوستانی کپڑا برآمد کرتی تھی۔ ہندوستانی برآمدات کی 75% ادائیگی سونے کی صورت میں ہوتی جس کی بنا پر ہندوستانی منافع بنجر ہوگیا۔ کیونکہ سونا پیداواری سرمایہ فراہم نہیں کرتا۔ ہندوستان نے تاج محل جیسی پرشکوہ یادگاریں تو تعمیر کیں لیکن وسیع بنیاد والی اجتماعی اقتصادی ترقی کا بندوبست بھی کیا۔ سپین اور پرتگال کی لاطینی امریکہ کی فتح کی وجہ سے وہاں سے سونا چاندی اور جواہرات یورپ آتے اور پھر یورپ اور ہندوستان کی تجارتی ادائیگی میں ہندوستان پہنچتے۔ یوں یورپ کے لئے ہندوستانی عمدہ کپڑے کی خریداری جاری رہی۔

یورپ سے ہندوستان کی تجارت کا پہلا مرحلہ 1757-1600 تک باہمی منفعت اور خوش حالی والا تھا۔ بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیگر یورپی حریفوں بالخصوص فرانسیسیوں کو مقابلے سے خارج کردیا۔ کمپنی کا مفاد اس میں تھا کہ ہندوستانی کپڑا برطانیہ اور یورپ کو برآمد کرنے میں اس کی اجارہ داری رہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ برطانوی صنعت نے کمپنی کی ہندوستانی تجارت پر اجارہ داری کو محدود کرنے کا مطالبہ کیا۔

سترہویں صدی کی ہندوستانی سوسائٹی صنعت وحرفت، زراعت اور ثقافت میں یورپین سوسائٹی کے بالکل برابر تھی۔ اس کی کمزوری اس کی فوجی اور بحری طاقت تھی۔ عرفان حبیب بیان کرتے ہیں۔ سولہویں صدی کے دوسرے نصف میں ہندوستان کے قصبوں میں کاریگر، کارندے اور خدام بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ یہاں 120 بڑے شہر تھے اور 3200 چھوٹے قصبے تھے۔ آگرہ اور فتح پوری سیکری ہر دو لندن سے بڑے تھے دہلی کی آبادی یورپ کے سب سے بڑے شہر پیرس کے برابر تھی۔"

ہندوستان کی شہری آبادی کا بڑا حصہ صنعت وحرفت سے منسلک تھا۔ دستکاری وحرفت نہ صرف یہ کہ اشرافیہ کے لئے سامان تعیش پیدا کرتی تھی بلکہ عام لوگوں کی ضروریات بھی پوری کرتی تھی۔ ایک اور تاریخ دان حمیدہ نقوی (1968:142) لکھتی ہے "سترہویں صدی سے ہندوستان میں کپڑا بنانے والوں کے شہروں اور قصبوں میں وسیع اضافہ ہوا۔ قرون وسطی کی ہندوستانی سوسائٹی مغربی دانشوروں کے خیالات کے برعکس کپڑے کی برطانیہ، یورپ اور چین کے لئے برآمدی تجارت کے تقاضوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہو رہی تھی۔

ہندوستانی کپڑے کی پیداوار میں تیزی سے اضافہ نئے جولاہوں کے اس کام میں شامل

ہونے کی بنا پر تھا نہ کہ ٹیکنالوجی میں ترقی کی بنا پر۔ نئے شامل ہونے والے دادنی قرضوں سے آلات پیداوار و خام مال وغیرہ خریدتے اور دادنی قرض خواہ کو اپنا تیار مال بیچتے۔ دادنی قرض لینے والا قرض دینے والے کو اپنا تیار مال دینے کا پابند تھا وہ تیار مال کسی اور کو نہ دے سکتا تھا۔ لیکن جولاہا اوزار اور خام مال وغیرہ خریدنے اور مال تیار کرنے میں بالکل آزاد تھا۔ اس کے مقابلے میں انگلینڈ میں ایک نظام تھا جسے (Putting out system) کہتے ہیں۔ اس کے تحت ساہوکار خام مال جولاہوں کے پاس گھر گھر لے جاتا اور اسی طرح تیار مال ان کے گھروں سے اُٹھاتا۔ رفتہ رفتہ اس نے محسوس کیا کہ وہ تمام جولاہوں کو ایک جگہ جمع کر کے اپنا کام آسان کر سکتا ہے۔ اس سے انگلینڈ میں فیکٹری کا نظام وجود میں آیا جس کے نتیجے میں میکانائزیشن ہوتی جو صنعتی انقلاب میں پروان چڑھی۔ یہ فعالیت ہندوستان میں پیداوار کی مالی تنظیم میں ناپید تھی۔

1757 میں ہندوستان کی فتح کے بعد کمپنی نے دادنی نظام قرضہ جات کو اپنے ایجنٹوں جنہیں گماشتے کہتے تھے سے تبدیل کر دیا۔ اب کمپنی جولاہوں کو جبراً قرضے لینے پر مجبور کرتی اور برائے نام قیمت پر ان کا تیار مال اُٹھاتی۔ جولاہوں کو کمپنی کے گماشتوں کا عملاً غلام بنالیا گیا۔

آر سی دت (1956:25-6) بیان کرتا ہے "کمپنی کے ملازمین جولاہوں کو ایک جگہ جمع کرتے اور ان پر گارڈ مقرر کر دیتے حتیٰ کہ وہ کمپنی سے معاہدے پر تیار ہو جاتے کہ وہ صرف کمپنی کو ہی مال دیں گے۔ جب کوئی جولاہا پیشگی لے لیتا تو پھر وہ اس قرض سے شاذ و نادر ہی رہائی پاتا۔ ایک چھڑی بردار چپڑاسی اس پر مقرر کر دیا جاتا تاکہ وہ جلدی مال فراہم کرے۔ یوں جولاہوں کے گاؤں کے گاؤں کمپنی کی فیکٹریوں کی غلامی کا شکار ہوئے۔ بعدازاں اس جبر کو قانونی شکل دے دی گئی۔ "آزادی تجارت" (Laissez faire) کی یہ بھونڈی شکل آزاد خیال دت کے لئے بھی ناقابل قبول ہے۔

کمپنی ہندوستانی کپڑے کی برآمد نہ صرف برطانیہ بلکہ مشرق بعید اور یورپ میں بھی کرتی تھی۔ اس کا پھیلاؤ اور اس پر اجارہ اس کا بنیادی مفاد تھا۔ لیکن انگلینڈ میں مقامی کپڑے کی صنعت کی حفاظت اور ترقی کے لئے اس کے خلاف دباؤ بڑھ رہا تھا۔ سترہویں صدی کے وسط میں انگلینڈ میں کپڑے کی صنعت اُبھری۔ مغربی مفکرین جن میں مارکس بھی شامل ہے سمجھتے ہیں کہ "انگلینڈ میں کپڑے کی صنعت صنعتی انقلاب کا باعث بنی۔ اور یہ کہ انگلینڈ کی کپڑے کی صنعت میں مشینی

پیداوار نے ہندوستان کی کپڑے کی صنعت کو تباہ کیا۔ ایسا نہیں ہوا۔ انگلینڈ کی صنعت کی ترقی کے لئے شرط اول تھی ہندوستانی صنعت کی تباہی۔ برطانوی حکومت کو بڑھتی ہوئی ہندوستانی کپڑے کی صنعت کو روکنے کے لئے سخت اقدامات کرنے پڑے۔ 1813 اور 1833 میں کمپنی کی منفعت بخش تجارتی اجارہ داری کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا۔ انگلستان میں ہندی کپڑے کی درآمد پر 1685 میں 10 فیصد ڈیوٹی لگائی گئی۔ 1690 میں یہ ڈیوٹی دوگنی کر دی گئی۔ 1619 میں ایک قانون بنایا گیا جس کے تحت ہندی کپڑا پہننے والے پر 5 پونڈ فی جرم جرمانہ اور بیچنے والے پر 20 پونڈ جرمانہ طے ہوا۔ (کرشنا263"1924)۔ 1757 میں جب کمپنی نے ہندوستان فتح کر لیا تو ہندی کپڑے پر ڈیوٹی 50 فیصد کر دی گئی۔ نام نہاد مشینی پیداوار ہندی نفیس کپڑے کا مقابلہ صنعتی انقلاب کے نصف صدی بعد تک بھی نہ کر پائی۔ برطانوی صنعت کو بچانے کے لئے 1813 میں ہندی کپڑے پر ڈیوٹی 85 فیصد تک بڑھا دی گئی۔

یہ انگلینڈ میں کپڑے کی مشینی پیداوار نہ تھی جس نے ہندوستانی صنعت تباہ کی بلکہ تین دوسرے عوامل تھے جن کی بنا پر یہ تباہ ہوئی۔ تینوں کا تعلق ہندوستانی کپڑے کی مانگ کو ختم کرنا تھا۔ پہلا تو برطانیہ کی طرف سے ہندی کپڑے کے خلاف بھاری حفاظتی ڈیوٹی اور دیگر انتظامی اقدامات تھے جن سے ہندی کپڑے کو انگلستانی مارکیٹ سے دور رکھا گیا۔ دوسرا عامل نپولینائی جنگیں تھیں۔ برطانیہ نے یورپ کی ناکہ بندی کر دی تھی۔ اور ہندوستانی کپڑے کے لئے یورپی مارکیٹ بالکل بند کر دی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ 1789 میں 85 فیصد لٹھا جو انگلینڈ میں درآمد ہوا تھا یورپ کو برآمد کر دیا گیا اور 60 فیصد ململ دوبارہ برآمد کی گئی۔ (Baines:1966-330)۔ تیسرا عامل ہندوستان کی اندرونی مارکیٹ میں کمی تھا۔ کالونیائی تسلط سے پہلے کسانوں سے جمع کئے گئے ٹیکس شہری آبادی اور حاکم اشرافیہ کے ذریعے خرچ ہوتے۔ لیکن کمپنی کی فتح کے بعد یہ ٹیکس کمپنی کے خزانے میں جاتے جو وہ ہندی کپڑے کی برآمد کے اخراجات چکانے کے لئے استعمال کرتی۔ ہندوستانی شہری طبقات اس لئے یک دم مفلوک الحال ہو گئے۔ پرانے پیمانے پر شہروں سے نقل مکانی ہوئی۔ ڈھاکہ کی آبادی 1,50,000 سے 30,000 تک گر گئی۔ جولاہے شہر چھوڑ چھوڑ کر دیہاتوں کی طرف ہجرت کر گئے۔

اس سب کے باوجود ہندوستانی ٹیکسٹائل صنعت حیران کن حد تک سخت جان ثابت ہوئی۔

انیسویں صدی کے درمیان میں جا کر کہیں ہم اسے روبہ زوال دیکھتے ہیں۔ 1815 میں برطانیہ کو برآمد ہونے والی ہندی ٹیکسٹائل کی قیمت 1.3 ملین پاؤنڈ تھی۔ برطانوی حفاظتی ڈیوٹیوں کی بنا پر 1832 تک یعنی صنعتی انقلاب کے تقریباً ایک صدی بعد یہ ایک لاکھ پاؤنڈ رہ گئی۔ دوسری طرف 1815 میں ہندوستان کو برطانوی برآمد صرف 26,000 پونڈ کے برابر تھی۔ صنعتی انقلاب کے بہت دیر بعد 1832 میں یہ بڑھ کر 400,000 پونڈ تک پہنچی اور 1850 میں ہندوستان کو برطانیہ کی کل برآمد کا چوتھا حصہ برآمد ہونے لگا۔ (Dutt.RP 1970:119) 1850 کے بعد کہیں جا کر برطانوی ٹیکسٹائل حاوی ہوئی۔

سی سی ایلڈرج اپنی کتاب وکٹورین امپیریلزم میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بارے میں ایڈم سمتھ کا قول لکھتا ہے۔ ''ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کو لوٹنے والوں کو بھرتی کرنے والی تنظیم ہے۔'' اولین دور کی تجارتی منافع اور مال و زر جمع کرنے والے افراد کی کارگزاریاں اس بیان کو صحیح ثابت کرتی ہیں۔ کمپنی کا ایک جہاز جس کا نام بیرنگٹن تھا۔ 1784 میں انگلستان سے 27,300 پاونڈ کا سامان لے کے نکلا اور 1,19,304 پاونڈ مالیت کے سامان سے لدا ہوا واپس آیا۔ یوں صرف ایک سفر میں اس نے 90,000 پاونڈ کا منافع کمایا۔ آج کے حساب سے بھی یہ بہت زیادہ منافع ہے لیکن اٹھارہویں صدی کے آخر کے لئے تو یہ حیران کن ہے۔ اگر انگلستان ہندوستان کی ضرورت کی اشیاء زیادہ مہیا کر سکتا ہوتا تو ہندوستان سے اس کی تجارت اور بھی زیادہ لوٹ کا باعث بنتی۔ برطانوی تاجر تھوڑی مقدار میں سکہ، تانبا، پارہ، ٹن اور ہاتھی دانت کے علاوہ صرف سونا فراہم کر سکتے تھے۔ اور تجارتیت کے اُس دور میں قیمتی دھاتوں کی برآمد ناپسندیدہ عمل تھی۔ مقصد درآمدی اشیاء کی قیمت کو کم سے کم رکھنا تھا۔ کمپنی اس مقصد کے حصول کے لئے نت نئے ہتھکنڈے استعمال کرتی تھی۔ پہلے تو جبری وصولیوں اور لوٹ مار کے ذریعے اور بعد ازاں جب کمپنی نے انتظامی ذمے داریاں سنبھالنی شروع کر دیں تو زمین پر بھاری ٹیکس لاگو کر دیئے اور پھر بالآخر کمپنی نے ہندوستان کی معیشت کو انگلستان کی ضرورتوں کے تابع کرنا شروع کیا۔ اور یہ سب کچھ آزاد تجارت کے کام پر ہوتا رہا۔

''1762 میں بنگال کے نواب نے ایک مراسلے کے ذریعے برطانوی گورنر کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حرکات کے بارے میں شکایت کی، وہ کسانوں اور تاجروں (رعیت) کی اشیاء اور اجناس

زبردستی چھین کر لے جاتے ہیں اور قیمت کا صرف ایک چوتھائی ادا کرتے ہیں اور تشدد اور جبر کے ذریعے وہ رعیت کو مجبور کرتے ہیں کہ ایک روپے کی چیز وہ پانچ روپے میں خریدیں۔"

1765 میں جب کمپنی نے مغل شہنشاہ سے بنگال کی دیوانی کے حقوق یعنی مالیت اکٹھا کرنے اور اس کا انتظام کرنے کے حقوق لے لئے تو استحصال اور شدید ہو گیا۔ یہ بھی اتنا ہی منافع بخش کاروبار تھا۔ ہر چند کہ کمپنی پہلے حکمرانوں سے زیادہ مالیے کا دعویٰ نہیں کرتی تھی لیکن برطانوی اس کا اطلاق سختی سے کرتے تھے۔ جبکہ بنگال کے آخری مسلمان حکمران نے 1764 میں صرف 8,17,553 پاونڈ جمع کیا تھا لیکن صرف تیس سالوں میں برطانوی آمدن 26,80,000 پاونڈ تک پہنچ گئی تھی۔ مدراس سے وصول ہونے والے مالیہ کی شرح وہاں کی کل پیداوار کا نصف تھی۔ اس آمدن نے انگلستان سے سونے کی برآمد کا مسئلہ حل کر دیا۔ اس سے کمپنی کے ہندوستان میں خریدے ہوئے مال کی قیمت ادا ہونے لگی۔ یوں بیرون ملک کمپنی کی فروخت مکمل منافع بن گئی۔ حقیقت میں یہ ہندوستانی ذرائع کی بڑے پیانے پر اور مسلسل نکاسی کا باعث بنی۔ اور یوں استحصال کو قانونی شکل دے دی گئی۔

اس سے بھی زیادہ نقصان دہ وہ شکنجہ تھا جو برطانویوں نے ہندوستانی معیشت پر کس دیا تھا۔ صنعتی انقلاب کی آمد کے ساتھ کمپنی نے ہندوستانی حرفت وصنعت کی حوصلہ شکنی کی اور خام مال کی پیداوار کی حوصلہ افزائی کی۔ اس پالیسی نے ہندوستانی سوسائٹی کی بنیادی اساس یعنی خود انحصاری گاؤں کو متاثر کیا۔ ہندوستانی سلک اور کاٹن کو ممانعتی درآمدی محصولات کے ذریعے انگلستان میں داخلے سے روک دیا۔ 1813 میں مثال کے طور پر انگلستان میں ہندوستانی لٹھے کی درآمد پر 78 فیصد ڈیوٹی تھی (اگر یہ نہ ہوتی تو وہ انگلستانی کپڑے کے مقابلے میں 50 فیصد کم قیمت پر بکتا)۔ دوسری طرف برطانوی اشیاء برائے نام ڈیوٹی پر ہندوستان میں درآمد کی جاتیں۔ 1840 میں ہونے والی ایک انکوائری میں ظاہر ہوا کہ ہندوستان میں درآمد ہونے والی انگلستانی کاٹن اور سلک ساڑھے تین فیصد اور اونی اشیاء 2 فیصد پر درآمد ہوتی تھیں۔ برطانیہ میں درآمد کی جانے والی ہم پلہ ہندوستانی اشیاء پر 10، 20 اور 30 فیصد ڈیوٹی لگتی تھی۔ کیونکہ برطانوی اشیاء کی ہندوستان میں درآمد مفت اور ہندوستانی اشیاء کی انگلستان میں درآمد پر بھاری ڈیوٹی عاید تھی اور نیوی گیشن ایکٹ کے ذریعے یورپ سے بلاواسطہ تجارت کو روک دیا گیا تھا۔ اس لئے یک طرفہ "آزاد"

تجارت تھی۔اس طرح ہندوستانی ٹیکسٹائل، جہاز سازی، دھات کے شیشے اور کاغذ کی صنعت کا گلہ گھونٹ دیا گیا اور یوں پیدا ہونے والے اندرونی خلا کو برطانوی اشیاء سے پُر کیا گیا۔ہندوستان کو خام کپاس، اون، پٹ سن، تیلوں کے بیج، رنگ اور کھالیں انگلستان کو برآمد کرنے والی زرائتی کالونی میں بدل دیا گیا بہت سے لوگ بری طرح برباد ہوئے۔صرف کپڑا بنانے والی صنعت بچی۔"

ہندوستان میں (Laissez faire) آزاد تجارت کے نظریئے سے ارادۃً اغماض برتا گیا۔ وکٹورین دور میں ہندوستان میں ریل کا جال بچھایا گیا۔آب پاشی کے منصوبے ٹیلیگراف، ڈاک اور بنکوں کے نظام رائج کئے گئے۔ان کاموں سے ہندوستان کو بہت فائدے ہوئے لیکن یہ بات بھی پیش نظر ہے کہ اس بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری میں بھی برطانوی تجارتی اور سٹریٹجک ضرورتوں کو اولیت حاصل رہی۔اس ساری سرمایہ کاری اور خاص طور سے ریلوے میں ہونے والی سرمایہ کاری پر 5 فیصد کی مہنگی شرح سے ہندوستانی محصولات سے سود وصول کیا جاتا تھا۔درحقیقت ہندوستان پر حکمرانی کے ہر طرح کے اخراجات ہندوستانی محصولات سے وصول کئے جاتے جس میں ہندوستان میں فوج رکھنے کے اخراجات سے لے کر انڈیا آفس لندن میں صفائی کرنے والی ملازماؤں کے اخراجات تک شامل تھے۔1857 میں ہونے والی بغاوت کے اخراجات ایسٹ انڈیا کمپنی کے حقوق کو تاج برطانیہ کو منتقل کرنے کے اخراجات، زنجبار کو بھیجے جانے والے مشن کے لئے تحائف کے اخراجات، ایران اور چین میں سفارتی دفاتر کے اخراجات، بحر روم میں متعین بحری بیڑے کے اخراجات، انگلستان سے ہندوستان تک ٹیلیگراف کے اخراجات حتیٰ کہ (Eaping) میں قائم ہونے والے ایک پاگل خانے کے اخراجات تک ہندوستان کے سر تھوپے گئے۔ایک سے زیادہ دفعہ ہندوستانی محصولات سے انگلستان کے توازن ادائیگی کو بحال کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔"

ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف ہندوستان سے 2 سے 5 ملین پونڈ سالانہ برطانوی صنعتی انقلاب کے دور میں مشینری و دیگر ذیلی ڈھانچے کی تعمیر پر لگتے رہے ہیں۔ برطانیہ میں سرمایہ کاری مستحکم ہوتی گئی لیکن کالونیاں اور خاص طور سے ہندوستان ایک صنعتی برآمدی خوش حال ملک سے زرعی پس ماندہ کالونی بن گیا۔ جو کہ برطانیہ کے لئے خام مال فراہم کرنے، اس کی

ضرورتوں کے مطابق فصلیں اُگانے اوراس کی مصنوعات کی محفوظ مارکیٹ میں بدل دیا گیا۔دیگر وجوہات کے علاوہ ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں تجارتی سرمائے کو ریاستی اختیار میں دخیل نہیں ہونے دیا گیا جس طرح کے برطانیہ میں ریاست تجارتی سرمائے کے حق میں استوار ہوتی چلی گئی۔اس کے مفاد کے لئے داخلی اور خارجی حکمت عملیاں مرتب کرتی رہی تاآنکہ مقامی صنعت کے لئے وافر ذرائع جمع ہو گئے۔دوسری بڑی وجہ برطانیہ کی زیادہ فعال بحریہ اور فوج تھی جس کا مقابلہ افرادی قوت میں عدم توازن کے باوجود ممکن نہ ہوا۔اپنی فعال بحریہ، منضبط فوج اور تربیت یافتہ نوکرشاہی کے ذریعے کم تر پیداواری سطح کے باوجود اپنی بحری وفوجی قوت کے استعمال سے کالونیوں سے ذرائع کی لوٹ کھسوٹ کے ذریعے بنیادی سرمایہ مرتکز کیا۔اورآج سرمایہ داری کے داعی اپنی ترقی میں کالونیائی لوٹ کھسوٹ کا ذکر تک گوارا نہیں کرتے۔

# نوآبادیاتی نظام اور فنِ تعمیر

پرویز وندل

جان سٹوارٹ مل نے ایک آزاد خیال مفکر اور نمائندہ حکومت کے فلسفے کا زبردست حامی ہونے کے باوجود ہندوستان کی آزادی اور وہاں نمائندہ حکومت کے قیام کی کبھی وکالت نہیں کی۔ کیونکہ اس کی نظر میں ہندوستان کے لوگ انگریزوں سے نسلی طور پر نہ سہی تنقیدی طور پر کمتر تھے۔ مل لاعلم ہرگز نہیں تھا اور وہ یہ بات بہت اچھی طرح سے جانتا تھا کہ فنون وفلسفہ کے شعبہ میں ہندوستان نے کون کون سی شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ لیکن اس نے یہ رائے اس لئے قائم کی تاکہ وہ چند (انگریز) افراد لاکھوں ہندوستانیوں پر حکومت کرنے کے نوآبادیاتی اصول کو درست قرار دے سکے۔ نوآبادیاتی نظام قائم کرنے والوں نے ہندوستانیوں کی روایات اور اداروں کا مطالعہ کیا اور ان کو جہالت و بے شعوریت میں ڈوبا ہوا پایا۔ انہوں نے ان کو غیر سائنٹیفک اور غیر مادیت پسند قرار دیا کہ جن کا تعلق صرف مذہب سے تھا اور جو اپنے ماضی میں رہ رہے تھے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں اس نقطۂ نظر کا انہوں نے تمام مختلف مذہبی گروہوں (مسلمان، ہندو، جین، بدھ وغیرہ) اور تمام لسانی گروہوں (پنجابی، بنگالی وغیرہ) پر اطلاق کیا اور یوں ہندوستان کے حیران کن عکس نما (kaleidoscope) کی تردید کی۔ نوآبادیاتی نظام کا مادی تقاضا یہ تھا کہ نوآبادیت کی شکار اقوام میں موجود شعوریت، تخلیقیت، سائنٹیفک نقطۂ نظر کی ہلکی سی جھلک کی بھی تردید کر دی جائے کیونکہ ان کے نزدیک یہ چیزیں انقلاب پیدا کر دیتی ہیں۔ نوآبادیت کے کرتا دھرتاؤں نے ہندوستان میں فنون وثقافت پر ہونے والی بحث کی جانب بھی یہی رویہ اختیار کیا۔ فنون اور فنِ تعمیرات میں انہوں نے ماضی کی عظمتوں کی تعریف کی اور ان کے

گن گائے اور پھر انہوں نے مقامی لوگوں کی اس بارے میں حوصلہ افزائی کی کہ وہ طویل دورانیئے تک اپنے ماضی میں ہی کھوئے رہیں اور جدید دور میں نہ تو قدم رکھ ہی سکیں اور نہ ان کا مقابلہ کر سکیں۔

مابعد نوآبادیاتی دور میں صورت حال اور بہت خراب ہوگئی ہے۔ مغرب کی ثقافتی برتری نے مقامی لوگوں کو مغرب کے مقابلے میں بے ذہن بن مانس بنا کر رکھ دیا ہے یا پھر وہ لوگ ماضی میں پناہ ڈھونڈ نکالتے ہیں اور ماضی میں ہی اپنی تسلی بخش شناخت اور فلسفے کو کھوجنے لگتے ہیں۔ مابعد آزاد طاقتیں بھی اسی رویئے کو اپنائے ہوئے ہیں اور ان کی ماتحت ریاستیں اپنے عوام میں اسی بات کو فروغ دیتی ہیں۔ ماضی میں کھوئے رکھنا اس قدر حیران کن ہوتا ہے کہ طاری جمود کو توڑا ہی نہیں جاسکتا۔ ہمارے نوآبادیاتی نظام کی یہی وراثت ہے جو ہمیں ملی ہے۔ فن تعمیر میں بھی یا تو نام نہاد ''جدید'' عمارات ہیں یا پھر ماضی کو دوبارہ سے تعمیر کرنے یا زندہ کرنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ چند ایک ہی ماہرین تعمیرات ماضی کا اس طرح بامعنی انداز میں مطالعہ کرنے کے شوقین ہیں کہ جس سے جدید دور کی سائنٹیفک ترقیوں کے ساتھ مطابقت قائم کر کے مستقبل کو تعمیر کیا جاسکے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو حوصلہ شکن ہوسکتا ہے اور ہمیں اس بات کا زبردست خطرہ بھی درپیش ہے کہ ہم ''لاشعوری جدیدیت'' یا ''غیر فکری روایت'' کے گڑھے میں گر پڑیں۔

ایڈورڈ سعید نے مستشرقین کے مقاصد کے بارے میں جو باتیں کہیں ہیں اس کی بہترین مثال جیمز فرگوسن (James Fergusson, 1808-1886) کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔(1) اس نے ہندوستان کے طول وعرض میں طویل سفر کیئے تاکہ اس وقت موجود تعمیراتی وراثت کا مشاہدہ ومطالعہ کر سکے۔ ہندوستانی تعمیرات کی لامحدود خاصیت پر اس نے فوراً ہی ''ہندو'' اور ''مسلمان'' کے عنوانات چسپاں کر دیئے۔ تب سے ہی اس انتہا پسندانہ زائد از تسہیل (oversimplification) نے ہندوستانی تعمیرات کی تاریخ نویسی کو متاثر کر دیا ہے۔ ہندوستان کے وسیع خطے میں ثقافت، آب وہوا، مواد، اور ارضیات کے اختلافات کے اثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی محدود فکر نے صرف مذہبی پہلو پر زور دیا۔ اس نے خالصتاً مذہبی عمارات کے علاوہ دیگر تمام عمارات میں موجود قابل مشاہدہ فن تعمیر کو اسی نقطہ نظر سے دیکھا۔ فرگوسن نے جو عنوانات چسپاں کیئے ہیں ان کا اطلاق کثیر التعداد غیر مذہبی عمارات پر ہرگز نہیں ہوسکتا جیسے کہ قلعے

ہیں، رہائش گاہیں ہیں، سرائے اور دھرم شالائیں ہیں۔ لیکن اس کا اثر بہت نقصان دہ تھا۔
''مذہبی تشخص کی مرکزیت پر اصرار، جس نے متعینہ تعمیراتی اطوار کی شکل اختیار کر لی، اس نے ہندوستان کی اس طرح سے تعریف کی کہ جو کسی ''مستشرق'' کا قائم کیا ہوا اثر تھا (نہ کہ اصل ہندوستان) یعنی روایت میں بندھے ہوئے لوگوں کی ایک ایسی لازمانی (timeless) سرزمین جن کے نزدیک صرف مذہب کے ہی معنی ہوتے ہیں۔(2) برصغیر میں ہم ہنوز اسی نوآبادیاتی اثر کے تحت اسلامی اور غیر اسلامی عمارات کی تعریف کرتے چلے آرہے ہیں۔

## مناسب طرز تعمیر کی بحث

وائسرائے کی کونسل کے رکن امور عامہ نے 1877ء میں تحریر کیا تھا کہ اس بات میں شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ مقامی مقاصد کے لئے عمارات مثلاً منادر، مساجد، کالجز، اسکولز، مارکیٹس، ہاسپٹلز اور یتیم خانوں کی تعمیر مقامی طرز تعمیر پر ہونی چاہئے جبکہ وہ چیزیں جو یورپیوں کی ضروریات و آسائش کے لئے تعمیر کی جائیں مثلاً ان کی رہائش گاہیں، گرجا گھر، دفاتر، ریلوے کی عمارات وغیرہ وہ ان یورپی طرز تعمیر پر بنائی جانی مناسب ہیں جو ہندوستان کے متنوع موسموں کے لئے اختیار کی گئی ہیں۔(3) حکمرانوں اور مقامی لوگوں کے درمیان قائم کیا گیا یہی امتیاز دراصل نوآبادیاتی مقاصد اور ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہی چیز ہمیں ہندوستانی فن اور سماج کے بارے میں کی گئی علم و تحقیق میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔

پس فن تعمیر ایک ایسا شعبہ تھا کہ جس میں عمارت کے مخصوص انداز سے عظیم سیاسی اہمیت عیاں ہوتی تھی۔ اس لئے یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ ایک ایسے ملک میں کہ جہاں پر تاج محل، اجنتا کے غار اور کونارک کے منادر تعمیر کئے گئے تھے، حکومت نے صرف اس بات کو سہولت آمیز خیال کیا کہ انگلینڈ سے ہی ماہرین تعمیر منگوائے جائیں۔ مقامی فن تعمیر کا واجب طریقے سے احترام کیا گیا لیکن جب ماہرین تعمیرات نے نئی عمارات کو تعمیر کیا تھا تو قدیم روایات کو نظر انداز کر دیا گیا۔

فن تعمیر ایک بہت بڑا ابلاغی ہتھیار (Propaganda tool) ہے۔ قدیم مصریوں کے ایام سے عمارات کو طاقت کے اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ان سے مخالفین کو مرعوب کرنے، لوگوں کو دہشت زدہ (awe) کرنے اور تقریبات منانے کا کام بھی لیا

جاتا رہا ہے۔ جیسا کہ اسٹین نیلسن (Sten Nilsson)(4) نے اس بات کی جانب اشارہ بھی کیا ہے کہ ان (عمارات) کی کلاسیکل اشکال میں وہ قوتیں پنہاں تھی کہ جو بنیادی اشکال (Prototypes) میں بھی نمایاں نہیں ہوتی تھیں۔ یہ فاتح افواج یا فاتح فوجی نظام کی نشانیاں ہوتی تھیں۔ ان سے ایک ثقافت اور ایک ایسی نسل کا اظہار بھی ہوتا تھا جو خود کو برتر تصور کرتی تھی۔ شہری علاقوں میں شہری جگہ، اس کی درجہ بندی، سطح اور ہیت کو سیاسی اثرات کی غرض سے بنایا جاتا تھا۔(5) جیسا کہ سیمونیٹا (Simonetta) کہتا ہے کہ جگہ کے استعمال اور مختلف میدانوں سے ہوتے ہوئے حرکت کرنے کی اہمیت نے فن تعمیر کو ایک ایسے ڈیزائینڈ اسٹیج میں بدل دیا کہ جس پر طاقت ور اپنے جلال کے ساتھ ظاہر ہو سکتا تھا۔(6)

تین پریذیڈنسی دارالحکومتوں مدراس، بمبئی اور کلکتہ میں تعمیر کی گئی ابتدائی عمارتوں نے اپنے اپنے ان مخصوص طرز ہائے تعمیر کو ترقی دی کہ جس نے یورپی فن تعمیر کے پودے لگا دیئے۔ ان میں سے ہر شہر اپنے آپ میں ایک بہت بڑا قلعہ تھا جو اس شہر کی نوآبادیاتی حکومت کا صدر مقام تھا اور اپنی حکومت کا داخلی علاقہ بھی تھا۔ یہ قلعہ نوآبادیاتی نظم ونسق کی قوت کی تصویر کشی کرتا اور باہر والوں پر رعب ڈالتا۔ اس (شہر) کے اندر تجارتی دفاتر، شہری عمارات، گرجا گھر، کلب، افسران کی رہائش گاہیں اور دیگر ایسی تعمیرات ہوتی تھیں کہ جو نوآبادیاتی ارباب اقتدار کے لئے ضروری تھیں۔ ان میں سے ہر ایک عمارت میں تعمیراتی امتیاز کی جھلک نظر آتی تھی۔ کلکتہ اور مدراس میں کلاسیکی (Classical) فن تعمیر بہت عیاں تھا۔ مدراس میں عمارات میں رین (Wren) نے فورٹ سینٹ جارج (1760) میں نشاۃ ثانیہ کو اجاگر کیا، بینکوئٹنگ ہال (Banqueting Hall) (1802) اور کلکٹریٹ (1817) میں ریناساں کو اجاگر کیا گیا۔ جبکہ کلکتہ میں ویلزلی (Wellesley) کے بیروک گورنمنٹ ہاؤس (Baroque Government House) کے اردگرد ایسی کلاسیکی اشیاء تعمیر کی گئیں جیسے ڈورک ٹاؤن ہال (Doric Town Hall)(1813) اور میٹکاف ہال (Metcalf Hall)(1840) بمبئی کے شہری علاقوں کا بڑا حصہ گوتھک (Gothic) طرز کا تھا اور یہی طرز بعد ازاں ریلوے ٹرمینس (Railway Terminus) کی ترقی یافتہ شکل میں سامنے آیا جس کا نام ملکہ وکٹوریہ پر رکھا گیا۔

نوآبادیاتی انتظامیہ کی تعمیر کردہ چھوٹے درجے کی عوامی عمارات کے فن تعمیر کا کمال اطمینان

بخش نہیں تھا۔ جیسا کہ ایک سرکردہ ماہر تعمیر نے تحریر کیا ہے کہ ''انڈین پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ اپنی تعمیراتی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے...... معیاری منصوبے کبھی کبھار ہی تیار ہوتے تھے اور عمارات وہ لوگ تعمیر کرتے تھے کہ جن کو مشرقی طرز تعمیر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان لوگوں (ماہرین تعمیرات) نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی فن تعمیر کے خزانے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کبھی نہیں کی......'' (7)

اہل برطانیہ نے ایک ایسے ملک پر کہ جس پر وہ حکومت کرتے تھے اپنے راج کے دوران ایک حقیقی شاہی طرز تعمیر کامیابی کے ساتھ لاگو کیا۔ دو مکاتب فکر تھے۔۔۔۔ ایک تو جمالیاتی سامراجیت پسند تھے اور دوسرے مقامی احیاء پسند (revivalists) تھے۔ اول الذکر کا کہنا تھا کہ برطانیہ والوں کو رومیوں کو چھوڑ کر برطانوی فن تعمیر کو پورے اعتماد و بھروسے، اور برطانوی قانون، نظام، انصاف اور ثقافت کے ذریعے رائج کرنا چاہیئے۔ ایسا نہ صرف ان کا فرض ہو بلکہ یہ سلطنت برطانیہ کی عظمت بھی ظاہر کرتا ہو۔ شہری فن تعمیر کے اندر ہندوستانی عوام کو ان سب چیزوں کی عکاسی نظر آنی چاہیئے۔ ان کا کہنا تھا کہ عوامی عمارات، برطانوی راج کے بے غرض کاموں کی حقیقی یادگار ہونی چاہیئے۔ ان لوگوں کی احیاء پسندوں کے مکتب فکر نے مخالفت کی جنہوں نے اس بات کا درس دیا کہ فن تعمیر میں بغیر کسی خلاء کے زندہ روایت موجود ہونی چاہیئے جو ماضی اور حال کے درمیان رابطہ قائم کرے۔ اصل پالیسی یہ ہونی چاہیئے کہ تمام درآمدہ اشکال و خیالات سے بچنا چاہیئے اور اس زندہ روایت کا اطلاق کرنے کے لئے ہندوستانی ماہر دستکاروں اور مستریوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے کہ جن کی دستکارانہ صلاحیت اور مہارت عدم سرپرستی کی وجہ سے خطرے میں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان دونوں مکاتب فکر کے درمیان تناؤ بڑھ گیا۔ یورپی جمالیت پسند سامراجیوں کہ جو PWD کو اشرافیہ کے کلب کے طور پر چلاتے تھے نے ان مداخلت کرنے والے شہری ماہرین فن تعمیر کو خوفزدہ ہو کر دیکھا کیونکہ یہ لوگ مقامی فن تعمیر کی جانب آنا اور دیسی تعمیراتی طرز کو اختیار کرنا چاہتے تھے۔ اس کے برعکس احیاء پسند PWD کے راہ میں روڑے اٹکانے والے کردار سے مطمئن نہیں تھے اور 1920ء میں جا کر جان بیگ (John Begg) نے اس بات کی شکایت کی کہ ''ہندوستان میں فن تعمیر اپنے افعال کی جانب عالمی سطح پر غفلت کی وجہ سے محتاج ہو کر رہ گیا ہے۔'' (8)

PLATE 37
A HINDU DOORWAY
SIRDAR-RASTE'S WADA AT WAI
Ⓐ DETAIL OF DOOR FRAME
DOOR SECTION AT WICKET
SECTION
ELEVATION OF ENTRANCE DOOR
Scales
Ⓑ DETAIL OF DOOR RING
Ⓑ DETAIL OF DOOR FRAME
PLAN
SECTION
Ⓓ DETAIL OF DOOR CORNER
CENTRAL DOOR DETAIL Ⓒ
SECTION

PLATE 19
A MOHAMEDAN
DOORWAY
DAVA HALIMA'S TOMB
AHMEDABAD.
scales
ELEVATION
SECTION
DETAILS.
PLAN
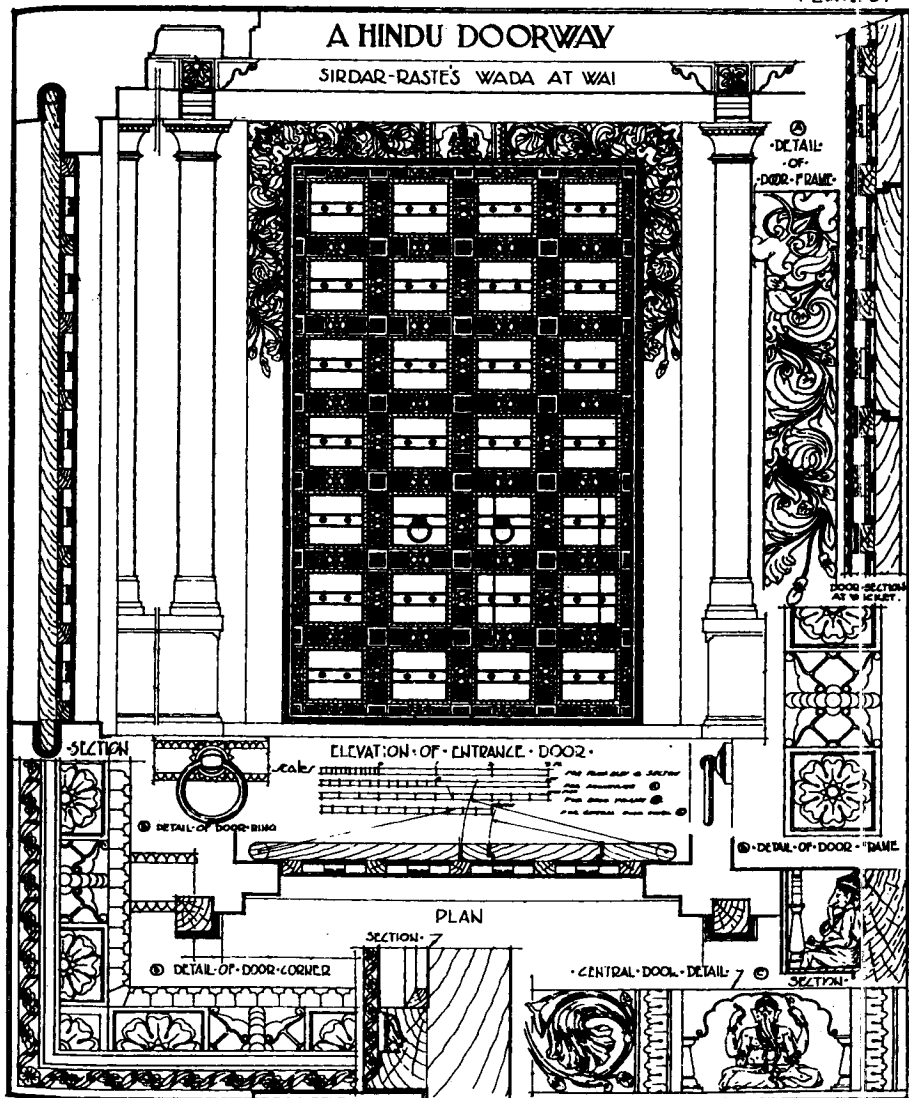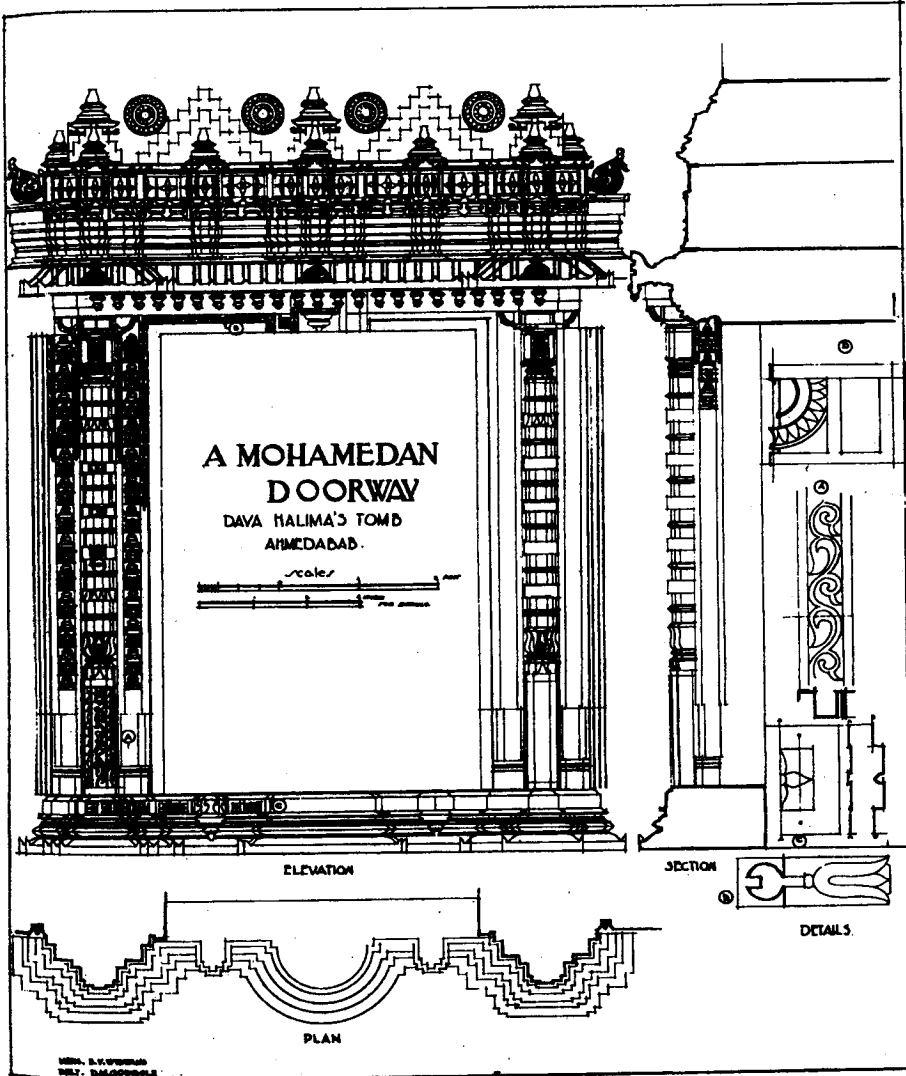
1873ء میں سوسائٹی آف آرٹس میں خطاب کرتے ہوئے ٹی۔راجر اسمتھ (T. Roger Smith) نے کہا کہ ''چونکہ ہمارے نظم ونسق سے یورپی انصاف، نظام، قانون، قوت اور اعزاز کی عکاسی ہوتی ہے۔۔۔۔اس لئے یہ کہنے میں بالکل ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہئے کہ۔۔۔۔اسی طرح سے ہماری عمارات بھی اعلیٰ یورپی طرزِ تعمیر کی حامل ہونی چاہئیں۔ یہ ہر طرح سے یورپی ہونی چاہئے تا کہ ایک تو ہم خود ان پر فخر کر سکیں اور جس سے ہماری موجودگی کی نشانیاں موجود رہیں کہ اس سے ہمارے وقار میں اضافہ ہو بلکہ اس ملک کے مقامی باشندے بھی اس کو تسلیم کریں۔''

البتہ ولیم ایمرسن (William Emerson) اس کی مخالفت میں کہتا تھا کہ ''اہل برطانیہ کو ہندوستان میں ایک نیا فن تعمیر متعارف نہیں کروانا چاہئے بلکہ ان لوگوں کی مثالوں کی اتباع کرنی چاہئے کہ جن کی جگہ وہ خود حکمران بن گئے ہیں۔یعنی مسلمان کے جنہوں نے اپنی ضروریات اور اپنے خیالات کے لئے مفتوحہ علاقوں کے دیسی فنون کو اپنا لیا۔ بلاشبہ اس نے اس بات پر زور دیا کہ یہ بات ناممکن ہے کہ مغربی ماہرین تعمیرات مشرق کے مقامی باشندوں کے لئے موزوں ہوں۔ یہ بحث نہ صرف جمالیاتی معاملات پر بحث کرتی ہے بلکہ اس میں قومی شناخت اور غرض کے وسیع تر تصورات بھی شامل تھے۔طرزِ تعمیر کا انتخاب، کسی عمارت کے اندر جگہ کا تعین اور بلاشبہ حکومت کا کوئی مخصوص یادگار تعمیر کرنے کا فیصلہ یہ سب ہی ایک عظیم سلطنت کے خواب کی توثیق کرتے ہیں۔ان میں سب سے زیادہ مرکزی پہلو سیاسی نوعیت کا تھا۔

نو آبادیاتی مستشرقین نے ہندوستان کا ایسا تصور پیش کیا کہ جیسے یہ ماضی میں کھوئے رہنے والا ملک ہے جو ٹیکنالوجی کے حقائق کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہے۔اور اسی وجہ سے اسے سرپرستی (tutelage) کی ضرورت ہے۔اپنے ماضی کی شاندار کامیابیوں کے باوجود انہوں نے اس کے بارے میں یہ کہا کہ یہاں ایک ایسا سماج ہے جو خرافات میں ڈوبا ہوا ہے اور سائنس کے حیران کن کارناموں سے ناواقف ہے اور جس کا تعلق صرف اور صرف مذہب سے ہے۔تاریخ ہند کو دوبارہ سے ترتیب دیتے ہوئے انہوں نے مختلف زمانوں کو ہندو عہد اور مسلمان عہد میں تقسیم کر دیا لیکن اپنے دور کو عیسائی عہد نہیں کہا۔اس طرح کی درجہ بندی سے ہندوستانی عوام کے درمیان قائم ثقافتی شاملات (commonalities) پر زبردست وار کیا گیا اور صرف سیاسی حکمرانوں کے درمیان اختلافات کو اجاگر کیا گیا۔اس نو آبادیاتی اصول کا مدعا یہ تھا کہ ہندوستان میں ہر چیز پر دو

بڑے مذاہب پر مبنی لیبل لگا دیئے جائیں یعنی ہندو اور مسلمان اور اس عظیم رنگا رنگی (Variety) اور قوت حیات (Vitality) کو نظر انداز کر دیا جائے جو اس وسیع وعریض زمین نے پیدا کی۔ اس اصول کے ذریعے مقامی آبادی کی ہر ثقافتی قوت حیات اور تخلیقی صلاحیت کی نفی کر دی گئی۔ فرگوسن ایک جانب تو تعمیراتی فن کے اظہار کی نفی نہیں کرتا جبکہ دوسری جانب وہ تمام تعمیرات پر ہندو یا مسلمان تعمیرات کا لیبل لگا دیتا ہے۔ اور اس لیبل کا انحصار بھی حکمران کے میلان پر ہوتا ہے۔ پس فن تعمیر کسی ہندو راجہ کے زیر اقتدار ہندو فن تعمیر بن جاتا ہے اور مسلمان نواب کے زیر اقتدار مسلمان فن تعمیر۔ یہ بات اس حد تک پھیلائی گئی ہے دروازوں اور جالیوں کو ہندو دروازہ اور مسلمان جالی کہا جانے لگا۔

سرکاری وقائع نویس، درجہ بندی کرنے والے اور لیبل لگانے والوں نے اتنے کثیر التعداد تعمیراتی کاموں پر بہت کم توجہ دی جو کسی علاقے میں تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے عوام کے درمیان مشترکہ تھے۔ ہندوستان کو سمجھنے کی کوششوں میں انہوں نے ہندوستان کو بہت سادہ بنا دیا اور حیران کن اقسام کی تردید کر دی۔ انہوں نے ''راج'' کی تعمیر کردہ عمارات کے لئے فن تعمیر کی اِس یا اُس قسم کی موزونیت پر اپنی آراء کا اظہار کیا۔ جب ویلزلی نے مقامی لوگوں کو متاثر کرنے کی غرض سے ایک بہت بڑا محل تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے ایک یورپی طرز کا انتخاب کیا البتہ فوراً ہی یہ کام ایک مقامی ماہر تعمیر کو دے دیا گیا۔ برطانوی راج کے ابتدائی عہد میں سرکاری عمارات فوجی انجینئرز نے تعمیر کیں جو ماہرین تعمیر بھی بن چکے تھے۔ یہاں تک کہ جب کبھی ان لوگوں نے مقامی فن تعمیر کو اختیار کرنے کی کوشش بھی کی جیسا کہ اجمیر کے میو کالج کے ضمن میں ہوا تو اس کام کو کرنے کے لئے کوئی مقامی ماہر تعمیرات ان کو اہل نظر نہیں آیا۔ ایک ایسے سماج میں کہ جہاں پر تاج محل تعمیر ہو گیا تھا وہاں پر ان کو کوئی باصلاحیت ماہر تعمیر نہیں ملا۔

اب ایک بار پھر سے اہل برطانیہ نے لیبل لگانے کے اپنے منصوبے کی جانب توجہ کی۔ تمام مقامی ماہرین فن تعمیر کو محض ''مستری'' قرار دے کر ان کو چھوٹے درجے کے ماہر تعمیرات کا درجہ دے دیا گیا۔ اس بات کو مزید تقویت تب ملی کہ جب حکومت نے انجینئرنگ کے اسکول اس غرض سے قائم کئے کہ تاکہ ایسے ٹیکنیشنز طبقے کو پیدا کر سکیں کہ جو مزدوروں کو ہدایات دے سکے۔ مقامی اسکولوں سے تعلیم حاصل کرنے والے یہ افراد کبھی بھی ان انگریزی تعلیم یافتہ انجینئرز کے درجے پر

قبول نہیں کیے گئے کہ جو کسی برطانوی یونیورسٹی سے پڑھے تھے لیکن ان کو زیادہ سے زیادہ ذمہ داریاں دی جانے لگیں کیونکہ برطانیہ سے اتنی بڑی تعداد میں انجینئرز فراہم نہیں کیے جا سکتے تھے جتنی کہ ان کی مانگ تھی۔ برطانوی انجینئروں کی یہ کمی حقیقت میں اس وقت بہت زیادہ محسوس کی گئی کہ جب حکومت نے نئی عمارات کے منصوبے بنائے اور ایک پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ قائم کیا۔

ہندوستان میں موجود اہل برطانیہ میں سے کوئی بھی عمارات کی اس زندہ روایت کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا جو سرکاری برآمدوں میں (stifled) ہو چکی تھی لیکن اب بھی وہ سارے ہندوستان میں مقامی تاجروں کی تعمیر کردہ عمارات میں زندہ تھیں۔ ہندوستان میں تجارتی طبقات حکمرانوں یا برطانوی حکمرانوں کے پیدا کردہ جاگیرداروں کی نسبت اس ثقافتی برتری سے آزاد تھے۔ اس سے کئی دلچسپ تعمیرات سامنے آئیں اور ان پر سیر کرنے والوں اور ضلعی افسران نے تبصرے بھی کیے ہیں۔

میو اسکول آف آرٹس کے بانی و پرنسپل جان لوک وڈ کپلنگ (John Lockwood Kipling) نے لوگوں کی دستکاری میں مقامی فنون لطیفہ کی قوت حیات کو دیکھا۔ وہ انفرادی طور پر ایسی جگہ جا پہنچا کہ جہاں کوئی بھی انگریز نہیں پہنچ سکا۔ میو اسکول آف آرٹس کے پرنسپل کی حیثیت سے اس نے پورے پنجاب کا دورہ کیا تا کہ وہ یہاں کے ٹیلنٹ کو اسکول میں داخل کر سکے اور دستکاری کے ان مختلف اسکولوں کا جائزہ بھی لے سکے کہ جو حکومت نے قائم کیے تھے۔ فن تعمیر کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ "یہ اس ملک کا مقامی فن تعمیر ہے کہ جس کا ہم اس وقت حوالہ دے سکتے ہیں کہ جب ہم ہندوستانی ڈیزائن کو بطور زندہ قوت کے پیش کرنے کا تصور قائم کرنے کے خواہش مند ہوں۔" (9)

مقامی ڈیزائنرز کے کاموں میں تبدیلیوں کو محسوس کرتے ہوئے کہ جو کہ مغربی ڈیزائن اور خیالات کے اظہار کا نتیجہ تھیں وہ کہتا ہے کہ "اب جو ترقی دراصل ہوتی رہی ہے وہ کوئی درآمدہ و مصنوعی نوعیت کی نہیں ہے کہ جس کے لئے کوئی خاص تاریخ مقرر کی جا سکے۔ بلکہ یہ تو جدید زندگی کے متغیرہ حالات کو رضاکارانہ طور پر قبول کر لینے کا لازمی نتیجہ ہے اور یہ بہت غیر محسوس کن ہے کیونکہ اتنے لگاتار متغیرہ قوانین زبانی اور روایتی ہیں لیکن تحریری نہیں ہیں۔ (10)

توقع کے عین مطابق نوآبادیاتی منتظمین نے کپلنگ اور ان دیگر لوگوں کی بات ماننے سے

انکار کر دیا کہ جنہوں نے زندہ روایت کی طاقت کو محسوس کیا تھا۔ انہوں نے اس کو دیکھنے سے بھی انکار کر دیا کیونکہ اس سے ان چیزوں کو قبول کرنے کو تقویت ملتی جس کے دوررس سیاسی اثرات ہوتے۔ اگر ہندوستانی تخلیقی ذہن کے حامل ہیں، ان کا فن زندہ ہے اور تمام ہم عصر علوم کو سمجھنے کے قابل ہیں تو اس کا مطلب ہے وہ اپنی حکومت کرنے کے بھی قابل ہیں اور اپنے فیصلے خود کرنے کے اہل ہیں اور یوں ان کو کسی سرپرستی کی ضرورت نہیں۔ ایک نوآبادیاتی حکمران فنون کے اندر قومیت کے جذبات کا اتنا ہی مخالف تھا جتنا کہ سیاست کے اندر وہ کسی قوم پرست تحریک کا۔ انہوں نے فلسفے کی سرپرستی کی کہ جو ہندوستانیوں کو عہد جدید، ٹیکنالوجی و سائنس کے حقائق اور قوم پرست فکر سے دور لے گئی۔ انہوں نے مذہبی بحث و مباحثوں کو فروغ دیا۔ مابعد نوآبادیاتی دور میں بھی پورے برصغیر کا ریاستی ڈھانچہ تشدد اور بنیاد پرستی کو فروغ دیتا ہے کہ جس کے ایسے ہی خطرناک نتائج نکلتے ہیں کہ جیسے گجرات، ہندوستان میں اور کراچی، پاکستان میں نکلے ہیں جو کہ محض دو مثالیں ہیں۔

اس لئے فن تعمیر میں ہمیں کس طرز کو اختیار کرنا چاہئے۔ یہ لازم ہے کہ مغرب کی لاشعور ہو بہو نقل کو نظر انداز کر دیا جائے اور روایت کے غیر فکری ٹھیکیداروں سے ہوشیار رہا جائے۔ واحد راستہ یہ ہے کہ روایت کی قدر کی جائے اور آج کی سائنس میں حیران کن ترقیوں کو اپنے اندر سمو لیا جائے۔ یہ ایک بہت مزیدار سفر ہوگا جو مشکل تو ہوگا لیکن آخر میں جا کر اس کا بہت بڑا اصلہ ملے گا۔

# References

1. Fergusson, James (1808-1886) traveled largely in India to study styles of architecture, 1835-42, left India in 1845, joined the Royal Asiatic Society, 1840, Secretary to the First Commissioner of Public Works, 1869; wrote *Picturesque Illustrations of Ancient Architecture in Hindostan; Rock-cut Temples of India; An Historical Enquiry in the True Principles of Beauty in Art; History Indian and Eastern Architecture etc.* Received the gold medal for Architecture from the RIBA, and was often consulted on architectural questions. (Dictionary of Indian Biography, Buckland, 1905, reprint 1985).
2. Metcalf, Thomas R, *Modern India An Interpretive Anthology*, Sterling Publishers, 1990, Architecture and the Representation of Empire: India, 1860-1910, p 44.
3. Cited by Metcalf, Thomas, R., *Architecture and the Representation of Empire: India 1860-1910 in Modern India, An Interpretive Anthology* ed. Metcalf, Sterling Publishers, 1990.
4. Nilsson, *Sten European Architecture in India*, Faber &

Faber, London 1968.

5. Vandal, Pervaiz, *Urban Space as an Expression of Power, Journal of the Indian Institute of Architects,* April 1993.
6. Simonetta Casci, *Lucknow Nawabs: Architecture and Identity,* EPW (Economic and Political Weekly September 2002).
7. Jacob, Swinton, S., Col., Engineer to Jeypore State, in Preface to Collection of Drawings of works near Delhi and Agra and parts of Rajputana (Plates), Rajputana, 1890.
8. Begg, J. FRIBA, *Consulting Architect to the Government of India, preface to Educational Buildings in India.*
9. Kipling J. L., *Indian Architecture of Today,* The Journal of Indian Art.
10. *Ibid.,*

# مستشرقیت اور پاکستان کی سماجی تاریخ

ندیم عمر

نوآبادیات ایک ایسا جدید نظام ہائے حکومت ہے جس کے ذریعے منڈیوں، ریاستوں اور سماجوں کو محکوم رکھا جاتا ہے۔ پچھلے تین سو سال میں مغربی نوآبادیات کے نظام میں بیش بہا تبدیلیاں آئی ہیں جن میں سب سے اہم جدید قومی ریاستوں کا وجود میں آنا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس نوآبادیات نظام نے کئی چہرے بدلے ہیں۔ آج کے اس مقالے میں مغربی نوآبادیاتی نظام کے پاکستان کی ریاست اور اس کی تاریخ پر اثرات پر بحث شامل ہے۔ 18ویں صدی میں برصغیر میں نوآبادیاتی نظام کی ابتداء مغربی بنگال سے ہوئی جو بڑھتے بڑھتے 1843ء میں سندھ، 1849ء میں پنجاب اور دوسرے حصوں پر غالب آ گیا۔ اس نظام کی تشکیل میں مغربی مفکرین کے خیالات پر مبنی نظریات نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ مفکرین جو مستشرقی علوم oriental knowledge مثلاً ہندوستانی زبانوں، مذاہب اور تاریخ پر عبور رکھتے تھے انہیں ان کے موضوع سخن کے مطابق مستشرقین orientalist کہا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے مفکرین خصوصاً ایڈورڈ سعید نے اپنی شہرہ آفاق کتاب orientalism کے ذریعے ان سکالرز کے علم و فضل کا پردہ چاک کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ مشرقی علم جو..... objectivity کی بنیاد پر سچے علم کا درجہ رکھتے ہیں درحقیقت نوآبادیاتی نظام کے شکنجے کو مضبوط کرنے میں مددگار ثابت ہوئے۔ ان خیالات کے ڈھانچے کو، جس کو ہم مجموعی طور پر orientalism یا مستشرقیت کے نام سے جانتے ہیں، اس نے نوآبادیاتی نظام کی پرورش اور ترویج میں بے حد اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان کی قومی ریاست کا سانچہ مستشرقین کے افکار پر ڈھلا ہے۔

اب میں مختصر طور پر سامراجی جدیدیت کا ایک محدود تاریخی جائزہ پیش کروں گا جس کے تحت جدیدیت کا ایسا نظام نافذ کر دیا گیا جو جنوبی ایشیاء کے انسانی اور وجودی تجربے سے میل نہیں کھاتا۔ پاکستان کی قومی ریاست جدیدیت کے اس نو آبدیاتی نظام کی وارث اور ان کی غاصبانہ روایات کی امین ہے۔

17ویں صدی میں یورپ کے عالمی عروج کے آغاز میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یورپی اقوام کی سماجی اور مادی ترقی میں ان پسماندہ اقوام اور افراد کا بھی حصہ ہے جو سائنس اور ترقی کے عمل سے کٹ کر رہ گئے ہیں ان غیر ترقی یافتہ اقوام میں یورپی اقوام کو اپنا تاریخی بچپن نظر آتا تھا۔

انگریزوں کے اس عالمی تہذیبی مشن کے پس منظر میں اس کا اقوام عالم میں 19-18 صدی میں ایک ''برطانوی قوم'' کے سماجی اور سیاسی اکائی کے طور پر ابھرنے کا عمل بھی کارفرما ہے جو ایک عالمی قومی تاریخ کے پس منظر میں ایک اچھوتا واقعہ تھا۔

ہندوستان کے انگریز حکمرانوں نے ہندوستان کے غاصبانہ قبضے کو ایک تہذیبی مشن کے طور پر جائز کر دیا۔ ان کے مطابق جس طرح رومی حکومت نے اقوام یورپ میں برطانیہ کی تہذیب کو جلا بخشی جس طرح سے برطانیہ بھی آئرلینڈ کی فتح کے بعد خود کو یورپ کے نئے رومی حکمران کے طور پر ہندوستان کے پس ماندہ عوام کی ترقی کا جائز وارث قرار دیا۔ جنوبی ایشیاء میں جاگیرداری سماج سے لے کر قومی لسانی تعصب تک معاشی پسماندگی سے لے کر علمی انحطاط تک نو آبادیاتی ریاست کے وہ اقدامات ہیں جن کے تحت برطانوی سامراج نے جنوبی ایشیائی سماجوں کو علمی اور انتظامی تجربہ گاہ بنائے رکھا تا کہ ان کی تہذیبی برتری اور معاشی کنٹرول قائم رہے۔

ترقی کے اس سفر کا آغاز ہندوستان میں ذاتی ملکیت کے تصور سے ہوا جس کے پیچھے فرد کو طاقتور اور گروہ اور سماج کو کمزور کرنے کے عوامل پیشِ نظر تھے۔

جان سٹیوارٹ مل کے نظریات، حکومت برطانوی کے خیالات کے نمائندے تھے کہ انفرادی حقوق ملکیت کے اش سرزمین کا پیداواری عمل میں حصہ بڑھ جاتا ہے اور ایک طبقہ وجود میں آجائیں جو زمین کو ریاست کی قانون کے تاطع رکھے۔ ہندوستان کے سماجی اور معاشی ڈھانچے کو ترقی یافتہ بنانے کیلیے نئے قوانین بنائے گئے جن کے نفاذ کے لیے سول اور ملٹری بیوروکریسی کے نئے ادارے بنائے۔ فورٹ ولیم کالج نے نہ صرف تعلیمی اداروں کے لیے ایک ماڈل کا کام دیا بلکہ

برطانوی سول سروس کے لیے نرسری کا کام دیا۔اس کے سرکردہ اساتذہ کے سر ہندوستان کی فکری دریافت کا سہرا بندھتا ہے۔

ہندوستان میں جدید علوم کی ادارہ جاتی تاریخ کا آغاز 1784ء سے ہوتا ہے جب کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا قیام عمل میں لایا گیا۔سوسائٹی، ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ دار اور ایک ممتاز ماہرِ لسانیات ولیم جونز (1794-1746) کے ایماء پر، قائم کی گئی۔اپنے قیام کے تقریباً سو سال بعد ایشیاٹک سوسائٹی کو ہندوستان میں تاریخ، فلسفے، مذہب، زبان، ادب، آرٹ، آرکیٹیکچر ،قانون ،تجارت اور مینوفیکچرنگ جیسے علوم کو فروغ دینے ،منظم کرنے اور مشتہر کرنے کے ضمن میں ایک مرکزی ادارے کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ بہت سے یورپی سکالرز جو پہلے سے ہندوستان میں کام کررہے تھے اس سوسائٹی کے ساتھ منسلک ہوگئے اور انہوں نے جدید علوم کی دنیا میں یورپی مشرقی زبانوں سے متعلق علم کو ایک اہم شعبے کے طور پر متعارف کروانے میں مدد دی۔ پنجاب میں سر ڈینزل ایبسٹن ، سر رچرڈ ٹمپل ، جی۔ڈبلیو لائٹنر جیسے مفکرین نے ایشیاٹک سوسائٹی کے کام کو آگے بڑھایا اس طرح سے انیسویں صدی میں زبانوں کے علم کے فروغ کے ضمن میں سب سے زیادہ اہمیت یورپی مشرقی زبانوں کے علم کو دی جانے لگی خاص طور سے یورپ میں اور سماجی علوم کو ہندوستان کے مقامی لوگوں کے ذہنوں میں سائنسی انداز میں ترتیب دیا جانے لگا۔

پالی زبان (400 بعد از مسیح ) کی قدیم تحریروں پر مشتمل سنسکرت گرامر کے مطالعے کی بنیاد پر جدید لسانی تجزیے کیے گئے اور جرمن مفکرین کے کام کی تقلید کی گئی جس کی وجہ سے مختلف زبانوں کے تقابلی علم کو فروغ حاصل ہوا۔زبانوں کے مشترک خصائص کی تلاش کے نتیجے میں انڈو یورپی زبانوں میں موجود مشترکہ خواص کی دریافت کی گئی۔اس کی وجہ سے انیسویں صدی کے نصف آخر میں مشترکہ آریائی نسل جیسے نظریات پیدا ہوئے جن کے مطابق آریائی نسل کی دوشاخوں نے ہجرت کے بعد بیک وقت ہندوستان اور یورپ میں پناہ لی۔

انیسویں صدی میں ہر قسم کے سماجی نظریے نے اپنے تاریخی ارتقاء اور جدید دنیا میں اپنے وجود کی وضاحت کے لیے مرکزی توانائی اسی تہذیبی شخصیت سے حاصل کی۔سیاسی معیشت کے ماہر انگریزوں اور افادیت پسندوں utalitarians، فرانسیسی اثباتیت کے حامیوں اور بڑے بڑے نظریہ سازوں جیسے ہیگل، مارکس اور ویبر سب نے تمام دنیا کی وسیع وعریض تاریخی تشریح میں

ہندوستان کے خطے کی فکری دریافت جیسے نقطے پر خصوصی توجہ دی۔ پارتھا چٹرجی کے مطابق:

ہندوستانی معاشرے کے متعلق مہیا شدہ ان معلومات کی چار بنیادی شاخیں تھیں:
سب سے پہلے خطے کی مالیاتی تاریخ کو اہمیت دی جاتی تھی۔ فتح بنگال کے بعد برطانوی سرکار نے لوگوں کو دیے گئے کلیم، عہدوں، اختیارات اور امتیازات کی فہرست بنانی شروع کی۔ بنیادی مقصد زمینوں کی تقسیم تھا۔ لیکن جلد ہی ان معلومات کو مالیات کے ضمن میں مالیاتی تاریخ اور زمینی تقسیم کے موضوع پر با قاعدہ مستند سیریز کے طور پر مرتب کیا جانے لگا۔ ان معلومات کو ہر تین یا چار دہائیوں کے بعد قصبہ در قصبہ منظم کیا جاتا تھا۔
سرکاری علم کی دوسری شکل یا شاخ سروے تھی۔ جس کا آغاز 1765ء میں مفتوحہ علاقوں کی نقشہ بندی کے ساتھ ہی کر دیا گیا تھا۔ اس کام کے لیے مرکزی ادارہ سروے آف انڈیا تھا لیکن انیسویں صدی کے دوران تقریباً ایک درجن کے قریب مزید مستقل تنظیمیں وجود میں آگئیں یا لائی گئیں جن کا کام ماہرانہ انداز میں ہندوستان کے قدرتی وسائل کے بارے میں معلومات مجتمع کرنا اور اس خطے کے سماجی و ثقافتی خدوخال واضح کرنا تھا۔
نوآبادیاتی معلومات کے ضمن میں تیسرا ادارہ جاتی حربہ مردم شماری تھا۔ 1871ء سے لے کر ہر دس سال بعد سینسس آف انڈیا کے تحت مردم شماری کروائی جاتی تھی۔ جس کے ذریعے برطانوی ہندوستان کی تمام آبادی سے متعلق عمر، پیشے، ذات پات، مذہب، خواندگی، جائے پیدائش اور موجودہ رہائش جیسی معلومات حاصل ہوتی تھیں۔ مردم شماری کی رپورٹیں نہ صرف مفصل شمارياتی معلومات مہیا کرتی تھیں بلکہ ذات پات کے نظام، مذہب، شرح پیدائش و اموات، گھریلو تنظیم اور معاشی ڈھانچے کے متعلق تجزیہ نگاری میں معاون ثابت ہوتی تھیں۔ اس بنیاد پر وسیع پیمانے پر سرکاری مطبوعات جیسے امپیریل گزیٹیئر شائع کیے جاتے تھے جن میں برطانوی ہندوستان کے ہر قصبے اور قبیلے کے متعلق ہر قسم کی مقامی معلومات موجود ہوتی تھیں۔
چوتھی شکل عجائب گھروں کی تھی جن میں آثار قدیمہ اور آرٹ کے نمونے، مخطوطے اور مسودے جمع کیے جاتے اور ان کو محفوظ کر لیا جاتا تھا تاکہ ماہرین ان کو دیکھ کر اپنی آراء قائم کر سکیں۔ اس غرض سے ایشیاٹک سوسائٹی کے تحت سب سے پہلا بڑے پیمانے کا عجائب گھر

1814ء میں قائم کیا گیا۔اس میں جمع کی گئی نادر اشیاء بعد میں 1866ء میں برطانوی سرکار کے تحت قائم ہونے والے مرکزی عجائب گھر انڈیا میوزیم ان کلکتہ میں رکھی جانے والے اہم اشیاء میں سے تھیں۔ 1874 میں آرکیولوجیکل سروے کیا گیا تاکہ آثار قدیمہ میں شامل علاقوں کا اندراج کیا جاسکے،مخصوص علاقوں میں کھدائی کا کام کیا گیا،تاریخی یادگاروں کومحفوظ کرنے کا کام اوراصلی مقامات پر ہی عجائب گھروں کی تعمیر اور آثار قدیمہ کے نمونوں کے محفوظات کا انتظام کیا گیا۔

یورپ سے تعلق رکھنے والے یورپی مشرقی زبانوں کے ماہرین نے قدیم سنسکرت اور پالی کی تحریروں کی تدوین اور مطالعے کے ذریعے ہندوستان کو بے حد قدیم فلسفیانہ اور جمال پرست تہذیب کے طور پر متعارف کروایا۔لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ اس فتہذیب کی ترقی کے سوتے سوکھ چکے ہیں اور یہ برطانوی راج کا فرض ہے کہ وہ ہندوستان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرے۔گویا انیسویں صدی کے لسانی ماہرین نے یورپین اور ہندوستانی زبانوں کے تقابلی جائزے سے یہ بات کرنے کی کوشش کی کہ یورپ اور ہندوستانی ایک ہی تہذیبی اکائی کی دو کڑیاں ہیں اور تاریخی حالات کے جبر کے تحت یورپ 18 ویں اور 19 ویں صدی میں ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا گیا اور ہندوتہذیب دور جہالت اور تاریکی کا شکار ہوگئی۔یورپ کی تہذیبی برتری نہ صرف ہندوستان کی یورپی اقوام کی سیاسی غلامی سے ظاہر ہوتی ہے۔ہندوستانی سماج انحطاط اس کا ذمہ دار ہے۔

اگست 1947 میں جنوبی ایشیاء میں دو نئی قومی ریاستیں وجود میں آئیں اور ان کا مطمع نظر اس مغربی جدیدیت کے منصوبہ کی تکمیل تھا جس کی بنیادیں 18 ویں اور 19 ویں صدی کے نوآبادیاتی نظام نے رکھی تھیں۔

بقول اشش نندی .

''یہ منصوبہ اس خطے کو جدید بنانے پر مبنی تھا اور اس کے تین واضح مقاصد تھے۔ہم یہاں اس طرح سے قومی ریاستیں بنانا چاہتے تھے جیسا کہ تب جنوبی ایشیاء پر حکومت کرنے والوں نے یورپ میں قائم کیں تھیں،ہم ترقی چاہتے تھے،اگرچہ یہ اصطلاح تب اتنی مقبول عام نہیں ہوئی تھی اور

ہمیں اپنے 'توہم پرست' اور 'تبدیلی سے خائف' عوام میں سائینٹیفک اور ٹیکنالوجیکل عقلیت کے اصولوں کو فروغ دینا تھا۔ یہ تینوں ذمہ داریاں نوآبادیاتی تسلط سے نو آزاد ریاستوں کو سونپی گئیں۔ لہذا جنوبی ایشیاء کی نئی ریاستوں کو نہ صرف قومی تحفظ کو یقینی بنانا تھا، جو کہ یہ ریاستیں عرصہ دراز سے کر بھی رہی تھیں بلکہ لاکھوں عوام کی امیدوں اور خواہشوں کی تکمیل بھی کرنا تھی۔''

پاکستان کی قومی ریاست ہندوستانی نوآبدیاتی ریاست کی وارث اور امین ہے نوآبادیاتی دور میں ہندوستانی سماج جس social enginery کا نشانہ بنا اس کے نتیجے میں ایسی قومیتیں، گروہ اور طبقات تشکیل دیے گئے جن کو روایتی سماج کے نام پر نوآبادیاتی منصوبہ بندی میں استعمال کیا۔ روایتی سماج کی تشکیل نوآبادیاتی ریاست کے نظام کی تعمیر کا اہم جزو تھی۔

نوآباد قومی ریاستوں نے نوآبادیاتی سماجیات کو 'روایتی سماج' کے نام سے روایتی کلچر یا رہتل کے طور پر سمجھا اور پھر قومی ترقی کے نام سے اسے بدلنے کی کوشش کی۔

## قومی شناخت

قیام پاکستان کے بعد پاکستانی ریاست نے ''پاکستانی قوم'' کے تصور کو ایک سماجی اکائی کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔

قومیت کی بنیاد ریاستی نظریہ سازی پر رکھی گئی اور متنوع اقوام کے منفرد سیاسی و سماجی تجربات کو بھلا کر پاکستانی قومیت کے ایک مجرد تصور کو قوم سازی کے نام پر پاکستانی سماج پر مسلط کر دیا۔ چونکہ پاکستان کی قومی زبان اردو قرار پائی چنانچہ دوسری علاقائی زبانوں کی پرورش کو قومی تشخص کے لیے ایک خطرہ تصور کیا گیا۔ یہ خیال کہ کسی قوم یا کمیونٹی کی صرف ایک زبان ہوتی ہے ایک انتظامی اور نوآبادیاتی ضرورت تو ہو سکتی ہے لیکن تاریخی حقیقت نہیں۔ اس ضمن میں، زبانوں کے درمیان تفریق بولنے والوں کی عددی اکثریت یا سیاسی غلبے کی علامت تو ہو سکتی ہے لیکن لسانی تجربے کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔

قومی ریاست کی تشکیلِ چونکہ ایک مغربی ماڈل اور منصوبے کے پیشِ نظر تھی لہذا قومیت کی سماجی تاریخ اور فلسفہ کو از سرِ نو چھان پھٹک کر سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پاکستانی ریاست اور اس

کے مفکرین نے برطانوی مستشرقین کے قوم، مذہب، زبان اور ریاست کے نظریات پر مبنی پاکستان ''قومی تشخص'' کے نام پر جو سماجی تخریب کاری کی ہماری سیاسی تاریخ اس کی کھلی مثال ہے۔
پاکستان کی قومی شناخت کا تصور، جو 1947ء تک اپنے اندر مختلف مذاہب اوران کے ثقافتی ورثوں کو اپنی قومی تاریخ میں سموئے ہوئے تھا رفتہ رفتہ سکڑنا شروع ہوا اور سکڑتے سکڑتے آج محض ایک مذہب، سماج اور زمین کے ٹکڑے کی تاریخ کا وارث بن کر رہ گیا ہے۔

قومی شناخت کی توڑ پھوڑ کی کہانی ہمارے سیاسی شعور کا حصہ بن چکی ہے۔ اور اس کی تفصیلات مجلہ تاریخ کی درجنوں جلدوں میں بکھری پڑی ہیں۔

## بقول اشش نندی:

''میں تو اب آہستہ آہستہ یہ شک کرنے لگا ہوں کہ جنوبی ایشیاء میں ہر شخص کی ایک سے زیادہ شناختیں ہیں۔ دنیا میں شاید یا سا کوئی اور خطہ نہیں ہے جہاں اس قدر انواع کے لوگ آباد ہیں۔ یعنی جس میں کہ 2000 زبانیں 20,000 ذاتیں اور پھر ان کی آگے مزید تقسیم 250 سے زیادہ قبائل اور بے بہا علاقائی اور دیگر کلچرل اختلافات شامل ہیں۔ بعض اوقات ایسے بہت سے تضادات ایک شخص میں بھی پائے جاتے ہیں۔
جنوبی ایشیاء کے لوگ ان تضادات کے ساتھ رہنا جانتے ہیں۔ اگر چہ ان چند سالوں میں نئے نظریاتی دھوکوں نے انہیں اپنی روایتی کمیونٹی اور کلچر پر مبنی خاصیتوں سے دور کر دیا ہے۔ باہر سے درآمد کردہ قومی ریاست کے نظریے نے اس خود ساختہ اندھے پن کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے کیونکہ قومی ریاست تنوع سے ڈرتی ہے۔''

پاکستان کی قومی ریاست نے اگست 1947ء میں آزاد سفر شروع کیا تو ترقی کے اس ماڈل کا سہارا لیا گیا جس کے تحت 18ویں صدی میں یہ سفر برطانوی راج کی شاگردی میں شروع ہوا جنگ عظیم دوم کے بعد امریکہ نہ صرف یورپ پر حاوی ہو گیا بلکہ ساری دنیا کی معیشت اور سیاست سے کھیلنے لگا۔

یورپ کی تعمیرِ نو کے لیے مارشل پلان کی کامیابی کے بعد امریکہ کی امداد برائے ترقی کا رخ پاکستان اور تیسری دنیا کی نئی قومی ریاستوں کی طرف مڑ گیا۔ پاکستان کی ابتدائی فوجی قیادت کے

امریکہ کی طرف جھکاؤ نے، سرد جنگ کے دور میں امریکی حکومت کی فیاضی کے دروازے یو۔ایس ایڈ US aid کے نام پر کھول دیے جس کے نتیجے میں پاکستان کے ریاسی ڈھانچے، انتظامیہ، عدلیہ، تعلیم، طب الغرض ہر شعبہ ہائے زندگی میں افرادی اور مالی امداد فراہم کی گئی۔ زراعت کو مشینی بنانے اور انڈسٹری کو بڑھانے سے لے کر پاکستان کی فوج کو جدید اسلحہ اور جاسوسی سے مسلح ترقی کے ان منصوبوں میں شامل تھا۔

اس ترقی کے ماڈل کے مضمرات یہ ہیں کہ ترقی صرف پیش بندی اور منصوبہ بندی سے ہو سکتی ہے موجودہ تنظیمی، انتظامی اور سماجی ڈھانچے کھوکھلے ہو چکے ہیں اور خاص طور پر کہ روایتی ادارے اور کام کرنے کے طریقے۔ مزید برآں یہ کہ ترقی کا محرک افراد نہیں بلکہ قومی ادارے اور منصوبہ جاتی experts ہیں۔ قومی ترقی فرد کی آزادی رائے اور سوچ سے نہیں ریاست کے فرمان سے جنم لیتی ہے۔ اس ترقی کے ماڈل کے علم بردار فوج کے ادارے کو دوسرے اداروں کے لیے ایک مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یہ گمان کیا جاتا ہے فوجی نظم وضبط قومی ترقی کی علامت ہے جدیدیت کے کئی محققین فوج اور سول انتظامیہ کے اداروں کو دوسرے سماجی اداروں کے لیے رہبر اور ماڈل تصور کرتے ہیں۔ فوج کا پاکستانی سیاست پر غلبہ ہماری یورپی ترقی پسند فکر کی ایک لڑی ہے۔

# نوآبادیاتی نمائشوں میں پنجاب کا تصور

حسین احمد خان

انیسویں صدی کے نصف آخر میں برطانوی سامراج کے زیر سرپرستی نمائشوں کا ایک عظیم سلسلہ شروع ہوا جو ایک لمبے عرصہ تک یورپی اور غیر یورپی اقوام کی دلچسپی کا مرکز بنا رہا۔ یہ نمائشیں ریاست کے تمام تر وسائل کو بروئے کار لا کر منعقد کی جاتی تھیں۔ ان میں زیادہ تر صنعتی مصنوعات، دستکاری کے نمونے، گھروں کے ماڈل اور بعض اوقات برطانوی نوآبادیات کے پورے کے پورے گاؤں، تہذیب یافتہ مغربی شہریوں کی تفریح کے لئے رکھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ نمائش کا کچھ حصہ مشرقی جڑی بوٹیوں کے باغات، عیسائی مبلغین کے عجائب گھروں، سرکس اور چڑیا گھر پر مشتمل ہوتا۔ نمائشوں کے ان حصوں کا مقصد انسانی تہذیب کی ارتقائی منازل کا مشاہدہ کرنا تھا۔ چونکہ اس وقت ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے دھوم مچا رکھی تھی جس کے مطابق موجودہ انسان بندر اور بن مانس کی جدید ترین شکل تھا۔ لہذا ان نمائشوں کو یورپی اقوام کیلئے نہ صرف تفریح کا ذریعہ بنایا گیا بلکہ انہیں ایک سائنسی تجربہ گاہ کی صورت بھی پیش کیا گیا جہاں بندروں اور بن مانسوں کے ساتھ پنجروں میں افریقی باشندوں کو بھی رکھا گیا۔ اس کا بنیادی مقصد دیکھنے والوں میں انسان کی ابتدائی صورت اور ارتقائی عمل کے بارے میں سوجھ بوجھ پیدا کرنا تھا۔ تاہم ان نمائشوں کے ذریعے مہیا کی جانے والی تفریح اور پیش کردہ سائنسی نظریات سے قطع نظر یہ دراصل اس سوچ کی عکاس تھیں جس کی بنیاد پر حاکم اور محکوم کے درمیان مغربی اور مشرقی، یورپی اور غیر یورپی، تہذیب یافتہ اور غیر تہذیب یافتہ، سائنسی اور غیر سائنسی جیسی تفریقات کو رائج کیا گیا۔

زیرِ نظر مقالہ میں اس پہلو کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ سامراجی دور میں منعقد

کی گئی ان نمائشوں کا مقصد جہاں تجارت کو فروغ دینا اور ہندوستانی خام مال کیلئے یورپی منڈیوں کی تلاش تھی وہاں سامراجی طاقت کو حکومت کرنے کا جواز فراہم کرنا بھی تھا۔اور یہ جواز حاکم کے تہذیب یافتہ ہونے اور محکوم کے وحشی یا نیم وحشی ہونے میں تلاش کیا گیا۔

سامراجی نمائشوں کا ایسے تجزیے سے ان Art Historians کے کاموں پر تنقید مقصود نہیں جنہیں ان نمائشوں میں پیش کی جانے والی اشیاء اور پینٹنگز میں قومیت یا نیشنلزم کی جھلک نظر آئی۔ بلکہ ہمارا مقصد محض اس پہلو کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ زیر تسلط لوگوں اور ان سے متعلقہ اشیاء کو کس انداز سے پیش کیا گیا اور کس نقطہ ءنظر کے تحت ان کی تشریح کی گئی۔اس مقالہ کا محور و مرکز 1900-1848 کے درمیان پنجاب پر ہونے والی نمائشیں ہیں۔

28 مارچ 1846ء کو پنجاب کی برطانوی ہندوستان میں شمولیت سے تقریباً تین سال قبل ایک برطانوی اخبار Illustrated London News کے مدیر حضرات نے اس خیال کا اظہار کیا کہ پنجاب کو برطانوی ہندوستان میں شامل کرلیا جانا چاہیے کیونکہ وہاں کے کمزور سیاسی ادارے دیرپا اور مضبوط حکومت بنانے کے قابل نہیں رہے۔

انیسویں صدی میں پنجاب میں سیاسی ادارے اگرچہ یورپی معیار کے مطابق کمزور ہو چکے تھے تاہم یہ خطہ قدرتی وسائل سے مالا مال تھا۔1848 تک پنجاب پر قبضہ کے فوراً بعد ہی حکومتِ برطانیہ نے ایسے اقدامات شروع کر دیئے جن سے ان قدرتی وسائل تک برطانوی صنعت کی رسائی ہو سکے۔تاہم 1851ء میں لندن میں ہونے والی کرسٹل پیلس ایگزیبیشن Crystal Palace Exhibition جسے نمائشِ عظیم Great Exhibition بھی کہتے ہیں نمائشوں کے سلسلے کی وہ اہم کڑی ہے جس نے نہ صرف حکومتِ برطانیہ کی تجارتی اور آرٹ ایجوکیشن کی پالیسی کی سمت متعین کی بلکہ سامراج کے سیاسی منشور کو بھی وضاحت سے پیش کیا۔

ایک سو چالیس دن تک جاری رہنے والی اس نمائش کو دیکھنے کیلئے دنیا بھر سے تقریباً 6 ملین افراد آئے۔19 ایکڑ پر محیط رقبے 14000 مختلف اشیاء نمائش کیلئے رکھی گئیں جنہیں تقریباً آٹھ میل سے زیادہ لمبی میزوں پر سجایا گیا۔نمائش کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ایک حصے میں برطانوی اشیاء کی نمائش کی گئی جبکہ دوسرا حصہ ہندوستانی اور دیگر برطانوی نوآبادیات سے لائے گئے عجائبات پر مشتمل تھا۔نمائش میں رکھی گئی چیزوں کو خام مال، مشینری، صنعتی مصنوعات اور فائن

آرٹس میں تقسیم کیا گیا۔ یہ نمائش جہاں برطانیہ کی ترقی اور علمی حاکمیت پر دلالت کرتی تھی وہاں سا مراج کے زیر اثر دوسری اقوام کے غیر ترقی یافتہ ہونے اور انکے علاقوں میں یورپی صنعتوں کیلئے خام مال کی بہتات کا ثبوت بھی تھی۔ نمائش دیکھنے والوں کو بلا تامل ہاتھ سے چلنے والی روایتی مشینوں پر جدید ٹیکنالوجی کی برتری کا یقین آجاتا۔ اور وہ ہندوستانی اور برطانوی مشینوں اور فائن آرٹس کی چیزوں کو دیکھ کر صنعت وحرفت اور ثقافت کی ارتقائی منازل کا مشاہدہ کرتے۔ اس نمائش کو منعقد کرنے والی انتظامیہ کے ترجمان کے مطابق اس کا بنیادی مقصد وحشی اور بت پرستی کے نشے میں ڈوبی ہوئی آدھی سے زیادہ دنیا میں عیسائیت کی تبلیغ اور تہذیب یافتہ ہونے کے شعور کو بیدار کرنا تھا۔

اس کے بعد ہونے والی نمائشوں میں پیرس میں 1878ء کا ورلڈ فیئر ہے جسے 16 ملین لوگو ں نے دیکھا، پھر پیرس فیئر ہوا جسے تقریباً 50 ملین افراد دیکھنے کے لیے آئے۔ ان نمائشوں کی ایک اہم کڑی 1864ء میں پنجاب میں ہونے والی نمائش بھی ہے جو ایک برطانوی سول سرونٹ ہنری بیڈن پاؤل کی کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ اس کا مقصد پنجاب کے خام مال، صنعت وحرفت اور آر ٹ کے بارے میں آگاہی پیدا کرنا تھا۔ اس نمائش میں پنجاب بھر سے اکٹھی کی گئی چیزیں رکھی گئیں۔ قبل اس کے کہ ہم اس نمائش کا تجزیہ کریں، ان سامراجی نمائشوں سے متعلق دو اہم شخصیات ہنری بیڈن پاؤل اور جان لاک ووڈ کپلنگ (جو میو سکول آف آرٹ، لاہور کے پرنسپل بھی رہے) کے کردار پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔

بیڈن ہنری پاؤل 1841ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر بیڈن پاؤل کے گھر پیدا ہو ئے۔ سینٹ پال سکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے 1861ء میں انڈین سول سروس میں شمولیت اختیار کی۔ 1882ء میں بیڈن ہنری پاؤل کو لاہور کا Officiating Commisioner بنادیا گیا اور بعد میں انہوں نے بطور ایڈیشنل کمشنر لاہور اور راولپنڈی ڈویژن میں بھی کام کیا۔ اس کے علاوہ کچھ برس انہوں نے معمولی جرائم کی عدالت کے جج کے طور پر بھی کام کیا۔

بیڈن ہنری پاؤل ہندوستانی آرٹ اور کرافٹ میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس ضمن میں Handbook of Ecnomic Products of Punjab, (Lahore, 1868)

Handbook of the Manufactures and Arts of the Punjab اور (Lahore, 1872)ان کی اہم تصانیف ہیں ۔ اس کے علا وہ ایک اور کتا ب Land System of British India بھی قابل ذکر ہے۔ بیڈن پاؤل نے لاہور یونیورسٹی کے قیام اور میوسکول آف آرٹ کے معاملات کو چلانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ بیڈن پاؤل کی وفات 2 جنوری 1901ء کو ہوئی۔

سامراجی نمائشوں میں دوسرا اہم نام جے ایل کپلنگ کا ہے جو اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ میوسکول آف آرٹ کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے اور سکول کے نصاب کو مرتب کرنے میں پیش پیش رہے۔ جے ایل کپلنگ کی ہی تجویز پر حکومت پنجاب نے صوبے میں آرٹ اور کرافٹ کے فروغ کیلئے تسلسل سے نمائشیں منعقد کروانے کا فیصلہ کیا۔

جے ایل کپلنگ 1837ء میں پیدا ہوئے اور Woodhouse Grove لندن سے تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ South Kensington میں پڑھانے کے بعد انہوں نے 1865ء میں بمبئی سکول آف آرٹس میں Decorative Sculpture Master کے طور پر کام کیا۔

کپلنگ کا ہندوستانی تہذیب وتمدن کے بارے میں رویہ انتہائی تحقیر آمیز تھا۔ جس کا واضح ثبوت انکی اپنے بیٹے Kudyard Kipling کی ہندوستانی کہانیوں کی کتاب کیلئے بنائی گئی تصاویر ہیں۔ ان کہانیوں اور تصاویر میں ہندوستان کو ایک وحشی ، درندہ صفت اور انتہائی غیر تہذیب یافتہ خطے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ہندوستان میں تعینات برطانوی افسران کے مقابلے میں کپلنگ ہندوستانی ثقافت، مذاہب اور روایات کے متعلق خاصی معلومات رکھتے تھے۔ اگرچہ ان معلومات کے صحیح یا غلط ہونے پر سوالیہ نشان لگایا جاسکتا ہے۔ میوسکول کا پرنسپل بننے کے بعد کپلنگ کی حتی الامکان کوشش یہ رہی کہ ہندوستانی آرٹ اور کرافٹ کو یورپی معیار کے قریب ترین کیسے لایا جاسکتا ہے۔

کپلنگ کی ایک اہم تصنیف ''ہندوستان میں انسان اور درندے'' Man and Beast in India ہے جو 1891ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ انہوں نے 1893ء میں ہندوستان کے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ کپلنگ کا انتقال جنوری 1911ء میں ہوا۔

1864ء کی کامیاب نمائش کے بعد برطانوی انتظامیہ کو اس بات کا احساس ہونے لگا کہ

مقامی صنعت میں جدید مشینری کے استعمال سے نہ صرف دستکاروں اور کاریگروں کو نقصان پہنچے گا بلکہ مقامی آبادی کی مادی بنیاد اور جمالیاتی ذوق میں بھی تبدیلی کا امکان ہے۔ اس لیے اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا کہ کوئی بھی ایسی صنعت نہ لگائی جائے جس سے کاریگروں اور دستکاروں کے روزگار کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس سوچ کا اظہار ہمیں برطانوی مستشرق جارج برڈ ووڈ کی 1880ء میں چھپنے والی کتاب ''ہندوستان کے آرٹس'' The Arts of India میں ملتا تھا۔

جارج برڈ ووڈ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ہم پر بہت بھاری ذمہ داری یہ عائد ہوتی ہے کہ ہم خود سے ایسے اقدامات کریں جن سے ان لوگوں کے آرٹ کو بہتر کرنے میں مدد ملے اور ہماری ان کوششوں کا نتیجہ انتہائی حوصلہ افزاء رہا ہے۔ لہٰذا یہ ہماری بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ ہم مقامی لوگوں کی آرٹ کی تعلیم میں مداخلت کریں۔ جن کی روایات مکمل اور مضبوط اصولوں پر مبنی ہیں اور جنہوں نے یہ علم صدیوں کی سچی لگن اور تجربے سے سیکھا ہے''۔

یہ سوچ اس بات کی عکاس تھی کہ مقامی لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ اپنی صنعت و حرفت اور تعلیمی معیار کی راہ متعین کر سکیں بلکہ یہ برطانوی راج کی اولین ذمہ داری ہے کہ ان کی مدد کرے اور انہیں سیدھی راہ دکھائے۔

میو سکول آف آرٹ میں جسے 1958ء میں نیشنل کالج آف آرٹس کا درجہ دیا گیا، کپلنگ کی سربراہی میں اپنائی گئی تعلیمی پالیسی میں بھی اسی بھاری ذمہ داری کا احساس پایا جاتا ہے جس کا ذکر برڈ ووڈ نے بارہا اپنی کتابوں میں کیا۔* اس تفصیل میں جائے بغیر کہ کس طرح سے کپلنگ نے کرافٹ کو صنعت سے الگ رکھ کر اسے قدیم حالت میں محفوظ کرنے کی کوشش کی اور اس کا موازنہ جدید یورپی آرٹ سے کیا، ہم کپلنگ کی پنجاب سے متعلق کلکتہ بین الاقوامی نمائش کی رپورٹ کا تذکرہ کریں گے۔

دسمبر 1883ء سے مارچ 1884ء تک جاری رہنے والی اس نمائش کو تقریباً ایک ملین لوگوں نے دیکھا۔ ہندوستان میں اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر نمائش منعقد نہیں کی گئی تھی۔ بعض ناقدین نے اسے جنوبی ایشیاء کی نمائشِ عظیم Great Exhibition کا خطاب دیا۔ ایک برطانوی اہلکار کے مطابق نمائش کا مقصد ہندوستانی ہینڈی کرافٹس کا تحفظ، مقامی خام مال کے

بارے میں آگاہی اور تجارت کا فروغ تھا۔نمائش میں علاقائی بنیادوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سٹال لگائے گئے جنہیں کورٹ کا نام دیا گیا تھا۔ان میں پنجاب، کلکتہ، مدراس، آسام اور جے پور کورٹ قابل ذکر ہیں۔

پنجاب کورٹ کا بنیادی مقصد صوبے کے صنعتی آرٹ کی تجارت میں اضافہ کرنا اور عام لوگوں میں پنجابی صنعت اور آرٹ کے بارے میں آگاہی پیدا کرنا تھا۔پنجاب اور بنگال کی صوبائی حکومتوں نے سات سات ہزار روپے دے کر کچھ دستکاری کے نمونے خریدے۔ان خریدی گئی اشیاء میں سے اکثر، نمائش کے بعد لندن، لاہور اور کلکتہ کے عجائب گھروں کی زینت بنیں۔ پنجاب کورٹ کے مکمل انتظام کی ذمہ داری جے ایل کپلنگ کے سپرد تھی جنہوں نے یہ فرائض میو سکول آف آرٹ کے چند اساتذہ اور طلباء کی معاونت سے انجام دیئے۔نمائش کے بعد کپلنگ نے پنجاب کورٹ کے متعلق ایک رپورٹ مرتب کی۔

رپورٹ کے مطابق دور دراز علاقوں سے جو اشیاء نمائش کے لئے لائی گئیں ان میں سے اکثر ان برطانوی اہلکاروں کے لئے بالکل نئی تھیں جو ہندوستانی تہذیب وتمدن کا وسیع علم رکھتے تھے اور شاید یہ چیزیں کلکتہ کے شہریوں کے لئے بھی نئی ہی تھیں۔نمائش میں کلکتہ پریزیڈنسی کے بعد پنجاب کورٹ کو سب سے زیادہ جگہ دی گئی اور پنجاب بھر سے 5000 کے قریب جمع کئے گئے آرٹ اور کرافٹ کے مختلف نمونے رکھے گئے۔

پنجاب کورٹ کے شروع ہی میں صوبے کا ایک بہت بڑا معلوماتی نقشہ لگایا گیا جس میں صوبے کی ضلع وار تقسیم، سڑکوں، دریاؤں اور ریلوے کے نظام کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی گئی تھیں۔اس کے ساتھ ساتھ تمام بڑے شہروں کی صنعت اور اہم پیداواری وسائل کے بارے میں بھی بتایا گیا تھا۔امریکی ماہر سماجیات برنارڈ کوہن کے مطابق ان نقشہ جات کا مقصد لوگوں کو صوبے کے متعلق معلومات مہیا کرنے سے بھی زیادہ برطانوی راج کے ثمرات سے آگاہ کرنا تھا۔اس میں ریلوے کا نظام اور تعلیمی اداروں کو، جو مکمل طور پر حکومت برطانیہ کے کارنامے سمجھے جاتے تھے، زیادہ واضح انداز میں ظاہر کیا گیا تھا۔

نمائش میں رکھی گئی دیگر اشیاء کو بھی اس طرح سے دکھایا اور سمجھایا گیا جیسے کہ یہ پنجابی صنعت کاروں اور دستکاروں کی محنت کا ثمر نہیں بلکہ یورپ کی قدیم تہذیب اور پنجاب کے غیر ترقی یافتہ

ہونے کی علامات ہیں۔اس سلسلے میں جے ایل کپلنگ کی رائے ملاحظہ کریں۔

''پنجاب کے موسیقی کے سارے کے سارے آلات پرانے ،ایک ہی طرز کے،اور روایتی قسم کے ہیں۔سوائے کچھ کے جو سرحدی علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ان سازوں میں سے محض چندایک کو ہی نمائش میں رکھا جاسکا ہے۔ان میں سب سے مشہور ساز ستار ہے۔جس میں سٹیل یا تانبے کی پانچ یا چھ تاریں ہوتی ہیں۔ان تاروں کی تعداد ہمارے ہاں کے گٹاروں کی طرح حتمی نہیں ہوتی''۔

کپلنگ کی یہ رائے اس بات کا اظہار بھی ہے کہ ستار کو بنانے میں قواعد وضوابط کی کوئی پابندی نہیں ۔اسی رپورٹ میں وہ لکھتے ہیں:

''وہ موسیقی کے آلات جن میں ہوا کی مدد سے ساز بجایا جاتا ہے پنجاب میں ناپید ہیں۔اس زمرے میں صرف بانسری ہی آسکتی ہے۔اسکی قسم کے کچھ ساز کنگرہ کے علاقے میں پائے جاتے ہیں جن سے صرف ایک یا دوقسم کی آوازیں نکالی جاسکتی ہیں۔انہیں کسی بھی صورت ساز نہیں کہا جاسکتا۔۔۔۔۔ساز صرف ہندوؤں کے ایک آلہ کو ہی کہا جاسکتا ہے جس سے سات مختلف قسم کی آوازیں نکالی جاسکتی ہیں۔یہ تقریباً یورپی ساز سے ملتا جلتا ہے''۔

دہلی سکول سے ہاتھی دانت کی منی ایچر پینٹنگز کی تصاویر بھی لائی گئیں۔کپلنگ کے مطابق یہ مغلیہ دور کی روایت تھی جو اس وقت تک بہت کمزور ہو چکی ہے۔ان پینٹنگز کی تصاویر کھینچ کر یہ کوشش کی گئی ہے کہ انہیں ان کی پرانی حالت ہی میں پیش کیا جائے۔کپلنگ ان پینٹنگز کا موازنہ جدید یورپی آلات کے ساتھ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ پینٹنگز اپنی یکسانیت اور اظہار رائے کی کمی کی وجہ سے غیر متاثر کن ہیں۔

اگر چہ ان پینٹنگز کو بنانے والے بہت سے آرٹسٹوں کو طلائی تمغے دیئے گئے تاہم بہت کم پینٹنگز فروخت ہوئیں۔ہندو دیو مالائی کہانیوں کی تصاویر میں لوگوں نے خاص دلچسپی ظاہر کی اور بعد میں ان تصاویر کو حکومت بنگال نے خرید لیا۔

میو سکول آف آرٹس کے طلباء نے لاہور اور اس کے گردونواح کی مساجد اور مزارات کے ماڈل بنائے۔اس کے ساتھ ساتھ سامراجی دور میں بنائی گئی عمارات کے ماڈل بھی رکھے گئے تھے تاکہ ہندوستان میں برطانوی راج کے بل بوتے پر ہونے والی فن تعمیر کی ترقی کی وضاحت ہو

سکے۔کھانے پینے کے برتن اور مرتبان بھی نمائش میں رکھے گئے تھے۔1871ء سے پہلے تک دہلی میں بنے مرتبان کے بارے میں برطانیہ کے لوگ اور ماہرین ناواقف تھے۔1871ء میں پہلی مرتبہ یہ مرتبان لندن کی ایک نمائش میں رکھے گئے۔

پنجاب کورٹ کا ایک حصہ امرتسر سے لائے گئے مجسموں پر مشتمل تھا۔ کپلنگ کے مطابق یہ قدیم مجسمے انتہائی بھدے انداز سے ڈیزائن کئے گئے تھے۔اس کے باوجود کہ ہندو مسلمانوں کے تسلط سے آزاد ہو چکے ہیں،اس کے بہت کم امکانات ہیں کہ انکا ڈیزائن کبھی بہتر ہوگا۔ایک بڑی تعداد میں پنجاب کے قالینوں کو بھی نمائش میں جگہ دی گئی۔1862ء کی نمائش سے پہلے تک یورپی اقوام،سوائے لاہور جیل میں بنائے گئے قالینوں کے جولندن کی ایک فرم کے ذریعے باہر فروخت کئے جاتے تھے،پنجاب کی قالین بافی سے ناواقف تھیں۔پنجابی قالینوں کی منڈی زیادہ تر صوبے کے اندر ہی تھی۔

پنجاب کورٹ میں پشاور میں بنی گئی کچھ چادریں بھی رکھی گئیں جن کے بارے میں کپلنگ کا خیال تھا کہ یہ انتہائی نیم وحشی انداز میں ڈیزائن کی گئی ہیں اور رنگوں کا استعمال بھی بڑے بے ہنگم انداز میں کیا گیا ہے۔کلکتہ کی کامیاب نمائش کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستانی آرٹ اور کرافٹ کے فروغ اور یورپی اقوام کو اس سے آگاہ کرنے کے لئے سہ ماہی بنیادوں پر جرنل آف انڈین آرٹ اینڈ انڈسٹری شروع کیا جائے۔1884ء سے 1916ء تک لندن سے نکلنے والے اس جرنل کی تقریباً دو ہزار کاپیاں نکالی جاتی تھیں۔جن میں سے ایک ہزار برطانیہ میں اور باقی ہندوستان میں تقسیم کی جاتی تھیں۔کپلنگ اور ان کے ساتھ کام کرنے والے دوسرے افراد نے جرنل آف انڈین آرٹ اینڈ انڈسٹری کے لئے بہت کام کیا۔اس کے تمام شماروں میں پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی تہذیب و معاشرت کو یورپی و غیر یورپی،تہذیب یافتہ اور غیر تہذیب یافتہ، بہتر اور گھٹیا کی واضح تقسیم میں ڈھالا گیا۔اس سلسلے میں چند مثالیں دیکھیں:۔

1- پشاوری چادر کی تصویر کے نیچے تحریر ہے:

A fine example of semi-barbaric design.

2- قصور اور بھیرہ کی دریوں کے متعلق کچھ یوں لکھا ہے:

Examples of native's bad taste

پنجاب کے حوالے سے اگر ہم سامراجی دور کی نمائشوں کا تجزیہ کریں تو ان کا بنیادی مقصد مقامی تہذیب وتمدن کو یورپ کی قدیم معاشرت ثابت کرنا تھا اور مقامی لوگوں میں اس تہذیب کی افادیت اجاگر کر کے مزید ترقی کے دروازوں کو بند کرنا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں کے خام مال تک یورپی صنعت کاروں کی آسان رسائی بھی ایک اہم مقصد تھا۔ تاہم ان میں سب سے خطرناک مقصد، جس کا شکار ہم آج بھی ہیں وہ یورپی ترقی، تہذیب وتمدن اور تعلیم کو مقامی ترقی، تہذیب و تمدن اور تعلیم کے مقابلے میں بہتر ثابت کرنا تھا۔

ان نمائشوں میں مختلف اقوام کو ایک ہی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی گئی اس بات کو سمجھے بغیر کہ ان کی تہذیب و معاشرت کی کیا ضروریات ہیں۔ اور پنجاب میں ایک ایسے نظام کو تشکیل دینے کی کوشش کی گئی جس میں برطانوی سامراج کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اگر ہم انگریزی دور میں ہونے والی پیش رفت پر سوالیہ نشان لگا کر نئے سرے سے سوچنا شروع کریں تو شاید اپنے آپ کو بہتر انداز سے پہچان سکیں اور اپنے بہت سے مسائل سے چھٹکارا پا سکیں۔

# References

Birdwood, George, *The Arts of India*, Calcutta, 1988. (First published in 1880)

Cohn, Bernard, *Colonialism and its Forms of Knowledge, The British in India*, Dehli, 1997.

Corbey, Raymond, "Ethnographic Showcases" in *Imaginaries of Domination.*

Dutta, Arindam, *Designing the Present, the Cole Circle and the Architecture of (An) Imperial Bureaucracy, 1851-1901*, (Unpublished PhD dissertation, Princeton University, June 2001).

Fido, Martin, *Rudyard Kipling*, London, 1974.

Ibbetson, Denzil, *Punjab Castes*, Lahore, 1986. (First published in 1883)

Kipling, John Lockwood, *Report on Punjab Court, International Calcutta Exhibition 1883-84.*

Metcalf, Thomas R (ed), *Modern India: An Interpretive Anthology*, New Dehli, 1990.

Mitter, Partha, *Art and Nationalism in Colonial India: 1850-1922, Occidental Orientations*, Cambridge, 1994.

Pinney, Thomas (ed), *Kipling's India: Uncollected Sketches 1884-88*, London, 1986.

*Reports of the Director Public Instruction Punjab* (1875-94).

Tarapor, Mahrukh, "John Lockwood Kipling and British Art Education in India", *Victorian Studies*, 24,1,1980.

Tarar, Nadeem Omar, "Historical Introduction", in Samina Choonara (ed), *"Official" Chronicle of Mayo School of Art: Formative Years under J L Kipling*, Lahore, 2003.

# نوآبادیاتی دور کی تعلیم میں انگریزی ادب کی تدریس

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

گفتگو کے آغاز ہی میں یہ واضح کر دیا جائے کہ انگریزی دور سے پہلے برصغیر ہندو پاک کے مسلمانوں میں مکتب اور مدرسوں اور ہندوؤں میں پاٹ شالاؤں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ دونوں مذاہب کی کمیونٹیز میں لڑکیوں کی تعلیم گھروں پر ہی ہوتی تھی۔ مرفع الحال لوگوں کے گھروں پر۔ اور وہ بھی پڑھنے، لکھنے اور امور خانہ داری سے متعلق حساب کتاب تک۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے برصغیر میں قدم رکھا تو اس وقت انگلستان کی تعلیم عیسائی تصورات کے تحت تھی یعنی یہ کہ انجیل کی بہتر طور پر تفہیم ہو سکے۔ عیسائی معتقدات کا دفاع۔ مروجہ یونانی فلسفہ کی مدد سے۔ خوشخطی اور عیسائی مذہب کے اکابر کی کہانیاں۔ اس کے بعد تعلیمی پروگرام میں "سات لبرل آرٹس" بھی شامل کر لئے گئے تھے۔ علم صرف ونحو (grammar)، بلاغت (Rhetoric)، جدلیت (Dialectic)، حساب (Arithmetics)، اقلیدس (Geometry)، موسیقی (Music) اور علمِ نجوم (Astronomy)۔ تعلیم کا محور مذہب اور خدا پر کامل یقین تھا۔ الوہیت، عیسائیوں کی بڑی تعداد کے لئے عقیدہء تثلیث میں مضمر تھی۔ یعنی مقدس باپ، مقدس ماں (مریم) اور مقدس بیٹے (یسوع مسیح)۔ کچھ اسکولوں کی مشترک الوہیت میں تیر اندازی، رقص، کشتی رانی اور بال گیم بھی تدریس میں شامل تھا۔ یونانی اور لاطینی کلاسیکس بطور خاص وہ جنہیں Petrach نے تحریر کیا تھا۔ مارٹن لوتھر کی بغاوت نے علاقائی زبانوں کی بہت اہمیت دیدی تھی۔ اس لئے انگریزی کی موثر تعلیم پر اصرار بڑھا۔ درست لکھنا اور پڑھنا درست لہجہ میں گفتگو کرنے پر

اس قدر زیادہ زور دیا گیا کہ اب انگریزی زبان کی نظر انداز شدہ تخلیقات بھی پڑھائی جانے لگی۔ انگریزی ادب کی تواریخ میں بیان کردہ سولہویں اور سترہویں صدی تک کی اہم تحریریں داخلِ نصاب ہوگئیں تھیں لیکن فرانسس بیکن نے تعلیم کے تصور ہی کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اس نے سائنس کی تعلیم کے لئے واضح سوچ کو مہمیز دینے والی تعلیم پر زور دیا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان جس دنیا میں رہ رہا ہے اس کے بارے میں حقائق پر دسترس کے بغیر تعلیم کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ یہ انگریزی یا برطانوی تصورِ تعلیم میں پہلی دراڑ تھی۔ اس نے زور دیا کہ سب سے پہلے انسانی ذہن کو ہر قسم کے تعصب سے پاک ہو جانا چاہئے اور اس کے بعد وہ اپنے اردگرد پر بہت معروضی اور غیر جذباتی طریقہ سے مشاہدہ کر کے اور معطیات (data) جمع کرے اور اپنے مشاہدات کی صحت کے بارے میں چھان پھٹک کرے۔ جوں جوں کوئی سماج اپنے دور کے علم کے ذخیرہ کو اپنی نسل کے حوالہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے وہ تسخیرِ کائنات کر سکتا ہے۔ اس طرح فرانسس بیکن کے خیال میں سوسائٹی کے حافظہ میں موجود علم کی ترسیل کا نام تعلیم تھا اور اس کے علاوہ جو کچھ تھا وہ اس کے لئے بیکار تھا۔

اٹھارہویں صدی کے مفکر (Hobbes) نے حکومتِ وقت یعنی (بادشاہ) کو یہ حق دیا کہ وہ اپنے شہریوں کے لئے تعلیم کی نوعیت اور غایت کا تعین کرے۔ اسی طرح مملکت مضبوط ہوگی۔ اور ریاست کا انتظام و انصرام بھی بہتر طور پر ہو سکے گا۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر آئی تو اس کے بعد رومی تعلیم کی Oratory کا تصور تھا اور مارٹن لیوتھر کے بعد انگریزی زبان کی تعلیم اور سات لبرل آرٹس کی تدریس کا وہی تصور تھا جو اس وقت کے جزائر برطانیہ میں پروان چڑھ رہا تھا۔ اس نے Francis Bacon کے بجائے مقتدرِ اعلیٰ Hobbes کے تصور کو اہمیت دی یعنی صرف Soverign ہی یہ طے کر سکتا ہے کہ کیا اور کیسے تعلیم دی جائے، دیکھا جائے تو Locke کا وہ نظریہ بھی جس کا مقصد A Sound Mind in a Sound Body ابھی بہت دور تھا۔ البتہ لاک Locke کے تصورِ تعلیم میں سفر، استادوں کے ذریعہ گھروں پر پڑھائی اور ہم عصروں کا تجربہ حصولِ علم کا بہت بڑا

ذریعہ تھا۔ بس یہی کہ مہم جوئی بذاتِ خود ایک علم ہے۔ آخر آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور اس سے پہلے شمالی وجنوبی امریکہ کی دریافت مہم جوئی کا نتیجہ ہی تو تھے۔ اور اب برصغیر ہندوستان میں یہاں کے لوگوں، مذاہب، زبانوں، نسلوں، حیوانات و جمادات کے بارے میں جو ذخیرۂ علم حاصل کیا جارہا تھا وہ مہم جوئی کے بغیر کیونکر حاصل ہوسکتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے فرانسس بیکن، ہوبس اور لاک کو پسِ پشت رکھا اور عیسائی چرچ کے ماڈل کے ساتھ سات لبرل آرٹس کی تعلیم کے لئے کوششیں کیں۔ انگریزی زبان کی تعلیم کی اہمیت اس وجہ سے اہم ہو ہی گئی تھی کہ انگلستان ایک پروٹسنٹ ملک تھا لیکن لاطینی کے بارے میں یہ خیال ہنوز راسخ تھا کہ انسان اس کے بغیر تعلیم یافتہ متصور نہیں ہوسکتا تھا۔

تعلیم کا وہ تصور جو امریکی مفکرِ تعلیم جون ڈیوی (John Dewey) کے Experimental School کے ساتھ آیا برصغیر کی نو آبادی کے لئے محض مبادیاتِ سائنس کے Initiation کے ذریعے حاصل کرنا مقصود تھا۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے زمامِ اقتدار سنبھالا تو اس کے افسرانِ بالا کے لئے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہ تھا کہ اس ملک کا نظامِ تعلیم اپنے باسیوں کو بھاری علمی یا فکری ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے تیار نہیں کر رہا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں کسی واحد متحدہ ملک کی ہیئت ترکیبی کے احساس کا بھی فقدان تھا۔ ہر علاقہ اپنی جگہ خود مختار یا نیم خود مختار تھا۔ اگر وہ کبھی کبھی مرکزی حکومت سے تعلق بھی رکھتا تھا تو وہ مرکزی حکومت سے برائے نام تعلق کے طور پر۔ جب موقع ملتا، علیحدگی کا علم بلند کر دیتا۔ اٹھارہویں صدی میں 1757 کے بعد متحدہ ہندوستان کا تصور ہی ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک عرصہ تک تعلیم کے میدان میں کچھ کرنے کی بابت سوچا بھی نہیں تھا۔ پرتگیزی، فرانسیسی اور ولندیزی مشنریوں نے گوا، پانڈیچری اور جنوبی ہندوستان 1706 میں جرمن اور ڈینش مشنریوں نے تامل زبان میں کتابیں شائع کرنے کا آغاز کیا۔ 1727 میں شلز جرمنی سے آیا اور 1793 میں ولیم کیری William Carey آیا۔

London Missionary Society اور Church Mission Society نے بھی اپنے کام کا آغاز کیا۔ خاص طور پر سری لنکا میں عیسائیت کی تعلیم کے لئے مغربی تعلیم کی بنیاد رکھی لیکن یہ بھی زبانوں کی تعلیم اور کچھ عقائد کے سلسلہ میں rational approach کے سلسلہ میں تھی۔ وارن ہیسٹنگز نے 1780 میں کلکتہ میں ''مدرسہ'' کی بنیاد رکھی اور 1791 میں جوناتھن ڈنکن، جو بنارس میں برطانوی Resident تھا، اس نے بنارس کے سنسکرت کالج کی، جس کے لئے Muir، Ballantyne اور Thibaut نے بہت محنت کی تھی، بنیاد رکھی۔

جب 1813 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید (renewal) ہو رہی تھی تو بمشکل تمام 10,000$ کی رقم تعلیم کی مد میں رکھی گئی تھی اور اس کے لئے William Wilberforce نے بڑی کوششیں کی تھیں وہ دارالعلوم House of Commons میں انڈیا کے لئے تعلیم کا بہت اہم موئد اور وکیل تھا۔ 1821 میں حکومتِ بمبئی نے پونے Pune میں ایک ہندو کالج کی بنیاد رکھی جسے بعد میں دکن کالج کا نام دیا گیا۔ جب بنگال میں لارڈ ایمہرسٹ نے کلکتہ میں 1824 میں سنسکرت کالج شروع کیا تو راجہ رام موہن رائے نے اس بنا پر مخالفت کی کہ ہندوستانیوں پر انگریزی کے بجائے سنسکرت پڑھا کر ظلم کیا جا رہا ہے۔ یہ بالکل ویسا ہی رویہ تھا جیسا کہ سرسید احمد خاں نے بعد میں پنجاب یونیورسٹی کو ورنا کیولر یونیورسٹی بنانے کے خلاف احتجاج کیا تھا جبکہ موصوف پہلے ورنا کیولر یونیورسٹی کے قیام کے حق میں تھے اور اس سلسلہ میں حکومت کو عرضداشت پیش کر چکے تھے۔

راجہ رام موہن رائے نے ایک گھڑی ساز David Hare کے ساتھ جو تحریک شروع کی تھی اسے Semi-Rationalist Movement کہا جاتا ہے اور اس تحریک کی بدولت بنگال میں متعدد انگریزی اسکولز قائم ہوئے۔ آپ ہندو اور مسلم سائیکی کا مقابلہ کریں کہ ہندوؤں میں ہندومت اور عیسائیت کی تطبیق کے ساتھ ایک فرقہ برہمو سماج کی بنیاد رکھنے والا شخص، جو انگریزی عمل داری کو اپنی قوم کے لئے عطیہء خداوندی خیال کرتا ہے، انگریزی اسکولز کھولتا پھر رہا ہے۔ لیکن وہ ہندوستانی قوم پرستوں اور سوشلسٹوں کے لئے بھی Father of Modern India

رہتا ہے اور مسلمانوں کے لئے اس نوع کی بیداری کا کام کرنے والے شخص کو کافر، مرتد، انگریز کا غلام کہنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے حالانکہ راجہ رام موہن رائے کی برطانوی راج کی حمایتی تقاریر پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید احمد خان انگریزوں پر تنقید کرنے کے معاملے میں راجہ رام موہن رائے سے کہیں زیادہ Radical تھے لیکن مسلمانوں میں تحت الثریٰ سے اوپر اٹھنے میں اس قدر تساہل تھا کہ وہ اپنے فکری جمود اور سائنسی علوم سے بیزاری کو عین مذہبی اقتضا سمجھ بیٹھے۔

1823 اور 1829 میں بنگال اور مدراس میں Committees of Public Instruction قائم ہوئیں اور اس طرح Orientalists اور Anglicists کے درمیان وہ کشمکش شروع ہوئی جو میکالے کے Minutes کی صحت میں 1835 میں Anglicists کی فتح کے طور پر منتج ہوئی۔ 1833 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے وقت کمپنی کی حکومت نے Strict Neutrality کی پالیسی اپنائی۔ لارڈ میکالے کے 1835 کے Minutes کے یہ جملے کہ ہم ہندوستانیوں کو اُن کی زبانوں میں موجود کتابوں کے ذریعہ جدید سائنس نہیں پڑھا سکتے، کیا ہم صحت کے شعبہ میں مضحکہ خیز کتابیں پڑھا سکتے ہیں؟ کیا ہم 30 فیٹ اونچے اور تیس ہزار سال حکومت کرنے والے بادشاہوں کی تاریخ پڑھائیں؟ لارڈ بینٹنک نے میکالے کے Minutes کو 1835 میں لارڈ آکلینڈ Auckland نے 1839 میں توثیق کی اور اس طرح انگریزی کتابوں کے عربی اور سنسکرت میں ترجموں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اور ورنا کیولر اسکولوں کے ساتھ English medium اسکولوں کا رواج شروع ہو گیا۔ 1835 میں پریس کی آزادی اور 1837 میں عدالتوں میں فارسی کی جگہ علاقائی زبانوں یا ہندوستانی (یعنی اردو یا آج کی ہندی) نے لے لی اور اسی طرح W.W.Hunter کے بقول مسلمان، بیک جنبشِ قلم جاہل ہو کر رہ گئے اور انہوں نے جدید تعلیم سے ایک رشتۂ عناد بنا لیا۔ ہندوؤں کی اکثریت نے، اس کے برخلاف، برطانوی اقتدار کو مسلمان غلبہ سے نجات کا ذریعہ جانا اور فورٹ ولیم کالج کے پیدا کردہ ہندی اردو تنازع میں بہت متحرک فریق بن کر اردو ہندی script کی اس جنگ کا آغاز کر دیا جس میں مولانا محمد حسین آزاد اور ہندی کا متشدد وکیل بھارتیندو جو خود اردو کا بڑا اچھا ادیب تھا، برابر کے

شریک ہو گئے۔

1854 کے سر چارلس ووڈ Sir Charles Wood کے مشہور Despatch نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تعلیم کے شعبہ میں کچھ کرنے کے عزم کا عندیہ دیا اس ڈسپیچ میں یونیورسٹی کی سطح کی تعلیم کی سفارش بھی تھی۔ اس وقت تک کمپنی کا خیال تھا کہ پڑھے لکھے لوگوں کو "پڑھانا" ہی جدید تعلیم کے عام ہونے کا سبب بن سکتا ہے۔ اُسے تقطیر کی حکمتِ عملی (Policy of Filtration) کہا جاتا ہے۔ کمپنی نے کلرکوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے تعلیم دینے پر رضامندی ظاہر کی نہ کہ تعلق پسندی کی تعلیم دینے پر۔ یہ کام یونیورسٹیز پر چھوڑ دیا گیا۔

اب ہم اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی ادب کی تعلیم کے نصاب (content) کی طرف آتے ہیں۔ یہ نصاب ہمیں مہذب اور اچھا و برخودار شہری بنانے کے لئے ضروری خیال کیا گیا تھا۔ ہندوستان کو ایک ملک بنانا اور ہندوؤں کے ہزار فرقوں کے ہزار ناموں کی جگہ ایک مذہب یعنی ہندومت کا نام دینے کی حکمتِ عملی تھی یعنی Hindutva کی پہلی سرگرم قیادت خود ایسٹ انڈیا کمپنی نے فراہم کی تھی۔ انگریزی ادب کی تعلیم کمپنی کے ملازمین کے بچوں کے لئے مدراس، بمبئی اور بنگال میں اٹھارہویں صدی کے آخر ہی سے شروع ہو گئی لیکن یہ تعلیم انگلستان میں مدرسہ ٹائپ کی طرح بعض گھروں اور اداروں میں پرائیویٹ ٹیوشنز کے طور پر تھی۔ مشنریوں کے ذریعہ لاطینی زبان کی تدریس لازمی حصہ تھا۔ انیسویں صدی تک خود انگلستان میں۔ تین اہم یونیورسٹیز آکسفورڈ، کیمبرج اور سینٹ اینڈریوز کے علاوہ گرجوں (Bishoprics) کے مدرسے یا پھر معلّمات کے گھروں پر تعلیم کا رواج تھا۔

انگلستان اور نوآبادیاتی ہندوستان میں سیکولر قسم کا مغربی علوم کا تدریس کا باقاعدہ نظام کم مدتی فرق کے ساتھ ایک ساتھ شروع ہوا۔ انگلستان میں اس کے پسِ پشت Oxford Movement تھی اور برصغیر میں اس تحریک سے متاثر برطانوی بیوروکریسی۔ مغربی تعلیم کی تحریک کے پسِ پشت ایک جذبہ مشرقی زبانوں اور ادب کی بے توقیری کا بھی تھا۔ یہ درست ہے

کہ برطانیہ نے ہماری زبانوں اور ادب کی ترقی سے شاندار خدمات انجام دی ہیں لیکن یہ سب حکومتی انتظام و انصرام کے تقاضوں کے تحت تھا۔ یہ علم برائے علم کا معاملہ نہیں تھا۔ چارلس گرانٹ، جس نے برصغیر میں تعلیم کے فروغ اور اس میں عیسائیت کی تبلیغ کے مثبت نتائج پر بہت زور دیا تھا، کا خیال تھا کہ پورے مشرق کا ادب صرف ایک الماری میں سما سکتا ہے۔ یہ ادب بقول اس کے ہندوستانیوں کو غیر حقیقت پسند اور غیر عقلی بنا رہا ہے لیکن اس کا یہ خیال بھی تھا کہ ادب کی تعلیم ہندوستانیوں کے لئے ضروری بھی ہے۔ پہلے ادب کی سرپرستی بادشاہ، نوابین اور امراء کرتے تھے، اب یہ کام برطانوی عمال کو کرنا چاہیے۔ اس لئے مغربی علوم کو انگریزی زبان میں تعلیم دینے سے ہندوستانی، بالآخر، اس حقیقت تک پہنچ جائیں گے کہ سچ یا صداقت کا اعلیٰ ترین معیار مغرب کے پاس ہے۔ مغرب کسی بھی غیر واقعی جذبہ اور واقعہ کو قبول نہیں کرسکتا۔ ایک اور بات یہ کہ اس علاقہ (برصغیر) میں جھوٹ، منافقت اور ریاکاری عام ہے اور حبّ الوطنی کا دور دور تک پتہ نہیں، ہر شخص ذرا سے مفاد پر اپنے گروہ، علاقہ اور وطن کے مفادات کے خلاف کام کرسکتا ہے اسی لئے یونانی، لاطینی اور مغربی ادب کے ایسے کلاسکس پڑھائے جائیں جن سے ہندوستانیوں میں حبّ الوطنی اور کیریکٹر پیدا ہو سکے۔ چارلس گرانٹ کی ڈائریز میں یہ جذبات موجزن ہیں۔ مندرجہ بالا مقاصد اپنی جگہ لاکھ عمدہ سہی لیکن نوآبادیاتی نظام اپنے خلاف اٹھنے والی نگاہوں کو غلط انداز اور ناروا ہی ٹھہراتا ہے اور یہ حریت پسندانہ خُو بھی جھوٹ اور ریاکاری کے ذیل میں ڈال دی جاتی ہے۔

بہر حال مغربی ادبیات کا حصہ برصغیر کی پہلی پانچ جامعات میں بمبئی، مدراس (1857)، پنجاب (1882) اور الٰہ آباد (1887) کی حد تک مغربی شاعر، ادیبوں اور نقادوں کے نظریات پر مبنی مختلف ادبی شہ پاروں کے اقتباسات یا مکمل کتابوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہر جامعہ کے نصاب میں کوئی نہ کوئی انفرادیت ضرور ہوتی تھی۔ ان جامعات میں یونانی اور لاطینی زبانوں کے مفکرین اور ادیبوں کی کتابوں کے پسِ پشت Reason, Propriety اور Temperament کی نیکیوں پر زور دیا گیا۔ علاوہ ازیں اسپنسر، سر فلپ سڈنی، شیکسپیئر، ملٹن، ڈرائیڈن، جانسن اور برطانیہ کی رومانی تحریک کے شعراء Coleridge, Wordsworth,

Shelley, Byron اور Keats کا کلام کورس میں شامل کیا گیا تھا۔ یہ تمام مصنف غیر یورپی اقوام کو سفید فام نسل کا بوجھ White Man's Burden سمجھتے تھے اور اس لئے اس منفی خیال کے باوجود ایک مثبت رُخ بھی سامنے آیا جیسا کہ مارکس (Marx) نے اپنی کتاب "Notes on Indian History" میں انگریزی اقتدار کے بعض فوائد بھی بیان کئے تھے۔

اس حقیقت میں کیا کلام ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں انگریزی زبان وادب کی تدریس کا بنیادی مقصد نوآبادیاتی نظام کی خدمت تھا۔ نئی تبدیلیوں کے لئے روایتی ڈھانچہ میں تبدیلی ضروری تھی اس لئے انگریزی ادب کی تعلیم جہاں روایت شکنی پر زور دے رہی تھی جس سے ہندوستانی دانشوروں نے اپنے اندر جھانکنا بھی سیکھا، خود تنقیدی کی روش بھی اپنائی اور اس کے ساتھ اپنی شناخت کی منزل بھی سر کی۔ درس وتدریس کے لئے مطلوب آزادی رائے کی رعایت سے سیاسی فائدے بھی اٹھائے یعنی انگریز حاکم اگر حب الوطنی ہندوستان کے اتحاد کے لئے ضروری سمجھتے تھے تاکہ برما اور سری لنکا کے لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ انہیں سندھ، بلوچستان اور سرحد کے ساتھ کیوں منسلک کر دیا گیا ہے تو وہاں ہندوستانی اساتذہ اور Intellectuals خاص طور سے بنکم چندر چٹر جی نے اپنے ناولوں کے ذریعے ہندومت اور ہندوستانی قومیت کو ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم بتانے کے لئے کوششیں کیں۔ یعنی نوآبادیاتی مقصد کے تخریبی پہلو سے تعمیری کام بھی لیا جانے لگا۔ نہ صرف یہ بلکہ بنکم چندر چٹر جی نے انگریزی کو اپنے لئے سایہ رحمت اور حفاظت کی چھتری قرار دیا۔

اس دور میں یورپ بھی ایک عجیب وغریب رجحان سے گزر رہا تھا، وہ اپنی شناخت کے احساس کے لئے ماضی کے گھروندوں میں گھر بنانے پر تلا ہوا تھا۔ یہی کچھ میکس میولر اور ولیم جونز نے ہندوستان کے لئے بھی کیا۔ لیکن اس کے زمانہ میں Plautus اور Terence کو Aristophanes پر فوقیت مل رہی تھی۔ حد یہ ہے کہ Horace کی بوطیقہ Ars Poetica کو ارسطو کی Poetics پر فوقیت حاصل ہو چکی تھی۔

انیسویں صدی میں ہندوستان کے کالجوں اور تین جامعات بمبئی، مدراس اور کلکتہ 1857 میں Horace اور Aristotle دونوں شامل ہو چکے تھے۔ یعنی معاملہ کچھ یوں تھا کہ اساتذہ کی زبان پر Seneca ٹریجیڈی (Tragedy) کے لئے Terence کامیڈی کے لئے اور Horace کی بوطیقہ کے ساتھ ساتھ Sophocles ` Aristophanes اور Aristotle ساتھ ساتھ داخلِ نصاب ہونے لگے۔ یعنی یونان کے Satellite اٹلی کی مثال سامنے رکھ کر ہندوستان کو حد سے حد ایک ثقافتی نوآبادیاتی بنانا درکار تھا Sir Thomas Moore کی Utopia بھی جامعات کے کورس میں شامل تھی تاکہ ایک اعلیٰ تر زندگی کا خواب دیکھا جا سکے۔ Utopia بھی ایک لاطینی انسان دوست مفکّر Humanist کے کام کا ترجمہ تھا اسی طرح Lily کی Euphues, Anatomy of Wit اور Euphues and his England بھی بعد میں ظہور پذیر ہونے والے fiction کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہیں رکھتے لیکن شاملِ نصاب تھے۔

Essays کے لئے Seneca اور Cicero تقلیدی نمونوں کے طور پر آئے۔ ان Essays میں اخلاقی اقدار پر زور تھا۔ Character اور Integrity پر بھی۔ فرانسس بیکن Francis Bacon نے اپنے Essays میں فرانسیسی دانشور اور نقاد Montaign کے Personal Essays کی تقلید کی۔ Epics کی حد تک بھی Virgil اور Lucan نمونہ ہائے تقلید تھے۔

تدریسی مواد پر مندرجہ بالا گفتگو کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ 1882 میں نیئر ایجوکیشن کمیشن نے ایک قدم آگے بڑھایا اور یونیورسٹی کی تعلیم کو خردافروزی کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ 1901 میں لارڈ کرزن نے ایجوکیشن طلب کی اور 1906 میں Indian Educational Policy سامنے آئی جس کے نتیجہ میں 1910 میں تعلیم کا شعبہ .Home Deptt سے علیحدہ کر کے Department of Education قائم کر دیا گیا۔

1901 کی تعلیمی کانفرنس کے بعد ہی قوم پرستی کی لہر پیدا ہوئی، قوم پرستی اور قوم پرست تعلیم کا شور شروع ہوا۔ تلک، گوپال کرشنا گوکھلے، لاجپت رائے، ٹیگور کی وشوا بھارتی تحریک پر مبنی نظریات کے ساتھ جمہوری اندازِ فکر کے حامل برطانوی دانشوروں کے افکار کی تنظیم بھی کی گئی، مسلمانوں میں گبن اور کارلائل ہر چند کہ وہ اسلام کے اچھے خاصے مخالف تھے اسلام کے دوست ٹھہرے اور ہندوؤں میں William Jones اور میکس میولر اور روشن خیالوں میں ولیم مارس کے خیالات یعنی اب مفید مطلب دانشوروں کے افکار کورسز میں شامل کئے جانے لگے۔ ہندوستانی Academics نے محدود آزادی سے جس قدر کام لینا تھا لیا۔ 1911 میں ہندوستان نے اپنا پہلا Ph.D.، جنیشور گھوش (Janieshwar Ghosh) کی صورت میں پیدا کیا اُس کے Thesis کا عنوان History of Land Tenure in England, France, Germany, Russia & the Agrarian Question تھا۔ پونے یا پونا کی Institute of Social Sciences نے انیسویں صدی کے آخر میں ریسرچ میں بڑا نام پیدا کیا۔ گوپال کرشنا گوکھلے اسی انسٹی ٹیوٹ کے فاضل تھے۔

یہ دور ایک منظم کائنات اور Empirical سوچ کا دور تھا۔ مذہب کی اتھارٹی ختم ہو رہی تھی، ڈیکارٹ، کانٹ، ہوبس اور ہیومز نے مذہبی اتھارٹی کو Challenge کیا تھا اور نطشے نے اس رجحان کو ایک ایسی انتہا پر پہنچا دیا جس سے آج فلسفہء جدید کے تمام مکاتب فکر مستفید ہو رہے ہیں۔ جدید برصغیر نوآبادیاتی دور کی تعلیم کے مثبت و منفی ارتعاشات میں سے مثبت اثرات سے خاصہ کسبِ فیاض کر چکا ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ صحیح ہے کہ انگریزی ادبیات کے اس نصاب ہی نے متحدہ برصغیر کے تمام اہم رہنماؤں کے ذہنوں پر اثرات مرتب کئے۔ تمام ہندو اور مسلمان قائدوں پر یورپی ذہنوں ہی کے اثرات تھے۔ دور کیوں جائیں خود علامہ اقبال نے تسلیم کیا ہے کہ اگر وہ Wordsworth سے متاثر نہ ہوئے ہوتے تو ملحد ہو جاتے۔ ٹیگور خاندان، بنگال کے Chatterjee، Chatopadhyas، Mukerjees، سرامیر علی، سرسید احمد خان، حالؔی، مولانا محمد علی جوہؔر سب

ہی نے مغربی ذہنوں کا اثر قبول کیا۔

1911-12 میں شہنشاہ معظم نے تعلیم کے شعبہ کے لئے امپیریل فنڈز سے 50 لاکھ روپے کی خطیر رقم مرحمت کی۔ 1919 میں سیڈلر کمیشن نے یونیورسٹی کی سطح کی تعلیم کو خاصی ترقی دی۔ 1922 تک یونیورسٹیوں کی تعداد 14 ہوگئی جبکہ 1919 تک یہ تعداد صرف 5 تھی۔ 1921 میں Literacy 14% تھی۔ 1927 میں صرف مدراس Presidency میں 59 فی صد لڑکے (6 سے 11 سال تک) تعلیم پاتے تھے، بمبئی پریذیڈینسی میں 49.2% بنگال میں 45.1% اور پنجاب میں 44.7%۔ اس تعلیمی ترقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1935 کے ایکٹ کے بعد ہونے والے انتخابات میں 50 ہزار ووٹرز کی تعداد بڑھ کر 5,000,000 ہوگئی۔ تاہم 1941 کی مردم شماری کے لحاظ سے برصغیر میں شرحِ تعلیم (خواندگی) صرف 12.2% تھی۔

اس کے بعد ہم 1944 کے سارجنٹ کمیشن تک آتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس اسکیم نے متحدہ ہندوستان کے فریم ورک میں رہ کر اور مسلمانوں کی تعلیم کے لئے علیحدہ سے بطور خاص زور نہ دے کر آل انڈیا مسلم لیگ کے قائدین کو ناراض کیا، یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تقسیم کی بات ہو رہی تھی اور دوسری طرف کم ترقی یافتہ علاقوں یا مذہبی گروہوں کے ساتھ مراعتی سلوک کا در بند کیا جا رہا تھا۔ میرے خیال میں سارجنٹ اسکیم تو یہاں تک آ گے گئی کہ ہر کسی طالب علم کو یونیورسٹی تک پہنچنے کے حق سے بھی محروم کرگئی۔ 1946 میں 19 یونیورسٹیوں میں انگریزی ادب کے شعبے قائم ہو چکے تھے اور پڑھے لکھے ہندوستانیوں میں انگریزی ادباء کے ساتھ یورپی اور امریکی ادباء بھی مقبول ہونے لگے تھے۔

1946-47 تک انگریزی ادب کا content کم وبیش وہی رہا جو بیسویں صدی کے اوائل میں تھا۔ یعنی متحدہ ہندوستان کے لئے جذبہء حبّ الوطنی، بہتر سماج کی تشکیل کا خواب، قانون کی بالادستی اور مظاہر فطرت کے لئے فکری گنجائشیں نکالنا بھی معقول اور مناسب خیال کیا جانے لگا۔ انگریزی ادب کے اس مخصوص Mission کی چھاپ اردو ادب میں بھی آئی۔ یہ اور بات ہے کہ

مختلف طبائع temperaments نے اسے مختلف طور پر قبول کیا۔

(F.E.Keay, *"A History of Education in India & Pakistan"* (Third, Edition), O.U.P., 1959, Pg. 208)

(F.E.Keay, *"A History of Education in India & Pakistan"* (Third, Edition), O.U.P., 1959, Pg. 212)

# جنوبی ایشیا میں ''قابض حکمرانی'' کے صنفی تعلقات پر اثرات

ڈاکٹر طاہرہ خان

سب سے پہلے میں اس مقالے کے موضوع پر ایک نئی اصطلاح کے استعمال پر بات کرنا چاہوں گی۔ بجائے لفظ کالونیلزم یا نوآبادیات کے میں نے ''قابض حکمرانوں'' کا لفظ شامل کیا ہے۔ کالونیلزم اور نوآبادیات کا ایک اور نعم البدل ''استعماریت'' بھی ہے لیکن میرے خیال میں ''قابض حکمران'' اصطلاح زیادہ سادہ اور ہر ایک کے لئے قابلِ فہم ہے۔ دوسرے محقق میری اصطلاح سے اختلاف کا حق رکھتے ہیں۔ اسی اصطلاح کی روشنی میں میں نے یہ مقالہ تحریر کیا ہے۔
کالونیلزم یا نوآبادیات کے حوالے سے اپنے زمانہ طالبعلمی سے اب تک میرے ذہن میں بار بار یہ بات آتی رہی ہے کہ یہ اصطلاح ایک نئی بسائی جانے والی بستی یا شہر کے حوالے سے مذکور ہے۔ وہ جگہ جہاں پہلے کچھ نہ ہو وہاں ایک نیا شہر، نیا محلہ یا نئی بستی بسائی جائے۔
میرے بچپن کے سادہ ذہن میں اس اصطلاح کے ساتھ مختلف مثالیں گھومتی رہتی تھیں جیسا کہ ماڈل کالونی، پاس کالونی، جناح کالونی وغیرہ وغیرہ......لیکن انگریزوں کی برصغیر میں آمد اور ان کا حکومت پر قبضہ اور ان کا تاجروں اور کاروباریوں کا بھیس مجھے کبھی اس بات کے لئے قائل نہ کر سکا کہ وہ یہاں نئی بستیاں بسانے آئے تھے۔ بستیاں اور شہران کے آنے سے پہلے ہی آباد تھے۔ وہ تو یہاں ان شہروں اور بستیوں کے مکینوں کا تجارت کے ذریعے استحصال کرنے آئے تھے۔ اور بعدازاں ان کو سیاسی طور پر شکست دے کر حکومتی اداروں پر قابض ہو گئے۔ اسی لئے

تھے۔کو Confuse کر دیا اور وہ چکی کے دو پاٹوں میں پسنے لگے۔قابض حکمرانوں نے رعایا کو ارادتاً یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ

☆ برصغیر کے لوگوں کے رسم و رواج اور خاص طور پر ان کے اپنی عورت کی طرف رویئے کس قدر وحشیانہ تھے۔

☆ اور عمومی طور پر مقامی لوگ کتنے غیر ترقی یافتہ اور کم نظر لوگ تھے۔

پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے قابض حکمرانوں کے ان خیالات کی طرف برصغیر کے مسلم مردوں نے کس طرح کارِ دعمل ظاہر کیا اور ساتھ ساتھ برطانوی حکومت نے کس طرح کے سیاسی فیصلے کئے۔ ان تمام واقعات کے عورت کی زندگی پر اثرات کو یہاں میں چند اہم رسم و رواج کے حوالے سے واضح کروں گی۔اور مسلمان مرد کے اپنی عورت کی طرف رویئے میں جو تبدیلی آ رہی تھی ان کو اس وقت کے مشہور مصنفین اور شعراء کی تحریروں کے آئینے میں آپ کے سامنے پیش کروں گی۔

شمالی ہند خاص طور پر پنجاب میں بیٹی کو جہیز دینے کا رواج صدیوں پرانا تھا اور ہندو مسلم اور سکھ سب مذاہب کے لوگ اس رواج کو جانتے تھے۔بیٹی کو جہیز دینے کی تیاری اس کی پیدائش کے وقت سے شروع ہوتی تھی اور یہ چیز گھر کی بنیادی ضرورتوں کے سامان اور زیور نقدی کی صورت میں ہوتا تھا تا کہ بوقتِ ضرورت اس کو استعمال کیا جا سکے۔اس وقت یہ چیز گاؤں کی مشترکہ ذمے داری تھی۔ہر فیملی اپنی بساط کے مطابق تحائف اکٹھا کرتی تھی تا کہ والدین پر بوجھ نہ پڑے۔جہیز مستقبل کے ناگہانی معاشی مسائل سے تحفظ فراہم کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔اور زیادہ تر زراعتی پیشہ ور لوگوں میں عام تھا چاہے وہ ہندو سکھ یا مسلمان تھے۔قابض حکمرانوں نے جب زراعتی لوگوں پر ٹیکس عائد کئے۔موسمی تبدیلیوں میں تعاون کرنے سے انکار کیا تو مقامی لوگ قرضے میں جکڑ گئے۔ قرضہ نہ صرف ٹیکس ادا کرنے کے لئے بلکہ اپنی پیداوار کو جاری رکھنے اور یہاں تک کہ جہیز کی رسم کو نبھانے کے لئے لیا جانے لگا۔حکمرانوں کی معاشی پالیسیوں نے پورے گاؤں کو جکڑ لیا نہ صرف کہ والدین کی معاشی استطاعت کم ہو گئی بلکہ پورے گاؤں میں جہیز کے تحائف خریدنے کی معاشی سکت کم ہو گئی۔اور آہستہ آہستہ مقامی لوگ قرضوں کے جال میں پھنس گئے اور جہیز کی مشترکہ ذمہ داری اب والدین کے کندھوں کا بوجھ بن گیا۔

برطانوی حکمرانوں کے سامنے ان کے کارندوں نے یہ معاملہ اٹھایا کہ پنجاب میں خاص طور

پر بیدی سکھوں میں لڑکی کی پیدائش کو برا سمجھا جاتا ہے اور اس کو غفلت سے مار دیا جاتا ہے اس کی وجہ جہیز کی رسم ہے۔ Femicide اور جہیز کے معاملے کو آپس میں جوڑ کر حکمرانوں نے سکھ قوم کی بربریت اور پس ماندگی کا ڈھنڈورا پیٹا۔ اور اسے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا تاکہ سکھ مرد سماجی اور سیاسی دباؤ میں آ جائیں۔ 1848 میں پنجاب پر لشکر کشی اسی سلسلے کی ایک حکومتی پالیسی تھی۔

برصغیر کے کئی حصوں اور خاص طور پر بنگال میں ستی (Sati) کی رسم کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا تاکہ ہندو مردوں میں یہ احساس اجاگر کیا جائے کہ وہ سماجی لحاظ سے کتنے کمتر ہیں اور برطانوی حکمران ان کو ان مظالم سے نجات دلانے کے لئے آئے ہیں۔

برطانوی حکمرانوں کی مقامی رسم و رواج کے بقول ان کے ''ہولناکیوں'' کے متعلق پروپیگنڈے اور مقامی مردوں کا برطانوی ثقافت اور رہن سہن کے متعلق معلومات نے مسلمان مردوں پر خاص طور پر سماجی دباؤ بڑھا دیا اور مسلمان عورتوں کے پردے کے رواج نے بھی مسلمان مرد کو اس وقت کشمکش میں مبتلا کر دیا جب انہوں نے حکمرانوں کی عورتوں کو بے پردہ دیکھا۔ اور اس تذبذب کے عالم میں کچھ مرد مشرقی لباس اور انداز میں عورت کو بے پردہ دیکھنا چاہتے تھے اور کچھ لوگ ان نئی تبدیلیوں کے خوف سے عورت کو سات پردوں میں چھپا دینا چاہتے تھے جیسا کہ ہمیں مولانا اشرف تھانوی کی تصنیف بہشتی زیور سے پتہ چلتا ہے۔

اب مسلمان مرد کے لئے دو بڑے چیلنج تھے۔ باہر کی دنیا میں کیسے سیاسی، فوجی، سماجی دشمن (برطانوی حکمران) کا مقابلہ کریں اور اپنے وجود کو باقی رکھیں اور دوسری طرف کیسے اندر یعنی گھر کی دنیا کو باہر کے خطرات اور اثرات سے بچائیں وہ اپنا جہاں ان کی عورتیں رہتی تھیں، ہندو مردوں نے 1857 کی جنگ کے بعد زیادہ فراخدلی کا مظاہرہ کر کے برطانوی حکمرانوں کے طور طریقے تعلیم اور سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا اور مسلمان مرد ابھی تک کشمکش کا شکار تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ برطانوی حکمرانوں کی عورتیں برصغیر کی پبلک لائف میں زیادہ نظر آنے لگیں۔ یعنی کہ اب مسلمان مرد کے لئے اپنی اندر کی دنیا (خاندانی زندگی) پر اپنی گرفت زیادہ مضبوط کرنی تھی کیونکہ باہر کی دنیا میں تو وہ ہر طرح کی سیاسی مذہبی اور سماجی گرفت کھو چکے تھے۔ اندر کی دنیا کو بچانے کے لئے وہ اپنی عورت کو ایک مخصوص انداز میں دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ اب ان کی عورت کو

میری ناقص رائے میں ''قابض حکمران'' تھے۔

کالونیلزم کی علمی اصطلاح بھی انہی کے مفکروں کی پیش کی گئی ہے اور یہ اصطلاح قابض حکمرانوں کے سیاسی اور معاشی استحصالی چہرے کو مہذب طریقے سے چھپا لیتی ہے اور ہم نے کالونیلزم کا مزید مہذب اردو ترجمہ کر دیا ''نوآبادیاتی نظام'' کی صورت میں اور آنے والی نسلوں نے اسے بغیر کسی تنقید کے قبول کر لیا یہ ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے ہم اصطلاح کو چیلنج کریں اور اس کے لئے نعم البدل الفاظ کا استعمال کریں، میں جب یہاں ''قابض حکمرانیت'' کی بات کرتی ہوں تو بڑے بے لاگ طریقے سے میری سمجھ کے مطابق برطانیہ سے آنے والے تاجروں اور سیاستدانوں اور برصغیر میں رہنے والے مقامی لوگوں کے درمیان قابض اور مقبوضہ کا رشتہ تھا اور زیادہ تلخ انداز میں میں یہ کہوں گی کہ حاکم اور محکوم یا آقا اور غلام کی اصطلاحات بھی استعمال کی جا سکتی ہیں۔ وہ آئے...... انہوں نے تاجروں کی صورت میں سیاست کا کھیل کھیل...... اور معاشی طور پر اس زمین کو لوٹا...... پھر وہ مذہبی مبلغ بن کر آئے اور یہاں کے مذاہب کو نیچا دکھانے کی کوشش کی...... وہ قانون ساز بن کر آئے اور معافی انصاف وعدل کے نظام کو کمتر ثابت کر کے الٹ پلٹ کر دیا۔ وہ ماہرین تعلیم بن کر آئے اور مقامی زبان ادب اور تعلیم میں ملاوٹ کی اور لوگوں کو بتایا کہ کیا پڑھنا چاہئے اور کیسے پڑھنا چاہئے۔ وہ سماجی مصلح (social reformer) بن گئے اور محکوموں کو یہ بتایا کہ ان کا سماجی نظام رسم و روایات اور رواج کسی قدر ظالمانہ اور قدیم ہیں اور ان کی عورتیں کس قدر پسی ہوئی ہیں میرا یہ تمہید باندھنے کا مقصد واضح ہے۔ میں آج کے مقالے میں ان کو حاکم اور رعایا (Ruler-suljert) اور قابض اور مقبوض (occupiers-occupied) طور پر ہی refer کرے گی۔

اس مقالے کو زیادہ جامع اور مختصر بنانے کے لئے میں نے اپنی تحقیق کو چند خاص نقاط پر مرکوز کیا ہے اور ان کی روشنی میں یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ قابض حکمرانوں کی برصغیر میں موجودگی کا مقامی لوگوں کے معاشرتی اداروں (خاندان، مدراس، محلہ داری) پر کیا اثر پڑا؟ اور خاص طور پر صنعتی تعلقات کیسے تبدیل ہوئے؟

ان سیاسی تبدیلیوں کا عورت کے معاشرتی مقام پر کیا اثر ہوا؟ میرے تاریخی مشاہدے کے مطابق ان سوالات کا جواب دو مفکروں کی تحریروں کے آئینے میں دیا جا سکتا ہے۔ ابن خلدون نے

تیرہویں صدی میں فاتح اس کی فتوحات کا مفتوح لوگوں کی زندگی پر اثر اپنی کتاب مقدمہ ابن خلدون میں بہت واضح طریقے سے کیا ہے اور ابن خلدون کی تحریریں بعد میں آنے والے تاریخی واقعات کی بھی واضح تشریح کرتی ہیں میں یہاں اس کی تحریر کا انگریزی ترجمہ پیش کرتی ہوں۔

"The vanquished always want to initate the victor in his distinctive mark(s) his dress his occupation and all his other conditions and customs".(1)

تقریباً 5 صدیوں بعد مغرب میں مارکس نے اپنے تاریخی فلسفے میں جو اعلیٰ اور ادنیٰ طبقاتی تقسیم کی کشمکش کا ذکر کیا یہاں اس تصور کو میں حاکم اور رعایا اور فاتح اور مفتوح کے تصور سے جوڑتی ہوں۔ مارکس حکمرانی کرنے والے طبقے کے خیالات اور افکار کا عام لوگوں کی زندگی پر گہرے اثرات کے بارے میں واضح کرتا ہے کہ

"The ideas of the ruling class are, in every age, the ruling ideas...... the class which was the means of material production at its disposal has control at the same time over the means of mental production...... the individuals of the ruling possess, among other things, conviousness and therefore, think...... consequently their (ruling class) ideas are the ruling ideas of the age".(2)

مختصراً برصغیر میں صنعتی تعلقات اور عورت کے مقام کی تاریخ مندرجہ بالا فلسفیوں کے نقطۂ نظر سے بآسانی واضح کی جاسکتی ہے کہ کس طرح سے فاتح اور مفتوح اور حکمران طبقے اور رعایا کی آپس میں کشمکش اور تناؤ نے مقامی مردوں (اور خاص طور پر مسلمان مرد) کے اپنے خاندانی اور تعلیمی نظام اور اپنی عورت کی طرف رویوں میں توڑ پھوڑ کی اور بعدازاں اس کے منفی اثرات عورت کی زندگی پر چھوڑے۔ اس سیاسی محکومی اور انتشار نے مقامی مردوں چاہے وہ مسلمان ہندو یا سکھ

باہر کی دنیا میں تین خطرات کا سامنا تھا یعنی گورا برطانوی حکمران اور اس کا سیاسی نظام۔ تیزی سے بدلتا ہوا ہندو مرد اور بے پردہ طور پر نظر آنے والی حکمرانوں اور ہندوؤں کی عورتیں ان خطرات کے پیش نظر مسلمان مرد کو دہرے چیلنج کا سامنا تھا یعنی کہ اسے اپنی عورت کو باہر کے خطرات سے بچاتے ہوئے نئے سانچے میں بھی ڈالنا تھا۔ اور اسے جدید تعلیم دے کر (لیکن اپنے نظریئے کے مطابق) برطانوی حکمرانوں کے سامنے یہ بھی ثابت کرنا تھا کہ وہ بھی اب روشن خیالی کی طرف آرہے تھے۔ قابض حکمرانوں اور محکوم مسلمان مردوں کی آپس میں کشمکش کی سماجی جنگ مسلمان عورت کے وجود پر لڑی جارہی تھی۔ اس کی زندگی کا رخ مسلمان مرد اور قابض حکمران متعین کر رہے تھے۔ اسے تحریروں اور تقریروں سے واضح طور پر یہ بتایا جارہا تھا کہ کس طرح کی عورت ''اچھی'' ہے اور کس طرح کی عورت ''میری'' ہے۔

جب مسلمان مردوں نے اس بدلتی ہوئی صورتحال پر سوچو تو یہ اندازہ لگایا کہ حکمرانوں کی برتری ان کی جدید تعلیم کی وجہ سے ہے اور ان کی عورت آزادی اور اعتماد بھی اسی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ مسلمان مرد اپنی عورت کو بھی تعلیم دینا چاہ رہے تھے مگر اپنے نظریئے اور خیالات کے مطابق تاکہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کے قابو سے باہر نہ نکل جائے۔ اس کشمکش نے مسلمان مفکروں اور شاعروں کو عجیب مخمصے میں ڈال دیا۔ جو تحریریں شاعری اور تقریریں انیسویں صدی کے درمیان سے 20 ویں صدی ہمیں پڑھنے کو ملتی ہیں ان سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے اس سماجی مخمصے کے نتیجے میں مسلمان عورت کے متعلق متضاد رویئے سامنے آئے اور اس عورت کے تصور کی "Dialectical social Construction" (اچھی عورت بمقابلہ بری عورت) ہوئی اور جو آج ایک صدی گزر جانے کے بعد میں ہمارے معاشرے میں موجود ہے۔ اپنے اس وقت کی چند تحریروں اور شاعری میں اس وقت کی عورت کے متعلق مردوں کا تصور۔ ان کی خواہشات اور خدشات تلاش کریں۔

اچھی عورت کا تصور بنانے میں مغرب کا سیاسی نظریہ افادیت (یعنی utililareanism) کافی حد تک کارفرما تھا۔ عورت کو ضرور تعلیم دینی چاہئے نہ کہ اس کو اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے ایک بااعماد انسان بنانے کے لئے۔ بلکہ ایک اچھی ماں اور بیوی بنانے کے لئے تاکہ وہ مستقبل کے لئے ایک صحتمند اور باصلاحیت مسلمان مردوں کی کھپت تیار کرسکے اور اپنے شوہر کو

بہت ساری گھریلو ذمہ داریوں سے مبرّا کر سکے تا کہ وہ باہر کی دنیا میں اپنا کام بہتر طور پر کر سکے۔

یہاں میں سب سے پہلے سید احمد خان کے تعلیمی پروگرام کے سلسلے میں کچھ چیزیں آپ کے سامنے رکھوں گی سید احمد خان مسلمان عورت کو تعلیم بھی دینا چاہتے تھے لیکن ایک خاص قسم کی تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی 1886-1888 تک کی تفصیلات اور تقریریں اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ مسلمان عورت کو کونسے مضامین پڑھانے چاہئیں۔ سید احمد خان کی تحریروں نے درحقیقت برصغیر میں پہلی دفعہ واضح طور پر تعلیمی میدان صنعتی تفریق کی لکیر کھینچ دی۔ 1888 کی لاہور کی تقریر میں انہوں نے کہا کہ وہ کسی بھی صورت میں جدید تعلیم کو مسلمان عورت کے لئے مناسب نہیں سمجھتے۔ اور خاص طور پر یورپی عورتوں کی طرح کی تعلیم یہاں کی عورت کے لئے بالکل ہی غیر مناسب تھی۔ اس طرح کی تعلیم آئندہ آنے والی صدیوں میں عورت کو نہیں دینی چاہئے۔(3)

سید احمد خان نے نہ صرف تعلیم میں صنعتی تفریق کو بڑھایا بلکہ ''ہماری عورت'' اور ''ان کی عورت'' کا فرق بھی سامنے رکھا۔ اور اپنی عورت کو ان کی عورت کے طرزِ زندگی سے بچانے کی ہدایت کی۔ لیکن ساتھ ساتھ اپنی عورت کو کچھ پڑھانے لکھانے کی ضرورت پر بھی زور دیا تا کہ وہ گھر کی حکومت کو بہتر طریقے سے چلا سکے۔ سید احمد خان نے مزید کہا کہ عورتوں کے لئے گھریلو امور کا علم اور مذہبی تعلیم ماضی میں بھی مفید تھی اور حال اور مستقبل میں بھی رہے گی۔ لڑکیوں کو تاریخ اور فلسفہ پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ لڑکیوں کو تزکِ جہانگیری یا افریقہ امریکہ کا جغرافیہ یا الجبرا اور جیومیٹری کیوں پڑھائی جائے۔ یا پھر احمد شاہ اور محمد شاہ کی جنگیں اور مرہٹوں کی لڑائیاں۔(4)

صرف سیاسی مصلحین اور مفکرین بلکہ ادب اور شاعری بھی برصغیر کے مسلمانوں میں صنفی تفریق کو واضح کر رہی تھی اور عورت کا ایک تصور پیش کر رہی تھی جو دراصل قابض حکمرانوں کی وہاں موجودگی اور ان کی سیاسی اور قانونی پالیسیوں کا نتیجہ تھا۔ نثر اور کہانی نویسی میں ڈپٹی نذیر احمد کا نام اس زمانے میں سرفہرست تھا۔ سرسید احمد کی طرح وہ بھی عورت کی گھریلو اور مذہبی تعلیم کے حق میں تھے مگر انہیں سرسید کے اس نقطے سے اختلاف تھا کہ عورت کو تاریخی جغرافیائی اور ریاضی کی تعلیم نہیں دینے چاہئے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے خیال میں عورت ایک اچھی خانہ ساز بیوی کے علاوہ روشن خیال

اور باعلم ماں بھی ہوسکتی ہے جو اپنے بچے کی تربیت بہتر انداز میں کرے۔ تاکہ وہ جہالت اور توہمات سے آنے والی نسل کو بچاسکے۔ مراۃ العروس اور بنات النعش جیسی تحریروں کے ذریعے نذیر احمد نے ''اچھی اور بری'' عورت کے تصور کو اپنی فکر اور عقائد کے مطابق اجاگر کیا۔ مراۃ العروس میں اصغری کا والد اس کو خط کے ذریعے نصیحت کرتا ہے کہ اسے اپنے مستقبل کے گھر میں کیسے رہنا چاہئے۔ والد کہتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ بیوی کو اپنے شوہر سے محبت کرنی چاہئے بلکہ اس کو احترام بھی دینا چاہئے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ بیوی اپنے آپ کو شوہر کے برابر سمجھے۔(5)

اسی زمانے میں اکبرالہ آبادی کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری نے واضح طور پر خوف ظاہر کیا کہ جدید تبدیلیاں مسلمان عورت کے تصور کو بگاڑ رہی تھیں ان کی شاعری ماضی کے خوبصورت زمانے کی یادوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کو مسلمان عورت کی تعلیم کی آزادی اور بے پردگی پر دکھ ہو رہا تھا اور وہ مردوں کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے جن کی غیرت مرگئی تھی۔ گھر کے باہر کی دنیا میں قابض حکمران کی موجودگی اور گھر کے اندر رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ اکبرالہ آبادی کے لئے لمحہ فکریہ تھا وہ وقت کو روک دینا چاہتے تھے جہاں سب عورتیں وفادار اور باپردہ ہوں اور سب مرد باعزت ہوں جو اپنی بیویوں کو کنٹرول کرسکیں۔

شاعری، نثر اور ادب کے علاوہ مذہبی علماء کی تحریریں بھی دراصل برطانوی راج کے ردِعمل کے طور پر تحریر کی جارہی تھیں اور مذہبی علماء اسلام کا سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال باہر کی دنیا میں کر رہے تھے اور اسلام کو معاشرتی اور سماجی ڈھال کے طور پر گھر اور عورت کو بچانے اور سدھارنے کے لئے سامنے لا رہے تھے۔ 1905 میں لکھی گئی مسلمان عورت کی مذہبی رہنمائی کرنے والی کتاب بہشتی زیور اس کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ جو اچھی اور بری عورت کا تصور ڈپٹی نذیر احمد نے سماجی اور معاشی آئینے میں مسلمانوں کو دکھایا وہی تصور مولانا اشرف علی تھانوی نے آیات اور احادیث کے ذریعے اجاگر کیا۔ انہوں نے عورت کو نامحرم مرد سے چھپانے کے لئے جو طریقے بتائے اس میں احادیث اور آیات کے حوالے دیئے اور اپنے ان خیالات میں وہ مذہبی انتہا پسندی پر پہنچ گئے۔ اس کو گھر میں مقید کردیا۔ ڈولی یا پالکی میں محفوظ کردیا۔ ایک شریف مسلمان عورت کے لئے یہ بھی ہدایت دی کہ اس کے کنگھے کے بال اور کٹے ہوئے ناخنوں کے ٹکڑے بھی نامحرموں سے چھپائے جائیں۔(6)

بہشتی زیور کی گیارہ جلدیں پڑھنے کے بعد مختصراً یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مولانا کی آئیڈیل عورت ایک خاموش اور باہر کی دنیا میں نہ نظر آنے والی عورت تھی۔ عورت کی یہ دونوں خصوصیات اس وقت کے ریاستی حالات کی ضرورت تھیں۔ وہ مسلمان مرد جو باہر قابض حکمرانوں کے سامنے خاموش تھے وہ گھر کی دنیا میں ایسے مکین چاہتے تھے جو ان کے سامنے خاموش رہیں یعنی عورتیں اور بچے۔ ان مردوں کو گھر میں سکون چاہئے تھا تاکہ وہ باہر کے حالات کا مقابلہ کرسکیں اور یہ سکون گھر کی عورت کی تابعداری اور فرمانبردار خاموشی سے ہی مل سکتا تھا۔

دوسری بات یہ کہ مسلمان مردوں کو اپنی عورت کے لئے تحفظ فراہم کرنا تھا اور وہ تحفظ اس کو باہر کی دنیا میں اس لئے نہیں مل سکتا تھا کہ وہاں غیر مسلم نامحرم مرد اور برطانوی حکمرانوں کی بے پردہ آزاد عورتیں نظر آرہی تھیں۔ ان کو ڈر تھا کہ ان عورتوں کو دیکھ کر کہیں مسلمان عورتیں بھی اپنا رنگ ڈھنگ نہ بدل دیں۔ اور باہر کی دنیا میں محکومی کے ساتھ ساتھ وہ کہیں گھر کی دنیا میں پریشان نہ ہو جائیں۔

قصہ مختصر یہ کہ غیر ملکی حکمرانوں کی موجودگی ان کا سیاسی اور تعلیمی نظام ان کے بنائے ہوئے سماجی ادارے برصغیر کی مسلمان آبادی میں صنفی رویوں میں جہاں ٹوٹ پھوٹ پیدا کر رہے تھے وہاں نئے رویوں کو بھی جنم دے رہے تھے۔ بیسویں صدی کے شروع تک ان رویوں میں کافی تبدیلی آچکی تھی۔ عورت کی جدید تعلیم کے حامی اور مخالفین میں ایک واضح چپقلش کے نتیجے میں کچھ طبقات اپنی عورتوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے لگے اور آہستہ آہستہ پردہ ختم ہونے لگا اور دوسری طرف کچھ طبقات اپنی عورتوں کی خاندانی حیثیت کو پرانے انداز میں برقرار رکھنے کی جدوجہد میں لگے رہے ان کا مطمع نظر یہ رہا کہ عورت کے لئے گھریلو امور کی تعلیم اور مذہبی تربیت کافی تھی اور یہ کہ عورت کا باپردہ ہونا ضروری تھا۔ میں نے جس پہلی تبدیلی کا ذکر کیا وہ صرف اعلیٰ طبقے (یہاں زیادہ تر مرد انگلستان سے پڑھ کر آئے تھے) کی عورت کی زندگی میں رونما ہو رہی تھی اور دوسری تبدیلی درمیانے اور نچلے طبقے کے مسلمانوں کے گھروں میں آرہی تھی۔

اگر ان مندرجہ بالا دو طرح کے صنفی رویوں کا تجزیہ ہم برطانوی حکمرانوں کے جانے کے بعد اور اب آزادی حاصل ہوئے 57 سال بعد کے پاکستانی مسلمان معاشرے میں کریں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ہمارے حکمران تو چلے گئے لیکن ان کی سیاسی حکومت نظام تعلیم اور

معاشرتی نظام کا گہرا اثر آج بھی ہماری عورت کی زندگی کو ان دو طرح کے طبقوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ جو ایک صدی پہلے کے طبقوں میں ہو رہا تھا۔ آج بھی مختصر سے اعلیٰ یا پھر شہری نیم اعلیٰ طبقے کی عورت کو تعلیم کے مواقع گھومنے پھرنے کی آزادی یورپ امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع اور پردہ نہ کرنے کی رعایت حاصل ہے۔ اور ہمارے درمیانے اور نچلے طبقے میں عورت آج بھی ناخواندہ ہے چاہے مذہبی عقائد کی وجہ سے یا وسائل کی کمی کی وجہ سے۔

سالہا سال تک اردو کی ٹیکسٹ کی کتابوں میں مراۃ العروس شامل رہی۔ اکبر الہٰ آبادی کے عورت کے متعلق اشعار کو شامل کیا گیا۔ بچیوں کو تعلیم نہ دلوانے والے گھرانوں میں مردوں نے سید احمد خان کی تحریروں کا حوالہ دیا۔ اور آج بھی بہشتی زیور ہمارے معاشرے کے ایک خاص طبقے میں لڑکی کو شادی کے موقع پر جہیز میں دی جاتی ہے۔ مختصراً یہ کہ چاہے اعلیٰ طبقہ ہو یا درمیانہ۔ اچھی عورت اور بری عورت کا تصور آج بھی کافی حد تک انیسویں صدی کے مفکرین کے افکار کے قریب ہے۔ سوال اٹھتا ہے کہ آج ایسا کیوں ہے جبکہ غیر ملکی حکمران یہاں سے جا چکے ہیں جواب یہ ہے کہ اس وقت حکمران خود یہاں بیٹھے تھے ان کی موجودگی عورت کی زندگی پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ آج ان کو خود یہاں آنے کی ضرورت نہیں آج جدید الیکٹرانک میڈیا ان کو ہمارے معاشرے کی پبلک لائف بلکہ ہمارے گھروں کے ڈرائنگ روم اور لاؤنج تک لے آیا ہے۔ وہ جگہ جہاں وہ 1947 سے پہلے نہیں پہنچ سکے تھے۔ آج کے پاکستانی مسلمان مردوں کے لئے بی بی سی، سی این این اور سٹار چینل وہی خطرہ پیدا کر رہے ہیں جو سو سال پہلے برطانوی حکمران مرد اور عورتیں اور ہندو مرد اور ان کا کلچر پیدا کر رہے تھے۔ ان پرانے خطروں کی جدید شکل نے ردعمل بھی اسی صورت میں دیا ہے۔ اور ڈاکٹر فرحت ہاشمی کی الہدیٰ اکیڈمی وہی عورت بلا واسطہ طور پر پیدا کر رہی ہے جو بیسویں صدی کے شروع میں مولانا اشرف علی تھانوی نے کی تھی۔

# حوالہ جات

1- مقدمہ ابن خلدون۔

*In An Introduction to History:* Translated by Franz Rosenthal (Princeton University Press) 1958.

2. Karl Marx in Bottoniore, T.B., Maximllion, R (eds) *Selected Writings in Sociology and Social Philosophy,* (1956) Penguin, P. 93.

3- خطبات سرسید۔ص61۔

4- خطبات سرسید احمد۔ص64-66۔

5- ڈاکٹر سلیم اختر کا تعارف۔ڈپٹی نذیر احمد کے مجموعات۔ص33۔

6- مولانا اشرف علی تھانوی۔بہشتی زیور۔ص154۔

# نوآبادیاتی دور میں قانون سازی
# اور
# جنوبی ایشیا پر اس کے اثرات

سعود الحسن خان

قانون کی تعلیم کا المیہ ہمیشہ وہی رہا ہے جو تاریخ کا رہا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کی تاریخ کو بادشاہوں کے حالات تک محدود رکھا گیا ہے۔ عہد جدید کی تاریخ جو خاص طور پر انگریزی دور کی تاریخ ہے اس میں ہندوستان میں ایک سیاسی جماعت کانگریس کے ارتقاء اور جدوجہد کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے اور پاکستان میں ایک دوسری سیاسی جماعت مسلم لیگ کے ارتقاء اور جدوجہد کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے۔ اور ان سیاسی جماعتوں کی تاریخ کو ہی متحدہ ہندوستان کی تاریخ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ جب قانون کی تعلیم ہندوستان اور پاکستان میں پڑھائی جاتی ہے تو اس میں بھی کچھ اسی قسم کا تاثر دیا جاتا ہے کہ عوام کی فلاح اور بہبود کے لئے کون کون سے قوانین بنے اور ان میں کب کب ترامیم ہوئیں۔ قانون اور اس کے ارتقاء کی تعلیم دیتے وقت اُن سیاسی اور سماجی نیز معاشی حالات واسباب کی ہرگز نشان دہی نہیں کی جاتی کہ جن کے تحت وہ قوانین بنائے گئے تھے کیونکہ اس طرح سے حکومت وقت کی ان خامیوں اور نقائص کی نشاندہی ہونے لگتی ہے جن کو چھپانے کے لئے یا پھر جن سیاسی وسماجی جدوجہدوں کو دبانے کے لئے وہ قوانین بنائے گئے تھے۔ مثلاً 1909، 1919 اور 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو پڑھاتے وقت صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ ان قوانین کے ذریعے ہندوستان میں مقامی لوگوں کو آہستہ

آہستہ کس طرح حکومت میں حصہ دے کر حکومت کرنے کے قابل بنایا گیا۔ مگر یہ بات ہرگز نہیں بتائی جاتی کہ 1909 میں کی گئی آئینی اصلاحات سودیشی تحریک، 1919 میں کی گئی اصلاحات انقلابی تحریکوں اور 1935 میں کی گئی اصلاحات بھی انقلابی تحریکوں خصوصاً پنجاب اور بنگال کی انقلابی تحریکوں کا نتیجہ تھیں۔ ان اصلاحات کا مقصد ایک جانب عوام کی تسلی کرنا تھا کہ ان کو اقتدار میں اس قدر حصہ مل رہا ہے تو دوسری جانب اپنے اقتدار کو طول دینا تھا کیونکہ ان کے تحت مختلف قوانین اور ادارے وضع کیے جاتے تھے۔ اس مضمون میں ایسے ہی مختلف قوانین پر نظر ڈالی جائے گی جو انگریزوں کی ریاستی جبریت کے تحت پیدا ہوئے۔ کوئی مخصوص قانون پڑھاتے ہوئے بھی یہ نہیں بتایا جاتا کہ وہ قانون کس قوم نے بنایا اور اس کا مقصد کیا تھا۔ مثلاً مجموعہ تعزیرات ہند (I.P.C) جو آج پاکستان میں P.P.C کہلاتا ہے 1860 میں نافذ کیا گیا یعنی پہلی جنگ آزادی کے 1859 میں مکمل طور پر خاتمے کے صرف ایک سال بعد۔ صریحی طور پر اس کا مقصد انگریزوں کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔ اس کے مطابق اگر کوئی شخص کسی پر وار کرنے کی نیت سے ڈنڈا بھی اٹھالیتا ہے تو وہ ایک جرم ہے (1) حالانکہ انگریزوں کی آمد سے قبل یہ فعل جرم میں شمار نہیں ہوتا تھا۔ چونکہ I.P.C کا مقصد ہندوستانیوں کو پوری طرح سے دبا کر رکھنا تھا لہٰذا اتنی سی معمولی باتوں کو بھی جرائم میں شامل کرلیا گیا۔ لیکن آج قانون کی تعلیم دیتے وقت ہمارے ادارے یہ پڑھاتے ہیں کہ I.P.C جرائم کو کنٹرول کرنے کی غرض سے وضع کیا گیا تھا جبکہ یہ بالکل نہیں بتاتے کہ اس وقت حکمران کون تھے اور حکمرانوں کے نزدیک مجرم کون تھے۔

ہندوستان میں انگریزی اقتدار کا سب سے بڑا اثر یہ رہا ہے کہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں آج تک فوجی آمریت کسی نہ کسی شکل میں قائم ہے۔ پاکستانی علاقوں میں انگریزوں نے جاگیرداروں، وڈیروں اور قبائلی سرداروں کو اپنے مفادات کی غرض سے اپنے اپنے علاقے کے عوام پر لامحدود اختیارات دے دیئے اور 1947 میں اقتدار بھی ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں منتقل کر گئے۔ یہ لوگ چونکہ آمرانہ ذہنیت کے حامل تھے اور جو فوج پاکستان کے حصے میں آئی اس میں بھی ان کا ہی غلبہ تھا لہٰذا ان لوگوں نے جمہوریت کو ہمیشہ سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ جاگیردارانہ ذہنیت آج تک قائم ہے۔

## برصغیر کا جدید آئینی ارتقاء

ہندوستان میں انگریزی نظام قانون کی ابتداء1600ء کے فرمان سے ہوتی ہے جس کے تحت تاج برطانیہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں تجارتی اختیارات تفویض کر دیئے۔ رفتہ رفتہ اس کمپنی نے اپنی توجہ تجارت کے ساتھ ساتھ سیاسی معاملات پر بھی دینی شروع کر دی اور 1726 سے باقاعدہ برطانوی عدالتیں قائم ہوئیں جن میں برطانوی اور ہندوستانی دونوں ہی قوانین چلتے تھے یوں یہ عدالتی نظام دوہریت کا حامل تھا۔ اس دوران میں عدالتی نظام میں اصلاحات تو کئی دفعہ کی گئیں لیکن آئینی اصلاحات بالکل نہیں کی گئی کیونکہ انگریز ہندوستان کا حکمران اعلیٰ مغل بادشاہ کو ہی قرار دیتے تھے۔ جبکہ اپنی مقبوضات کو وہ تاج برطانیہ کی مقبوضات ہی قرار دیتے تھے۔ 1857 تک تمام ہندوستانی لوگ برطانوی عزائم سے آگاہ ہو چکے تھے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان کی مقامی قوتیں جو ایک دوسرے کی شدید دشمن تھیں وہ ایک دوسرے سے اتنی نفرت نہ کرتی تھیں جتنی کہ انگریزوں سے کرتی تھیں۔ اس نفرت کی ایک بنیادی وجہ کی جانب کارل مارکس نے اپنے 22 جولائی 1853 کے مضمون The Future Results of the British rule in India میں اشارہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

''عرب، ترک، تاتار اور مغل جنہوں نے یکے بعد دیگرے ہندوستان فتح کیا وہ سب بہت جلدی ہندوی (Hindvized) ہو گئے۔ یہ جنگجو فاتحین تاریخ کے دائمی قانون کے ذریعے خود ہی اپنے عوام کی اعلیٰ تہذیب سے مفتوح ہو کر رہ گئے۔ برطانوی پہلے ایسے برتر فاتحین تھے جو ہندو تہذیب کی پہنچ سے باہر رہے۔ انہوں نے مقامی گروہوں کو توڑ کر، مقامی صنعت کی بنیادیں اکھیڑ کر اور جو کچھ بھی مقامی سماج میں ارتقائیت تھی اور عظمت پائی جاتی تھی اسے زمین بوس کر کے اس تہذیب کو تباہ کر دیا۔ ہندوستان میں ان کے اقتدار کے تاریخی صفحات اس تباہی سے زائد شاید ہی کچھ بیان کر سکتے ہیں۔'' (2)

انگریزوں کے خطرے کو سب محسوس کرتے تھے اور اس کے توڑ کے لئے ہندوستان کے مقامی نظام حکومت میں تبدیلی لانے کی کوشش بھی ہو رہی تھی۔ 1857 کی جنگ کے اکثر رہنما خصوصاً جنرل بخت خان، عظیم اللہ خان اور خان بہادر خان وغیرہ انگریزی تعلیم و طرز حکومت سے

خوب آشنا تھے۔ ہندوستان کو آئینی طور پر متحد کرنے کی پہلی کوشش 1778 یا 1779 میں دکھائی پڑتی ہے جب ریاست میسور کے حیدر علی، تمام مرہٹہ سرداروں اور نظام دکن نے متحدہ طور پر انگریزوں کے خلاف محاذ قائم کیا۔ گو کہ یہ کوشش ناکام ہوگئی۔ 1795 کے قریب ایک اور کوشش کا پتہ چلتا ہے جب زمان شاہ کابل، ٹیپو سلطان، سندھیا، آصف الدولہ نواب اودھ اور غلام محمد روہیلہ نے انگریزوں کے خلاف اتحاد قائم کیا۔ مگر یہ پلان بھی ناکام رہا۔(3) پھر 1857 میں جب دہلی میں ہندوستانیوں کا باقاعدہ قبضہ ہوگیا تو ملکی انتظام وانصرام چلانے کے لئے ایک کورٹ آف ایڈمنسٹریشن بنائی گئی جس میں 6 اراکین فوج سے شامل کئے گئے اس طرح سے کہ پیادوں، سواروں اور توپ خانے میں ہر ایک سے دو دو لئے گئے جبکہ سول افراد میں سے 4 اشخاص لئے گئے۔ بہادر شاہ ظفر مغل بادشاہ اور اس کے ولی عہد عظیم بخت کو اس کورٹ میں محض سماعت کا حق حاصل تھا اس سے زیادہ کچھ اختیارات حاصل نہ تھے۔ یوں بادشاہت محض برائے نام باقی رکھی گئی۔(4) مختلف علاقوں میں انگریزوں سے بغاوت کرنے والے گروہوں کے سربراہوں کو اپنے اپنے علاقوں کا گورنر مقرر کیا گیا۔ جنرل بخت خان کو پورے ہندوستان کا لارڈ گورنر مقرر کیا گیا۔ کسی حکمران، گورنر، نواب، فوجی عہدیدار کو کوئی جاگیر عطا نہیں کی گئی بلکہ اسے فوجی بھرتی کرنے کا اختیار بطور اعزاز عطاء کیا جاتا تھا۔ اگر چہ ان امور کی دستاویزات نیشنل آرکائیوز دہلی میں محفوظ ہیں لیکن افسوس کے ہمارے مورخین آج تک ان کو قصداً نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ جن حضرات کا خیال یہ تھا کہ انگریزوں کے چلے جانے سے بادشاہت پھر سے قائم ہو جاتی وہ انگریزوں کی قائم کی ہوئی جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ ساری دنیا کے ساتھ ساتھ ہندوستان بھی بہت بدل گیا تھا۔

دہلی پر دوبارہ قبضے کے بعد ملکہ برطانیہ کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ کمپنی کی حکومت ختم ہو چکی ہے اور اب ہندوستان کی حکومت تاج برطانیہ کے پاس ہے تمام افواج ہند کی سربراہ اب ملکہ برطانیہ ہے۔ یوں ہندوستان باقاعدہ طور پر غیر ملکی بادشاہت کے قبضے میں چلا گیا اور 1857 کے نئے طرز حکومت کا ہندوستانی منصوبہ ناکام ہوگیا۔ تمام ہندوستانی معاملات طے کرنے کا اختیار سیکرٹری آف اسٹیٹ برائے ہند کو دے دیا گیا۔ وہ انگلینڈ کی کابینہ کا وزیر ہوتا تھا اور اسے پارلیمنٹ میں بیٹھنے کا اختیار تھا۔ اس کا تقرر خود وزیر اعظم برطانیہ کرتا تھا۔ اس کو کبھی ہندوستان آنے کی

ضرورت نہ ہوتی تھی بلکہ لندن سے ہی احکامات جاری کرتا تھا۔اس کی معاونت کے لئے 15 انگریزوں پر مشتمل انڈیا کونسل بنائی گئی تھی۔ان میں سے آدھے ممبران وہ ہونے چاہیے تھے جو کم از کم 10 سال تک ہندوستان میں خدمات سرانجام دیتے ہوں اور انہیں ہندوستان سے واپس آئے 10 سال سے زیادہ بھی نہ ہوئے ہوں۔ ہندوستانی حکومت کا برطانیہ میں جماعتی سیاست یعنی party-politics سے کوئی تعلق نہیں تھا۔کونسل خالصتاً بیوروکریٹکل باڈی تھا۔ پارلیمنٹ آف U.K کو ہندوستان کے بارے میں ہر طرح کی قانون سازی کا اختیار حاصل تھا۔ان تمام چیزوں کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1858 کے ذریعے قانونی شکل دی گئی۔ ہندوستانیوں کو پارلیمنٹ یا انڈیا کونسل میں بالکل حصہ داری نہ دی گئی۔ 1861 سے ہی ہندوستان کے لئے ایک وائسرائے مقرر کیا جانے لگا جو گورنر جنرل آف انڈیا بھی کہلاتا تھا۔اس وائسرائے کی ایک کونسل ہوتی تھی جو ایگزیکٹو کونسل کہلاتی تھی۔اس میں 6 سے لے کر 12 اراکین شامل ہوتے تھے جن میں سے ایک بھی ہندوستانی نہیں ہوتا تھا۔اسی طرح سے ایک امپیریل لیجسلیٹو کونسل ہوتی تھی جسے ہر طرح کی قانون سازی کا اختیار تھا۔اس میں بھی کسی ہندوستانی کو شامل نہیں کیا گیا۔ پھر اس کے ہر فیصلے کو رد کرنے کا وائسرائے کو حق حاصل تھا۔البتہ جنگ 1857 کے اثرات سے متاثر ہوتے ہوئے وائسرائے نے 1862 میں پٹیالہ اور بنارس کے مہاراجاؤں اور سر ڈنکار راؤ کو لیجسلیٹو کونسل کے non-official اراکین کے طور پر شامل کرلیا۔انڈین کونسلز ایکٹ 1870 کے تحت کونسل کے گورنر جنرل کو اختیار دیا گیا کہ وہ لیجسلیٹو کونسل کے علم میں لائے بغیر ہی کسی بھی regulation کی منظوری دے دے۔(5)

اسی عرصے میں ہندوستان میں اور خصوصاً بنگال میں روشن خیالی اور سیاسی بیداری پیدا ہونے لگی۔جس سے متاثر ہو کر انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ بالکل نچلی سطح پر ہندوستانیوں کو انتظام میں شراکت دی جائے۔ چنانچہ لارڈ رپن نے صوبائی حکومتوں کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ چنانچہ لوکل سلف گورنمنٹس وضع کی گئیں جن کے اراکین کا انتخاب کیا جانے لگا یہ انتخاب ہندوستانی ہی کرتے تھے مگر ان گورنمنٹس کے اختیارات محض انتظامی تھے۔ان کا آغاز 1882 سے ہوا۔لارڈ رپن نے اس بات کی وضاحت کر دی کہ ان حکومتوں کا مقصد ہرگز ہرگز جمہوری نہیں ہے اس نے کہا کہ:

''مقصود یہ نہیں کہ یورپین جمہوری طرز پر لوگوں کی نمائندگی کی جائے بلکہ قوم کے بہترین اعلیٰ درجے کے ذہن اور نہایت بارسوخ افراد کو بتدریج اس امر کی تعلیم دی جائے کہ اپنے مقامی معاملات کے انتظام میں دلچسپی اور سرگرمی سے حصہ لیں۔'' (6)

ان ہی دنوں سیاسی سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئیں۔ انگریزوں کے ایماء سے انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ 1892 کے انڈیا کونسلز ایکٹ کے ذریعے ہندوستان میں لیجسلیٹو کونسلز میں ہندوستانی اراکین کو شامل کرنے کی حامی بھر لی گئی لیکن ان لوگوں کا پہلے بالواسطہ انتخاب ہوتا تھا اور پھر گورنر جنرل ان منتخبہ حضرات میں سے اپنی مرضی کے افراد چن لیتا تھا۔ اس طرح سے صرف انگریزوں کے وفادار ہی کونسل کے رکن بن سکتے تھے۔ 20 رکنی کونسل میں اس طرح کے صرف 2 ہندوستانی اراکین ہی شامل ہو سکتے تھے۔ ہندوستانی عوام اس طریقہ کار سے بالکل خوش نہ تھے۔ (7) اسی دوران افغانستان کی جنگ اور یورپی حالات کے اثرات سے حالات میں مزید تبدیلی آئے۔ 1905 میں بنگال کی تقسیم کا شور مچا۔ چونکہ بنگال سیاسی سرگرمیوں میں سب سے آگے تھا لہٰذا انگریزوں نے چاہا کہ کچھ ایسے مشرقی اضلاع جہاں پر جاہل مسلمانوں کی اکثریت ہے ان کو آسام سے ملا کر مشرقی بنگال کا صوبہ بنایا جائے۔ اور جہاں پر تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی اکثریت ہے ان اضلاع کو اڑیسہ اور بہار کے کم تعلیم یافتہ علاقوں سے ملا کر مغربی بنگال کا صوبہ بنایا جائے اور یوں بنگال کے متحرک صوبے کو قابو کر لیا جائے۔ (غالباً اسی چیز کے مدِنظر 1947 میں پنجاب اور بنگال کو پھر سے تقسیم کر دیا گیا)۔ اس کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کو بھی نقصان پہنچایا جائے۔ 1905 میں بنگال تقسیم کر دیا گیا اور مشرقی بنگال کی مسلم اشرافیہ کے ذریعے فرقہ واریت کو ہوا دی گئی اور مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تقسیم بنگال کے خلاف تحریک پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اور سودیشی تحریک کا آغاز ہوا۔ انقلابی اور باغی عناصر سرگرم ہو گئے۔ ان سے نمٹنے کے لئے جہاں قانون سازی کر کے تحریک کو دبایا گیا وہیں 1909 میں نیا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ لایا گیا۔ اس کے تحت مقامی افراد میں سے الیکشن کے ذریعے سے منتخب ہونے والوں کی تعداد امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں بڑھا دی گئی۔ اس کونسل کے 69 اراکین میں سے 27 الیکشن کے ذریعے آ سکتے تھے لیکن یہ طریقہ انتخاب بالواسطہ تھا۔ یعنی عوام مقامی (لوکل) گورنمنٹ کے اراکین کا انتخاب کرتے اور وہ انتخابی کالج کے اراکین کا انتخاب کرتے۔ انتخابی کالج صوبائی

کونسل کے اراکین کا انتخاب کرتے اور صوبائی کونسل کے اراکین امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے اراکین کا انتخاب کرتے جبکہ ہر جگہ اکثریت حکومت کے حمایت یافتہ افراد کی ہوتی۔ یوں مقامی لوگوں کو بہت محدود نمائندگی دی گئی۔ اسی ایکٹ کے تحت مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دے کر فرقہ واریت کو فروغ دیا گیا۔(8) پہلی عالمی جنگ اور سول نافرمانی کی تحریک اور تحریک خلافت سے متاثر ہو کر انگریزوں نے دو کام کئے۔ ایک تو مہاتما گاندھی کے لئے ہندوستانی سیاست میں داخلے کو سہل بنایا۔ گاندھی جی نے 1919 میں جبکہ ہندوستان بڑے سیاسی بحران سے دوچار تھا آ کر سیاست میں پہلے تو سرگرمی دکھائی۔ کانگریس نے لوگوں کے ذہنوں میں گاندھی جی کے مہاتما ہونے کا اثر بٹھایا۔ پھر گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک ختم کر دی جس سے ہندوستان کی سیاسی تحریک کو زبردست نقصان پہنچا۔ اس تمام عرصے میں مسلم لیگ ایک خاموش تماشائی بنی رہی۔ اس نے نہ تو تحریکوں میں حصہ لیا اور نہ ہی انگریزوں کی حمایت کا اعلان کیا۔ دوسرا کام انگریزوں نے یہ کیا کہ 1919 میں کچھ مزید اصلاحات گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کے ذریعے نافذ کیں۔ ان کے ذریعے اب صوبائی لیجسلیٹو کونسلز میں جانے والے مقامی نمائندگان کا انتخاب براہ راست ہونے لگا۔ لیکن ووٹ ڈالنے کا حق صرف اس کو دیا گیا جو سالانہ انکم پر کم از کم دس ہزار روپے سے بیس ہزار روپے تک ٹیکس ادا کرتا ہو یا جس کا لگان اراضی 750 روپے سے 5000 روپے کے درمیان ہو۔ آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ حق انتخاب کن لوگوں کو حاصل ہو گیا تھا۔(9) 1920 اور 1935 کے درمیان ہندوستان میں انقلابی سرگرمیاں بہت تیز ہو گئیں۔ انقلابیوں کو دہشت گرد اور چور ڈاکو کہا جانے لگا اور ان کے خلاف سخت سے سخت قوانین بنائے جانے لگے۔(10) اس تمام عرصے میں کانگریس اور مسلم لیگ میں رسہ کشی ہوتی رہی۔ یہ سیاسی جماعتیں انگریزوں کی مخالفت پر کم اور ایک دوسرے کی مخالفت پر زیادہ توجہ دیتی تھیں۔ اس سے آزادی کی سیاسی تحریک سست پڑنے لگی لیکن انقلابی اور باغیانہ تحریکیں عروج پکڑ گئیں۔ ان انقلابی تحریکوں کی سیاسی جماعتوں کی جانب سے کم ہی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی کیونکہ اس طرح سیاسی جماعتوں کا اپنا اثر کم ہوتا چلا جاتا تھا۔ بالآخر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 آتا ہے جس کے تحت ہندوستانیوں کو ہوم گورنمنٹ کا اختیار دے دیا جاتا ہے۔ لیکن برطانوی حکمرانی ابھی بھی قائم رہتی ہے۔ اصل طاقت تاج برطانیہ کے پاس ہوتی ہے اور وائسرائے اس کی behalf پر سارے

کام کر سکتا ہے۔ مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کا انتخاب بالواسطہ ہوتا تھا اور تمام سول سروسز پر برطانیہ کا کنٹرول تھا۔ ہندوستانیوں کو صرف صوبائی وزارتوں کا حق حاصل تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس ایکٹ کے تحت ہندوستان میں وفاقی عدالت کا قیام عمل میں آیا ورنہ اس سے قبل صرف صوبائی ہائیکورٹس تھیں جو 1861 کے ایکٹ کے تحت چل رہی تھیں۔ اس تمام عرصے میں عدلیہ میں کوئی اصلاحات نہیں کی گئیں۔ 1935 کے ایکٹ میں ہی ضروری ترامیم کر کے آزادی کے وقت ہندوستان اور پاکستان کی نو آزاد حکومتوں کا نظام چلایا گیا تھا۔

## نو آبادیاتی دور میں قانون سازی کا تنقیدی مطالعہ

نو آبادیاتی دور میں قانون سازی حکومت کو مضبوط کرنے اور عوام کو کمزور کرنے کی غرض سے کی گئی۔ اور مختلف النوع قوانین بنائے گئے اگرچہ اس کے کچھ فوائد بھی عوام کو ہوئے مگر یہ فوائد اتفاقی نوعیت کے ہوتے تھے یعنی اس سے اصل فائدہ حکومت حاصل کرتی تھی جبکہ اتفاقیہ فائدہ عوام کو بھی پہنچ جاتا تھا۔ اگرچہ کچھ قوانین خالصتاً شخصی نوعیت کے تھے مثلاً قانون بلوغت وغیرہ اور حکومت کو ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا تو یاد رکھیئے کہ ایسے قوانین وقت اور حالات کا تقاضا تھے۔ اگر انگریزی حکومت موجود نہیں بھی ہوتی تو جو بھی مقامی حکومت ہوتی وہ ایسی اصلاحات ضرور کرتی۔ مثلاً اس بات کو بہت ہوا دی جاتی ہے کہ ستی کی رسم انگریزوں نے آ کر ختم کی حالانکہ اس سے قبل اورنگ زیب کے دور میں بھی اس پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ چنانچہ دیسی ریاستوں کے حکمران جو انگریزوں کے حاشیہ نشین تھے وہ بھی عوامی دباؤ کے تحت اپنی اپنی ریاستوں میں قانونی اصلاحات کرتے تھے۔ اس کے لئے ان پر کبھی کوئی دباؤ انگریزوں کی جانب سے نہیں ہوتا تھا۔ پھر انتظامی و مالیاتی امور میں جو اصلاحات کی گئیں وہ انگریزوں نے اپنے قائم شدہ نظام کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لئے کیں خاص طور پر قوانینِ اراضی جاگیرداری نظام کی بنیادیں مضبوط کرنے کی غرض سے وضع کئے گئے۔

بہت سے قوانین حکومت کو صرف تحفظ فراہم کرنے کی غرض سے ہی وضع کئے جاتے تھے۔ مثلاً جب ہندوستان میں ریلوے شروع ہوئی اور نجی کمپنیوں کو ریل سازی کا اختیار دیا گیا تو ریلوے ایکٹ وضع کئے گئے جن کا مقصد ریلوے کے نظام پر پورا کنٹرول رکھنا تھا۔ ٹیلی فون اور ٹیلی گراف

کے لئے بھی الگ الگ قوانین بنائے گئے۔ تجارت پر اپنی اجارہ داری رکھنے کی غرض سے انگریزوں نے کسٹم لاءز وضع کئے۔ جن کے تحت تجارتی ٹیکس ادا نہ کرنے کو باقاعدہ جرم قرار دیا گیا۔ حالانکہ تاجروں سے ٹیکس انگریزوں سے قبل بھی لیا جاتا تھا مگر کسٹم جیسی بدعات انگریزوں کے ذریعے ہی آئی ہیں۔ ایک اور مثال اسلحے کی ہے۔ اپنے پاس اسلحہ رکھنا تاریخ کے کسی بھی دور میں کسی بھی جگہ غیر قانونی قرار نہیں دیا گیا۔ اس پر بعض اوقات ممانعت ضرور ہوئی ہے مگر صرف عارضی نوعیت کی، مغلوں کے دور میں ہر شخص کو اسلحہ رکھنے کا حق حاصل تھا، انگریزوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے اسلحہ کے عوامی استعمال پر پابندی لگائی اور عوام کو غیر مسلح کرنے کا طریقہ استعمال کیا۔ اس غرض سے آرمز ایکٹ 1878 وضع کیا گیا۔ اس کے بعد لائسنس کے ذریعے ہتھیار رکھنے کا طریقہ کار وضع کیا گیا کیونکہ حکومتی ارکان اور طبقہ اعلیٰ کے افراد کے لئے اپنے دفاع کی غرض سے ہتھیار رکھنا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ اسی طرح سے پریس کے قوانین کا معاملہ ہے جو عوامی آواز کو دبانے کی غرض سے بنائے گئے۔ جب بجلی یعنی Electricity ہندوستان میں آئی تو اس کے درست استعمال کے لئے اور نجی طور پر بجلی بنا کر یا بجلی چوری کے ذریعے حکومتی معیشت کو ہونے والے نقصان کا سدباب کرنے کے لئے 1910 میں Electricity ایکٹ بنایا گیا۔ ایک قانون Land Acquisition Act بنایا گیا جس کے تحت حکومتوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ جب چاہیں جونسی چاہیں شخصی یا نجی اراضی کسی بھی حکومتی منصوبے کی غرض سے اپنے قبضے میں لے لیں اور اراضی کے مالک کو اپنی مرضی کے مطابق معاوضہ ادا کر دیں۔ اسی طرح سے نجی اراضی کے قیام کو یقینی بنانے کی غرض سے اراضی کے اندراجات کے طریقے وضع کئے گئے جو جو اراضی جن جن لوگوں کے پاس تھی وہ ان کے نام پر چڑھا کر باقی تمام تر اراضی حکومت کی ملکیت قرار دے دی گئی اور اس پر تعمیرات غیر قانونی قرار دے دی گئیں۔ اراضی کی خرید و فروخت کے لئے گورنمنٹ کی جانب سے مختلف ڈیوٹیاں عائد کر دی گئیں اور رجسٹراروں کے پاس یا عدالتوں میں ان کی ادائیگی کے طریقے وضع کئے گئے۔ اس طرح سے نہ صرف دیہاتوں بلکہ شہروں میں بھی نجی ملکیت کا ایسا تصور پیدا کیا گیا ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں کبھی کسی نے نہیں سنا یا دیکھا۔ شاید آپ لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہو کہ انگریزوں سے قبل زمینوں کی خرید و فروخت نہیں ہوتی تھی بلکہ صرف تعمیرات کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اس پر بھی کوئی فیس وغیرہ لاگو نہیں تھی۔ کاغذات کا اندراج قاضیوں کے پاس ہوا کرتا تھا

جو کچہریوں میں محفوظ رکھے جاتے تھے۔

نو آبادیاتی نظام کے کرتا دھرتاؤں کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ ہندوستان جیسے وسیع علاقے اور زیادہ آبادی والے ملک کو آسانی سے قابو کرنا مشکل تھا۔ 1857 کی جنگ میں انگریزوں کو معلوم ہو گیا کہ کون ان کے ساتھ مخلص ہے اور کون مخلص نہیں ہے لہٰذا جن ریاستوں نے انگریزوں سے وفاداری دکھائی ان کو انگریزوں نے پورا پورا تحفظ فراہم کیا اور ان کو قائم رکھا گیا۔ جب کبھی ان ریاستوں میں بغاوت ہوتی تو انگریز فوج اس کو دبانے میں اس ریاست کے حکمران کی مدد کرتی۔ اس طرح سے ہندوستان کے وسیع علاقے کو مقامی راجاؤں اور نوابوں کے ذریعے قابو کیا گیا۔ ان راجاؤں کا ظلم اور عیاشی بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن انصاف اور قانون کی بالادستی کا علم بلند کرنے والے انگریزوں نے ان ریاستوں میں آباد ہندوستانیوں کو انصاف کی فراہمی سے ہمیشہ لاتعلقی رکھی۔ ان ریاستوں نے انگریزی قوانین کی اتباع میں بعض اصلاحات ضرور کیں لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ وہ وقت کا تقاضا تھیں۔ انگریزوں کے بنائے ہوئے بہت سے اصلاحی قوانین کو ان ریاستوں میں بالکل اختیار نہیں کیا گیا اور اگر کیا بھی گیا تو ان کے اطلاق کو یقینی نہیں بنایا گیا۔ جہاں پر ریاستیں قائم نہیں تھیں وہاں پر جاگیریں قائم کر دی گئیں تاکہ دیسی لوگوں کے ذریعے حالات قابو میں رکھے جائیں۔

I.P.C 1860 اور مجموعہ ضابطہ فوجداری 1898 جو آج بھی ہمارے ملک میں رائج ہیں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انگریزوں نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کی غرض سے پولیس اور عدلیہ کو بہت وسیع اختیارات دیئے تھے I.P.C کی دفعہ 53 کے تحت سزاؤں میں موت، عمر قید، حبس بعبور دریائے شور اور 14 سال قید جیسی سخت سزائیں رکھی گئی تھیں۔ (11) دفعہ 124-A کے تحت مرکزی یا صوبائی حکومت کے خلاف بات کرنے یا کوئی تحریر شائع کرنے کی سزا عمر قید یا حبس بعبور دریائے شور قرار دی گئی۔ دفعہ 125 کے تحت حکومت کے کسی بھی دوست ملک کے خلاف جنگ کرنے کو بھی جرم قرار دیا گیا۔ یعنی برطانوی حکومت کے دوست ممالک کا تحفظ بھی لازمی بنانے کی کوشش کی گئی۔ Cr.P.C کی دفعہ 48 کے تحت پولیس آفیسر کو بلا وارنٹ گھر میں گھسنے کا اختیار دے دیا گیا۔ دفعہ 144 کے تحت ضلع مجسٹریٹ کو اپنی حدود میں ہر طرح کی سرگرمی و اجتماع کو غیر قانونی قرار دینے کا اختیار دیا گیا اور اب وہ لوگوں کے نقل و حرکت پر پابندی عائد کر سکتا تھا۔

Cr.P.C کی ہی دفعہ 127 کے تحت مجسٹریٹ اور پولیس آفیسر کو اختیار دیا گیا کہ وہ کسی ایسے مجمع کو منتشر کر سکتے ہیں جو ان کی نظر میں غیر قانونی ہو۔ اسی قانون کی دفعہ 128 کے تحت ان کو سول طاقت اور 129 کے تحت ملٹری قوت کے استعمال کا حق دیا گیا۔ دفعات 127 تا 131 کے تحت مجمع پر فائرنگ کرنے کا اختیار بھی پولیس اور فوج کو دیا گیا۔ نیز دفعہ 132 کے تحت مذکورہ دفعات کی بجا آوری میں حصہ لینے والے ہر شخص کے ہر عمل کو درست قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ ان کا کوئی عمل جرم شمار نہ ہوگا اور مرکزی حکومت کی اجازت کے بغیر ان کے خلاف کسی عدالت میں کوئی کاروائی نہیں کی جائے گی۔ یاد رہے کہ اسی قانون کے تحت جلیانوالہ باغ میں گولی چلائی گئی تھی اور دو برس قبل (2002ء اگست میں) اسلام آباد میں ایک سڑک چوڑی کرنے کی غرض F.S.F نے حکومتی حکم پر اسی قانون کے تحت گولی چلا کر احتجاج کرنے والوں کے پانچ افراد مار دیئے تھے۔ گولی چلانے والوں کو ہمیشہ اسی قانون کا فائدہ حاصل رہا ہے۔(12)

اب ذرا اس بات پر نظر ڈالیں گے کہ جب 1858 میں برطانیہ کی حکومت کامل طور پر قائم ہو گئی اور اس کے بعد ہندوستان میں سیاسی بیداری کا آغاز ہوا تو انگریزوں نے اس سیاسی بیداری کو دبانے کے لئے کیا کچھ کیا۔ اگرچہ 1858 سے 1947 تک مختلف آئینی اصلاحات بھی کی گئیں مگر ان اصطلاحات کا مقصد ہندوستان کی اشرافیہ اور وفادار طبقے کو انتظامیہ اور حکومت سازی میں حصہ دینا تھا اور اسے اس قابل بنانا کہ جب انگریز ہندوستان سے جائیں تو اپنی جگہ مقامی لوگوں میں سے اپنی ہی طرح کے لوگوں کے حکمران بنا کر چلے جائیں جو ان کے قائم کردہ طبقاتی نظام کا تحفظ کر سکیں۔

تقسیم بنگال 1905 کے موقع پر جب پورے ہندوستان میں اس تقسیم کے خلاف احتجاج ہوا تو انگریزوں نے اس احتجاج کو دبانے کی غرض سے پولیس اور فوج کا بے دریغ استعمال کیا۔ اور تعلیمی اداروں کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ اس تحریک میں حصہ لینے والے طلباء کو اداروں سے خارج کر دیں اور اس طرح سے بہت سے طلباء اداروں سے خارج کر بھی دیئے گئے۔(13) اس کے بعد سے عوامی تحریکوں یا احتجاجات کو دبانے کی غرض سے باقاعدہ قانون سازیاں ہونے لگیں۔ مثلاً مختلف زیادتیوں پر خصوصاً صوبہ پنجاب میں لگان کی مد بڑھانے پر احتجاج کو دبانے کی غرض سے 1907 میں Seditious Meetings Act کا نفاذ کیا گیا اور ہر طرح کے عوامی اجتماعات پر

پابندی عائد کردی گئی(14)۔1908 میں The Explosive Substances Act نافذ کیا گیا جس کے تحت بم بنانے میں کارآمد مواد کی برآمدگی پر بھاری جرمانہ عائد کیا گیا۔(15) اسی سال ہندوستانی اخبارات کی جانب سے احتجاجی خبریں شائع کرنے کو روکنے کے لئے انوکھا قانون نافذ کیا گیا جس کا نام The Newspapers (Incitement to Offences) Act 1908 تھا۔(16) اس قانون کے تحت اخبارات کے اجراء کو مجسٹریٹ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا۔اور تین جماعتوں ''بندے ماترم''، ''سندھیا'' اور ''یوگنتر'' کو اپنی اشاعتیں روکنے پر مجبور کیا گیا۔ 1908 میں ضابطہ فوجداری میں ترمیم کر کے افراد اور تنظیموں کو سزا دینے کے تمام اختیارات انتظامیہ کو دے دیئے گئے۔1910 میں The Indian Press Act 1910 آیا جس کے ذریعے اخبارات اور رسائل پر بھاری جرمانے عائد کرنے اور سخت سزائیں دینے کا قانون لاگو کیا گیا۔اس قانون کے مطابق دس سال میں 350 پریسوں اور 300 اخبارات کو سزا دی گئی اور 500 سے زائد کتب پر پابندی عائد کی گئی جبکہ نیا پریس شروع کرنے کے لئے ضمانت کے طور پر پانچ لاکھ روپے تک کی ضمانت کا مطالبہ کیا جاتا جو عام آدمی کی پہنچ سے باہر تھا۔اس کی وجہ سے 200 کے لگ بھگ پریس اور 130 اخبارات اپنا کاروبار شروع ہی نہ کر سکے۔(17) حکومت کے خلاف توہین آمیز مواد شائع کرنے پر بال گنگادھر تلک کو 6 سال قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانے کی سزا دی گئی(18)۔1818 کے پرانے قانون Regulation III کے تحت پنجاب میں لاجپت رائے اور اجیت سنگھ کو قید کر لیا گیا۔ان پر لگان میں اضافے کے خلاف احتجاج کا الزام تھا۔اگرچہ یہ قانون ختم ہو چکا تھا مگر چونکہ اس کے تحت کسی بھی شخص کو بغیر مقدمہ چلائے قید کیا جا سکتا تھا لہٰذا ان دونوں کو اسی قانون کی آڑ لے کر گرفتار کیا گیا۔(19) گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1909 کے تحت وضع شدہ Regulations میں اس بات کو یقینی بنایا گیا کہ قوم پرست اور شدت پسندوں کو ہندوستان کے انتظامی امور میں بالکل حصہ داری نہیں دی جائے گی اسی ایکٹ کے تحت حکومت کو اختیار دیا گیا کہ کسی بھی شخص کو لیجسلیٹو اسمبلی کا انتخاب لڑنے کے لئے نااہل قرار دیدے۔(20)

1913 میں عوام کو دبانے کی غرض سے فوجداری قانون میں تبدیلی کی گئی جس کے تحت ''سازش کرنے'' کو ایک علیحدہ جرم قرار دیا گیا۔اس تبدیلی کی فوری وجہ 1913 کا Delhi

Conspiracy Case تھا۔اس کے تحت لارڈ ہارڈنگ پر دسمبر 1912 میں بم پھینکنے کے الزام میں بہت سے لوگوں پر مقدمہ چلایا گیا(21)۔1914 میں عالمی جنگ شروع ہوگئی۔اسی دوران ہوم رول تحریک بھی اپنا اثر قائم رکھے ہوئے تھی۔ انگریزوں نے تحریکوں کو دبانے کی غرض سے 18-مارچ1915 کوامپیریل لیجسلیٹو کونسل نے ایک ہی نشست میں The Defence of India Act منظور کرلیا۔اس منظوری کوخود لارڈ ہارڈنگ نے بھی غیر تسلی بخش قرار دیا اور پورے ہندوستان میں اس پر ناراضگی کا اظہار کیا گیا۔اس کے تحت حکومت کواختیار حاصل ہوگیا کہ وہ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے احکامات اور ضوابط کو ساقط کر کے خصوصی عدالتیں قائم کرے اور مقدمات کی سرسری سماعت کر کے سزائیں دی جائیں۔ یہ عدالتیں ضابطہ فوجداری کی پابند نہیں تھیں۔اس کے تحت کسی ایسے شخص کی گواہی بھی لی جاسکتی تھی جو گواہی دینے کے قابل ہی نہ ہو۔(22) یہ نظام پاکستانی ملٹری کورٹس اور موجودہ دہشت گردی کی عدالتوں سے مشابہہ نظر آتا ہے۔اس قانون کے تحت 175 افراد پر مقدمہ چلایا گیا جن پر محض سازش کا الزام تھا اوران میں سے 38 کوسزائے موت سنائی گئی۔(23)

جب ہندوستان میں انقلابی تحریکیں تیز ہوگئیں تو انگریزوں نے Anarchical and Revolutionary Crimes Act 1919 لاگو کیا۔ اس کے تحت مقدمات کی سرسری سماعت کی جاتی تھی جو ہائیکورٹ کے تین جج کرتے تھے۔ان کے فیصلے کے خلاف اپیل کا حق بھی نہیں ہوتا تھا اور ایسی شہادت بھی ملزمان کے خلاف لی جاسکتی تھی کہ جو Evidence Act کے تحت قابل قبول نہیں تھی۔عرف عام میں یہ قانون رولٹ ایکٹ کہلاتا ہے جواس قانون کو وضع کرنے والوں میں سے ایک جج کا نام تھا۔ اس قانون کے تحت حکومت اور پولیس کو وسیع تر اختیارات مل گئے۔چنانچہ 30-مارچ 1919 کودہلی میں پولیس نے ایک مجمع پر فائرنگ کر کے چندافراد کو مارڈالا۔احمد آباد میں پولیس فائرنگ میں 28 لوگوں کوگولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔لاہور میں دو مجمعوں پر گولی چلانے میں کم وبیش 6 افراد مارے گئے۔جلیانوالہ باغ امرتسر میں بھی اسی قانون کے تحت گولی چلائی گئی جس میں کم وبیش ایک ہزار افراد مارے گئے۔اس حادثے کے ساتھ ہی پنجاب میں مارشل لاء کا اعلان کردیا گیا۔ یہ ہندوستان میں لگنے والا پہلا مارشل لاء تھا۔ مارشل لاء کے تحت صرف امرتسر کی عدالتوں میں 298 افراد پر سنگین جرائم کا مقدمہ چلاتے ہوئے

51 کو سزائے موت، 46 کو حبس بعبور دریائے شور 2 کو دس سال کی اور 79 کو سات سال کی سزائیں دی گئیں۔ دیگر سزائیں الگ تھیں۔ قصور میں مارشل لاء آرڈر کے تحت کیپٹن ڈوٹن نے غیر انسانی مظالم کئے۔ غرض کے یہ مارشل لاء دور پنجاب کی غلامی کا بدترین دور تھا۔(24)

مارشل لاء کے بعد جب تحریک عدم تعاون عروج پر آئی تو حکومت کی جانب سے Seditious Meetings Act لاگو کیا گیا اور ساتھ ہی ضابطہ فوجداری میں ترمیم کر کے قانون کو مزید سخت بنا دیا گیا۔ ان قوانین کا پنجاب، بہار، بنگال، آسام اور برما میں سختی سے اطلاق کیا گیا۔ یو۔ پی، پنجاب، بنگال اور آسام میں دھواں دھار گرفتاریاں ہوئیں۔ گرفتار ہونے والوں میں سی آر داس، لالہ لاجپت رائے اور جواہر لال نہرو بھی تھے۔ 1921 میں ضابطہ فوجداری، اور دیگر قوانین کے تحت اختیارات استعمال کرتے ہوئے فوج نے موپلا بغاوت کا خاتمہ کیا جس میں فوج کے 43 جبکہ موپلوں کے تین ہزار افراد مارے گئے۔ بعدازاں ان ہی قوانین کے تحت 1922 میں گاندھی جی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔(25)

جب 1929 میں پھر سے تحریک سول نافرمانی شروع ہوئی تو حکومت نے Press Act 1910 کی جگہ 1930 Press Ordinance جاری کیا۔ اور کانگریس کو غیر قانونی قرار دیا۔ یہ تحریک پشاور اور سرحد میں بہت سرگرم رہی۔ بعدازاں پورے ہندوستان میں یہ تحریک پھیل گئی۔ 1932 کے شروع میں عبدالغفار خان اور پٹیل کے علاوہ گاندھی جی کو بھی پھر سے گرفتار کر لیا۔(25)

ہر صوبے کی صوبائی حکومت اپنے طور پر بھی تحریکوں سے نمٹنے کی کوشش کرتی تھی۔ ہمارے پاس بنگال کی مثال موجود ہے جہاں پر 1924 میں مرکزی قانون کے علاوہ بھی ایک خصوصی صوبائی آرڈیننس جاری کیا گیا۔ 1925 میں بنگال میں ضابطہ فوجداری میں پھر سے ترمیم کی گئی۔ جب اس سے بھی تسلی نہیں ہوئی تو 1930 میں پھر سے دوبارہ ترمیم عمل میں لائی گئی۔ اس کے علاوہ 1818 کے Regulation III کے تحت بھی سزائیں دی جانے لگیں۔ 1931 میں اکتوبر کے مہینے میں فوجداری قانون میں دوبارہ ترمیم کر کے عدالتوں اور پولیس کے اختیارات بڑھائے گئے۔ جب اس سے بھی حالات نہ سنبھلے تو 30 نومبر 1931 کو Bengal Emergency Powers Ordinance لاگو کیا گیا۔ 1932 میں Bengal Suppression of Terrorist

Outrages Act لاگو کیا گیا۔اور ضابطہ فوجداری میں ترمیم کی گئی۔اسی طرح کی ایک اور ترمیم 1934 کے شروع میں پھر کی گئی۔(27)

غرض کہ اس طرح سے عوام کو دبانے کے لئے ہر سطح پر قانون سازی کی جاتی۔بعض قوانین تو کچھ مدت کے بعد ختم ہو جاتے تھے مگر اکثر اپنی جگہ پر قائم رہتے اور فوجداری قوانین میں ترامیم مستقل صورت میں قائم رہتیں تھیں۔وہ ترامیم آج بھی موجود ہیں اور پاکستانی قوانین کو وراثت میں ملی ہیں۔بعدازاں انڈیا اور پاکستان میں بھی اس طرح کے بہت سے قوانین وضع ہوئے ہیں۔

## نوآبادیاتی نظامِ قانون وعدالت کا تنقیدی جائزہ

انگریزی نظام قانون میں کورٹ فیس کو شروع سے اہمیت دی گئی۔یہ ایک ایسا اصول تھا جو اس سے قبل کسی نظام میں نہیں تھا۔ہندوستان میں اس چیز کو بہت برا سمجھا گیا۔ان کے نزدیک مقدمات دائر کرنے اور انصاف حاصل کرنے کے لئے فیس ادا کرنا دراصل انصاف فروخت کرنا تھا۔عوام کو آسانی سے انصاف فراہم کرنے کی غرض سے کورٹ فیس کا خاتمہ ضروری تھا۔کارنوالس نے 1793 میں کورٹ فیس کے خاتمے کا اعلان کر دیا تھا۔مگر 1795 میں کورٹ فیس پھر سے عائد کر دیا گیا۔مدعی کو 2 فیصد سے 5 فیصد تک کورٹ فیس ادا کرنی ہوتی تھی۔اس کی وجہ سے مقدمہ بازی مہنگی ہو گئی تھی۔مگر انگریزوں کا مقصد صرف حکومتی خزانے کو قائم رکھنا ہوتا تھا۔یہ چیز وراثت میں آج بھی ہماری حکومتوں کے پاس ہے۔

نوآبادیاتی نظام میں ایک اور ستم یہ تھا کہ ایک مخصوص تربیت یافتہ گروہ کو ہی وکالت کرنے کی اجازت دی گئی۔اگرچہ انگریزوں سے قبل بھی وکیل ہوا کرتے تھے مگر ان کا باقاعدہ پیشہ نہیں ہوا کرتا تھا۔کسی بھی فریق کا کوئی ایسا شخص جو باصلاحیت ہو اپنے فریق کا مئوقف عدالت کے سامنے پیش کرسکتا تھا۔اس کا قانون سے واقف ہونا ضروری نہیں تھا۔کیونکہ وہ صرف اپنا مئوقف پیش کرنے تک محدود رہتے تھے۔لیکن انگریزی نظام کے تحت 1793 میں صرف تربیت یافتہ اور تعلیم یافتہ وکلاء کو ہی عدالت میں پیش ہونے کا حق دیا گیا تھا۔اب مقامی وکلاء عدالت سے بیدخل کر دیئے گئے کیونکہ قانونی تعلیم وتربیت صرف انگریزی قانون کے مطابق ہوتی تھی جو انگریزوں کے ہی پاس

تھی۔ یہ انگریز وکلاء اپنے سائیلان سے نہ صرف منہ مانگی فیس وصول کرتے کہ جس کی کوئی حد مقرر نہ ہوتی تھی۔ بلکہ یہ وکلاء قانون سے واقفیت کی بنیاد پر قانون کا توڑ کرنے کے لئے غلط ہتھکنڈے استعمال کر کے اپنے سائل کو جیتانے کی کوشش کرتے تھے۔ان کی وجہ سے نظام عدل میں جھوٹ بولنے کو بہت دخل حاصل ہو گیا۔اسی بنیاد پر گواہوں کا معیار قائم ہونے لگا۔ Evidence Act 1872 میں اگرچہ گواہی کے نظام کو سادہ بنانے کی کوشش کی گئی مگر عملی طور پر گواہی کا نظام بہت پیچیدہ ہو گیا۔تقریباً دو ہزار سال قبل ارسطو نے نظام عدل پر جو اعتراض کیا تھا کہ ''کیوما کا قانون قتل جس کے تحت الزام عائد کر کے اپنے ہی خاندان کے چند گواہ پیش کر دیتے تو سمجھا جاتا تھا کہ اس کا جرم ثابت ہو گیا۔''(28) وہ انگریزی نظام میں پوری قوت کے ساتھ عیاں تھا۔وکیلوں کی پیشہ وارانہ تربیت نے ان کو گواہوں کی طوطا رٹائی پر بھی راغب کیا۔اب ایک وکیل کو خوب اچھی طرح سے تیار کراتا اور مخالف وکیل کی ہر بات کا توڑ کرا دیتا۔یوں گواہ کے معیار کا سوال بے معنی رہ گیا۔پھر عام آدمی بھی قانونی نظام سے کٹ کر رہ گیا۔

اپنے نظام کو تقویت دینے اور اپنی حکومت کو قائم کرنے کی غرض سے انگریزوں نے بتدریج ہندوستانی ججز عدالتوں سے خارج کر دیئے۔ابتداء میں انگریزوں نے ہندوستانی قاضی، مفتی اور پنڈت عدالتوں میں اپنے ساتھ رکھے تھے کیونکہ انگریزی قانون کو پوری طرح سے رائج نہیں کیا گیا اور دو عملی نظام موجود تھا یعنی ہندوستانی قانون بھی رائج تھا اور انگریزی قانون بھی رائج تھا۔ جب انگریزوں نے یہ دو عملی نظام ختم کیا تو نظام انصاف میں ہر جگہ انگریزی جج مقرر کر دیئے گئے اگرچہ بعد میں ہندوستانی ججز بھی مقرر کئے گئے لیکن وہ صرف چھوٹی عدالتوں میں تیسرے اور دوسرے درجے تک محدود رہے۔اس طرح سے نہ صرف نسلی امتیاز قائم کیا گیا بلکہ قانون کو اپنے مفادات کے مطابق تشریح کرنے کا طریقہ بھی اختیار حاصل کر لیا گیا۔

ضابطہ فوجداری اور خاص طور پر ضابطہ دیوانی اس طرح سے وضع کیا گیا کہ مقدمات طوالت کا شکار ہونے لگے۔بعض دفعات ایسی شامل کی گئیں کہ جن کے تحت درخواست دے کر مقدمے کو التواء میں ڈالا جا سکتا تھا۔ضابطہ دیوانی کی دفعہ 151 اس بات کی نمایاں مثال ہے جس کا بے انتہا ناجائز استعمال کیا گیا۔اور آج بھی کیا جا رہا ہے۔دوران مقدمہ عدالتی احکامات کے خلاف نظر ثانی یا اپیل کے حق نے مقدمات کو اور طویل کر دیا۔وکلاء اپنی فیس کے چکروں میں مقدمات کی پیروی

میں سستی سے کام کرنے لگے۔ ججوں کی محدود تعداد نے بھی نظام قانون کی سستی میں اہم کردار ادا کیا۔ پھر بہت سے ججوں کو انتظامی معاملہ نمٹانے بھی ہوتے تھے اس سے جج پر بھی کام کا بہت بوجھ پڑتا تھا۔ یوں عوام کی توجہ سیاسی معاملات سے ہٹانے کی کوشش کی گئی اور لوگ عدالتوں کے چکروں میں پھنسنے لگے۔

انگریزی حکومت سے وفادار رہنے والے ہی سرکاری ملازمت کرنے کے اہل تھے لہٰذا جج بھی اس بات کے پابند تھے کہ انگریزی حکومت کے مفادات کا تحفظ کریں۔ اول تو قانون پوری طرح سے انگریزی مفادات کا تحفظ کرتا تھا دوسرے انگریز اور ہندوستانی جج بھی قانون کی حکومتی مفادات کے مطابق تشریح کر کے فیصلے دیا کرتے تھے۔ اس چیز کو یقینی بنانے کی غرض سے جیوری کا نظام وضع کیا گیا۔ یعنی ہر عدالت میں 8، 10 یا 12 اراکین جج کی معاونت کرنے کے نام پر بٹھائے گئے جو زیادہ تر انگریز ہی ہوتے تھے۔ ان کی باقاعدہ لسٹ بنائی جاتی تھی۔ اگر ان کا کورم پورا نہ ہوتا تو انگریز افسرانِ فوج کو بطور جیوری بٹھایا جا سکتا تھا جن کو لسٹ کے علاوہ بھی لیا جا سکتا تھا۔ وہ لوگ قانون سے ناواقف ہوتے تھے لیکن ایک فوجی کی فکر کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ (29) اس طرح سے عدلیہ پر فوج کے اثر کی وہ بنیاد دکھائی دیتی ہے جو پاکستان میں 1977 اور 1999 میں پوری طرح سے نظر آئی ہے اور اس کے علاوہ بھی نظر آتی رہی ہے۔ ہائیکورٹ یا پریوی کونسل اور اس کے بعد فیڈرل کورٹ میں اپیل کرنے کی غرض سے پہلے اس کورٹ سے اجازت لینی ہوتی تھی جسے Leave to Appeal کہتے ہیں چونکہ عدالتیں انگریزوں کی آلہ کار تھیں لہٰذا وہ کسی بھی سیاسی مقدمے میں Leave to Appeal منظور نہیں کرتی تھیں چنانچہ بال گنگادھر تلک کو جب 6 سال قید اور جرمانے کی سزا ہوئی تو عدالت عالیہ نے اس کی اپیل کی سماعت کی درخواست ہی منظور نہ کی۔ (30)

بالکل ابتدائی نوآبادیاتی دور میں رٹ کا نظام موجود نہیں تھا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں سپریم کورٹیں کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں قائم ہوئیں تو ان کے ساتھ رٹ کا نظام بھی آ گیا اور 1861 میں ان کی جگہ ہائیکورٹس قائم ہوئیں تو رٹ کے اختیارات ان ہائیکورٹوں کو مل گئے لیکن یہ صرف اپنے محدود حلقوں میں ہی رٹ کے احکامات جاری کر سکتی تھیں۔ پورے ہندوستان میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ الٰہ آباد ہائیکورٹ قائم کی گئی تو اسے رٹ کا اختیار نہیں دیا گیا۔ پنجاب میں قائم

ہونے والی چیف کورٹ کواور دیگر ہائی کورٹس کو بھی رٹ کے اختیارات تفویض نہیں کئے گئے۔ ان سب کورٹ کے اختیارات 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ملے یعنی انگریزی عہد کے خاتمے سے صرف 12 برس قبل (31) یوں دو تہائی ہندوستانی باشندوں کے لئے حکومتی افعال کے خلاف کوئی Adequate, Alternate and Speedy ریمیڈی موجود نہیں تھی۔ جبکہ برطانیہ میں رٹ کا نظام سولہویں صدی سے قائم تھا اور چونکہ تمام انگریزوں کے ساتھ انگریزی قانون کے تحت نمٹا جاتا تھا۔ خواہ وہ برطانیہ میں ہوں یا ہندوستان میں یا کہیں بھی لہٰذا وہ رٹ کے حق کا استعمال کرنے کے مجاز تھے۔

نوآبادیاتی نظام قانون کی ایک خامی یہ تھی کہ انگریزوں کے بنائے ہوئے قوانین کا پورے ہندوستان پر اطلاق کبھی بھی نہیں ہوا۔ مثلاً ضابطہ دیوانی کو ہی لے لیجئے اس کا اطلاق 1882 میں یعنی جب یہ وضع کیا گیا تو ہندوستانی ریاستوں پر کبھی نہیں ہوا اس کے علاوہ انگریزی عملداری میں برٹش بلوچستان، پنجاب، برٹش راجستھان، چھتیس گڑھ، شمالی علاقہ جات یعنی موجودہ اترا کھنڈ، آسام اور دیگر بہت سے علاقوں پر نہیں ہوتا تھا۔ ان علاقوں پر اس کا اطلاق بہت بعد میں بتدریج کیا گیا ہے۔ (32) پھر بہت سے قوانین کا بعض فرقوں، بعض ذاتوں پر اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ بہت سے قوانین میں اس بات کی بھی وضاحت نہیں کی گئی کہ آیا ان کا اطلاق ان کے وضع ہونے سے قبل زیر سماعت مقدمات پر بھی ہوگا یا نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے دیہاتوں میں پنچایتی نظام کو قائم رکھا۔ پنچایت میں چونکہ دیہات کے بااثر افراد ہوتے تھے خصوصاً پنجاب میں جاگیردار ہوا کرتے تھے لہٰذا ان کے فیصلے زیادہ تر ظالمانہ ہوتے تھے جو آج تک چلے آرہے ہیں اور جس کی ایک حالیہ مثال دو لڑکیوں کے ساتھ ہونے والی اجتماعی زیادتی ہے۔ انگریزوں کا مقصد چونکہ صرف اپنے اقتدار کو مضبوط کرنا اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنا تھا لہٰذا انہوں نے نچلی سطح کا مقامی نظام قانون دیہاتوں میں قائم رکھا۔ اس کے علاوہ قانون کی بالادستی کا نعرہ بلند کرنے والے حکمرانوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذاتی قوانین کو بھی برقرار رکھا کیونکہ اس سے بھی ان کے اپنے مفادات متاثر نہیں ہوتے تھے۔ (33) مثلاً ہندوؤں کے ذاتی قانون کے تحت عورتوں کو وراثت میں حصہ نہیں ملتا تھا جبکہ مسلمانوں میں نصف حصہ ملتا تھا۔ انگریزی قانون وراثت میں عورتوں کو مردوں کے برابر کا حصہ ملتا تھا۔ انگریز اس قانون کو چاہتے تو رائج کر سکتے تھے لیکن انہوں

نے ایسا بالکل نہیں کیا۔صرف یہی نہیں بلکہ ذاتی قوانین اور رواجی قوانین دونوں کو ہی برقرار رکھا۔ مثلاً اسلام کے قانون وراثت کے مطابق عورتوں کو زرعی اراضی میں بھی مردوں سے نصف کے برابر حصہ ملتا ہے جبکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اکثر رواجی قوانین کے مطابق مسلمان عورتیں زرعی اراضی میں بالکل حصہ نہیں حاصل کر سکتیں۔انگریز عدالتوں نے ہمیشہ اسی رواجی قانون کو مسلم ذاتی قانون پر ترجیح دی ہے۔یہ قانون آج بھی ہندوستان میں رائج ہے اور پاکستان کے دیہاتوں میں بھی۔بعض انگریزی قوانین بغیر سر پیر کے تھے۔مثلاً قانون معاہدہ 1872 ہے کہ جس کے اسلوب بیان اور طرز سے خود انگریز بھی کبھی مطمئن نہیں ہوئے اور اس کی موجودگی میں ہی ان کو Sale of Goods Act اور Negotiable Instrument Act لاگو کرنا پڑا۔(34) اس کے علاوہ قانون ٹارٹ ایسا ہے کہ جسے آج تک وضع نہیں کیا گیا ہے اور یہ تحریری شکل میں نہیں ہے۔انگریزوں نے اس کو غیر تحریری اور غیر وضع شدہ شکل میں ہی ہندوستان میں رائج کر دیا اور یہ آج تک اسی شکل میں پاکستان اور ہندوستان و بنگلہ دیش میں رائج ہے اس کے کوئی متعینہ اصول ہیں ہی نہیں۔(35)

نوآبادیاتی دور میں عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیل کی اعلیٰ عدالت پریوی کونسل تھی اور اس کے فیصلے تمام نوآبادیاتی عدالتوں پر لازم اِطلاق تھے۔جو فیصلے قانونی رسائل میں شامل کئے جاتے تھے وہ نظیر یعنی Precedent کہلاتے ہیں۔پریوی کونسل انگلینڈ میں تھی جس تک عام اور غریب آدمی کی رسائی مشکل تھی صرف پیسے والے ہی وہاں تک جا سکتے تھے پھر انیسویں صدی تک پریوی کونسل نے ہندوستانی مقدمات میں بھی انگریزی نظائر کے حوالے دے کر فیصلے کئے۔ ان میں بھی بہت جگہ ایسا ہوتا تھا کہ ایک ہی طرح کے مقدمات میں الگ الگ فیصلے ہوتے تھے۔ چونکہ ہندوستانی عدالتوں کے لئے یہ قانون کی حیثیت رکھتے تھے لہٰذا ہندوستانی عدالتیں ایسے تمام معاملات میں بھی انگریزی فیصلوں کی ہی پابند تھیں کہ جہاں واضح انگریزی قانون نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف النوع فیصلوں کی بنیاد پر انگریزی حکومت سے وفاداری آسان اور سہل ہو گئی تھی۔

سب سے بڑی خامی نوآبادیاتی قانون نظام میں یہ تھی کہ شروع سے ہی نسلی امتیاز کو قائم رکھا گیا تھا۔یعنی ہندوستانیوں اور انگریزوں کے لئے دو الگ الگ طریقوں سے نمٹا جاتا تھا۔اس چیز

کی بہت سی مثالیں آپ کو انگریزی قوانین میں مل سکتی ہیں۔ مثلاً جن عدالتوں میں ہندوستانی جج مقرر ہوتے تھے وہ یورپی اور انگریزی فریقین کے حامل مقدمات کی سماعت نہیں کر سکتی تھیں۔(36) 1864 کے ایک ایکٹ کے تحت امریکی اور یورپی مجرموں کو ہندوستان میں بھی صرف قید کی سزا ہو سکتی تھی جبکہ ہندوستانی مجرمان کو حبس بعبور دریائے شور المعروف کالے پانی کی سزا ہوتی تھی۔(37) بعض جرموں میں ہندوستانیوں کو تو عمر قید کی سزا ہوتی تھی لیکن انگریزوں کو 6 سال سے زیادہ کی سزا نہیں ہو سکتی تھی۔Penal Servitude یعنی سزائے قید یا جسمانی سزا جو کالے پانی کی سزا کا متبادل تھی صرف انگریزوں کے لئے تھی ہندوستانی اس رعایت کے مستحق نہیں تھے۔(38) انگریزوں کے مقدمات کی درجہ اول کے مجسٹریٹ سے نیچے کی کوئی عدالت سماعت نہیں کر سکتی تھی۔ انگریزوں کے مقدمات کی سماعت صرف انگریز جج ہی کر سکتے تھے۔(39) عادی مجرمان جو یورپی ہوتے تھے ان سے Cr.P.C کے تحت اچھے کردار کی ضمانت نہیں لی جاتی تھی بلکہ ان کے لئے European Vagrancy Act 1874 تھا۔(40) یورپیوں یا امریکیوں کے مقدمات کی سماعت میں جیوری کے اراکین یورپی یا انگریز مقرر کئے جاتے تھے۔(41) اگر لسٹ پر موجود اراکینِ جیوری دستیاب نہ ہوں تو عدالت برطانوی فوج میں سے کچھ افراد کو بطور رکن جیوری میں شامل کر سکتی تھی۔(42) یورپی یا امریکی ملزمان سماعت سے قبل ہی یہ مطالبہ کر سکتے تھے کہ ان کے ساتھ یورپی یا امریکی طرز سماعت برتا جائے۔ یعنی یہ کہ وہ یورپی یا امریکی استحقاق سے فائدہ حاصل کریں گے۔(43) اگر ان کا یورپی ہونے کا دعویٰ ثابت نہ ہو سکتا اور ان کا یہ دعویٰ مسترد کر دیا جاتا تو مجسٹریٹ اس بات کا پابند تھا کہ وہ اپیل کی معیاد ختم ہونے تک مقدمے کی کارروائی روک دے۔ خواہ ملزم اپیل دائر کرے یا نہ کرے اور اگر وہ اپیل کر دے تو اپیل کے فیصلے تک مقدمے کی کارروائی روک دے۔ حالانکہ کوئی بھی معقول قانون اس غلط اصول کو اختیار نہیں کرے گا۔ کیونکہ مقدمے کی کوئی بھی کارروائی ہمیشہ اعلیٰ عدالت کے حکم پر ہی روکی جا سکتی ہے۔(44) ایک اور بات جو نسلی امتیاز سے تعلق رکھتی ہے وہ اپیل کے حق سے متعلق ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ کسی بھی فیصلے کے خلاف اعلیٰ عدالت میں اپیل کے لئے ماتحت عدالت کے فیصلے میں موجود سقم کو اپیل کی بنیاد بنایا جاتا ہے اور یہی قانونی طریقہ ہے۔ لیکن ہندوستان میں کوئی بھی انگریز یا یورپین یا امریکن صرف اس بنیاد پر بھی اپیل کا حق رکھتا تھا کہ وہ انگریز یا یورپی یا امریکی ہے۔(45) یورپی مجرمان

کے مقدمات کی سماعت صرف یورپی جج اور اراکین جیوری کر سکتے تھے۔ برطانیہ سے بار ایٹ لاء کرنے والے وکلاء کو براہ راست ہائیکورٹس میں پریکٹس کرنے کا حق حاصل تھا جبکہ مقامی اداروں سے قانون پاس کرنے والے وکلاء دو برس کے بعد ہائیکورٹ میں پریکٹس کرنے کے حقدار تھے۔(46) یہ چیز نہ صرف نسلی امتیاز کو ظاہر کرتی ہے کیونکہ برطانیہ سے بار ایٹ لاء پاس کرنے والے زیادہ برطانوی ہوتے تھے بلکہ طبقاتی امتیاز کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ جو بھی ہندوستانی برطانیہ سے بار ایٹ لاء کرے گا وہ طبقہِ اعلیٰ سے تعلق رکھتا ہوگا۔

طبقاتی امتیاز کی کچھ اور مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ نو آبادیاتی نظام میں کچھ قوانین ایسے بھی وضع کیے گئے کہ جن کے تحت ریاستی حکمرانوں یا ان کے خاندان کے افراد کے خلاف گورنر جنرل آف انڈیا سے اجازت لئے بغیر کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی تھی۔(47) یہ استحقاقات قیام پاکستان کے بعد تک ریاستی حکمران اور ان کے اہل خاندان استعمال کرتے رہے ہیں۔

ایک اور خامی انگریزی قانون کی یہ تھی کہ ملک کا حکمران اعلیٰ یا مرکزی حکومت یا صوبائی حکومت کسی بھی مقدمے میں موت کی سزا کو یا جلاوطنی یا عمر قید کی سزا کو کم تر سزا میں بدل سکتی تھی اور معاف بھی کر سکتی تھی۔ اس طرح سے عدالتی فیصلوں کا مذاق اڑایا جانے لگا اور عدلیہ پر حکومتی مرضی کو برتری حاصل ہوگئی۔ یہ بات آج بھی انڈیا میں رائج ہے اور پاکستان میں 1992 تک رائج رہی ہے۔(48)

نو آبادیاتی قوانین میں پولیس کو لامحدود اختیارات دے دیئے گئے اسے گھروں میں گھسنے اور ملزم کو قید میں رکھنے کا اختیار مل گیا۔ لیکن پولیس کے ناجائز اختیارات کے استعمال کے خلاف کارروائی کو کبھی یقینی نہیں بنایا گیا۔ اگر کچھ ہوتا بھی تو وہ محض محکمانہ کارروائی تک محدود رہتا۔ ہمارے موجودہ پولیس سسٹم کی تمام تر خرابیاں ہمیں وراثت میں نو آبادیاتی نظام میں ملی ہیں۔ اسی طرح سے دیگر سرکاری ملازمین کو بھی تحفظ دیا گیا۔ نو آبادیاتی دور میں ریاستی راجاؤں، نوابوں اور حکمرانوں کے جرائم کی تادیب کے لئے کبھی کوئی کارروائی نہیں کی گئی اور نہ ہی کوئی قانون سازی کی گئی۔ اگر بصورت مجبوری انگریز حکمرانوں یا افسران کے خلاف کوئی کارروائی کی بھی جاتی تو وہ مخصوص ٹربیونل کے ذریعے ہوتی جیسے وارن ہیسٹنگز کے خلاف ایک ٹربیونل مقرر کیا گیا تھا لیکن وہ محض ایک کٹھ پتلی ٹربیونل تھا جس نے بعد ازاں اس کو تمام الزامات سے بری کر دیا۔ دوسری

مثال جنرل ڈائر کے خلاف الزامات کے بارے میں خصوصی ٹربیونل کے قیام کی ہے۔ یہ چیز بھی نسلی اور طبقاتی امتیاز کو ظاہر کرتی ہے۔

نوآبادیاتی قانون چونکہ استحصالی حکومت کو مضبوط کرنے اور اس کے مفادات کو پورا کرنے کی غرض سے تھا لہٰذا I.P.C کے تحت ریاست اور فوج کے خلاف تمام جرائم نا قابل ضمانت قرار دیئے گئے جبکہ حکومتی کرنسی اور مہروں نیز جائیداد سے متعلق اکثر جرائم نا قابل ضمانت قرار دیئے گئے۔ اس کے برعکس انسانی جسم سے متعلق بعض جرائم نا قابل ضمانت اور بعض قابل ضمانت تھے۔ اس کے علاوہ دفعہ Cr.P.C 249-A کے تحت عدالت کو اختیار دیا گیا کہ وہ کسی بھی شخص کو بغیر سماعت کے ہی بے گناہ سمجھ کر بری کر دے۔ ان امور سے حکومت کے حقیقی مفادات کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

ایک اور اہم بڑا نقص نوآبادیاتی دور کی قانون سازی میں یہ تھا کہ لوگوں کے بنیادی حقوق یعنی Fundamental Rights کا کسی بھی قانون یا دستور میں کہیں کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔ یوں لوگوں کی تمام تر سرگرمیاں حکومتِ وقت کی مرہون منت بن گئیں۔

علاوہ ازیں 1835 سے نوآبادیاتی ہندوستان میں انگریزی زبان کو سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔ اب تمام سرکاری کارروائیاں انگریزی زبان میں ہوتیں۔ عدالتی کارروائیاں بھی سرکاری زبان میں ہونے لگیں۔ اگرچہ مقامی لوگوں کو اپنی مقامی زبان میں عدالت کے اندر بیان دینے یا بولنے کا حق تھا اور دستاویزات بھی مقامی زبان میں تیار کی جا سکتی تھیں لیکن عدالتی فیصلے انگریزی میں لکھے جاتے تھے۔ پھر ہائیکورٹوں کی تمام تر کارروائی صرف اور صرف انگریزی زبان میں تھی۔ اس سے ہندوستانی عوام قانونی فہم و تفہیم سے دور سے دور تک ہوتے چلے گئے۔ ایک اجنبی زبان میں موجود کارروائی جاننے کے لئے انہیں مختلف افراد کا خصوصاً وکلاء کا محتاج ہونا پڑا۔ یہ بات بھی وراثت میں ہمارے پاس آئی ہے۔

یہ درست ہے کہ انگریزوں کی آمد سے قبل بھی ہندوستانی نظام قانون میں خامیاں تھیں اور ایسا ہر نظام قانون میں ہوتا ہے۔ لیکن انگریزوں نے ان خامیوں کی اصلاح کرنے کی جگہ اپنا خامیوں زدہ نظام لگا دیا۔ پھر اس نوآبادیاتی نظام کی ایک خاص بات یہ تھی کہ انگریزوں کے اپنے ملک میں Administration of Justice غیر امتیازی تھا جبکہ ہندوستان میں

Administration of Justice سراسر امتیازی اور استحصالی تھا۔

## عدلیہ کے کردار کی ایک جھلک

نوآبادیاتی دور کی عدالتیں انگریزی قانون اور انگریزی مفادات کی بڑی سختی سے پاسداری کرتی تھیں۔شروع میں صرف انگریز ہی اعلیٰ و ادنیٰ عدالتوں کے جج مقرر ہوتے تھے۔خاص طور پر ہائیکورٹ کے جج۔بعد میں اگرچہ ہندوستانی بھی آنے لگے اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں بعض ہندوستانی بھی ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے لیکن وہ سب ایک ہی گروہ سے تعلق رکھتے تھے یعنی حکمران گروہ سے۔وہ حکومت سے وفاداری کا حلف اٹھاتے تھے۔ان سب سے بڑھ کر یہی بات یہ ہے کہ چھوٹی عدالتوں کے تمام ججز برطانوی حکومت جبکہ ہائیکورٹ کے ججز ملکہ یا بادشاہِ برطانیہ کی مرضی پر مقرر ہوتے تھے اور وہ ان کو جب چاہے ان کے عہدے سے ہٹا سکتی تھی۔ان عدالتوں نے آج تک ایسی کوئی نظیر (Precedent) نہیں چھوڑی جو انگریز حکمرانوں کے کسی فیصلے کے خلاف جاتی ہو۔انہوں نے نہ تو کسی حکومتی عمل کو غیر قانونی قرار دیا اور نہ ہی کسی مخصوص و امتیازی قانون کو غیر قانونی قرار دیا، ان عدالتوں نے رواجات کو انسانیت پر ترجیح دی اور تمام نوآبادیاتی قوانین کے آگے سر جھکائے رکھا۔

نوآبادیاتی نظامِ قانون سے قبل مقدمات کی سماعت میں سماجی، سیاسی یا معاشی حالات کا بھی جائزہ لیا جاتا تھا۔مگر نوآبادیاتی نظام میں ایسا نہیں تھا۔یہاں صرف متعینہ قانون کے دائرے میں رہ کر بات کرنی ہوتی تھی۔مثلاً شیخ احمد سرہندی نے سرہند میں مغلیہ حکومت کے خلاف بہت سی سرگرمیاں کیں۔جہانگیر بادشاہ نے اس کے معاملے کو سیاسی طور پر دیکھا اور اسے قید میں ڈال دیا۔دونوں فریقین نے برملا اپنے اپنے سیاسی موقف کی بات کی۔انگریزی قانون کی نظر سے دیکھا جائے تو شیخ احمد سرہندی کی سرگرمیاں ریاست کے خلاف بغاوت تھی جس کی سزا موت یا عمر قید ہے۔چونکہ نوآبادیاتی نظام سے قبل عدالتی نظام کچھ اور تھا لہٰذا عدالتیں سماجی سیاسی اور معاشی حالات کو بھی مدنظر رکھتی تھیں اور فریقین بھی کم سے کم جھوٹ بولنے پر زور دیتے تھے مگر انگریزی عدالتی نظام میں ایسا کچھ نہیں تھا۔اس نظام میں اگر ملزم عدالت کے سامنے یہ کہہ دے کہ میں نے فلاں جرم کیا ہے تو اس کو سزا ہو جاتی ہے خواہ وہ لاکھ سیاسی یا سماجی یا معاشی حالات کی دہائی

دے۔

چنانچہ برطانوی دور میں جتنے بھی سیاسی مقدمات ہوئے ان کی سماعت کبھی بھی سیاسی مقدمے کے طور پر نہیں ہوئی۔ الٹا سیاسی جدوجہد کرنے والوں کو ان مقدمات میں اپنی صفائی کے لئے بہت جھوٹ بولنا پڑتا مثلاً یہ کہ میں نے فلاں جرم کیا ہی نہیں، میں موقع پر موجود نہیں تھا یا پھر جھوٹے گواہان کا سہارا لینا پڑا۔ اب ایک شخص عدالت سے باہر جو موقف اختیار کرتا تھا عدالت کے اندر اس کی نفی کر دیتا تھا۔ اگر عدالت کے اندر بھی یہ کہے کہ میں نے فلاں کام انگریز حکومت سے سیاسی مخالفت کی بنیاد پر کیا ہے تو وہ برملا اقرار جرم تھا اور سزا سے بچنا محال تھا۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں منافقت پیدا ہونے لگی۔ دوسرے ان حالات میں یہ پتہ چلانا مشکل ہو گیا کہ کونسا معاملہ سیاسی ہے اور کونسا سیاسی نہیں ہے۔ اب عدالتیں بھی اپنے فیصلوں میں یوں تحریر نہیں کرتیں تھیں کہ "فلاں ملزم نے سیاسی کارکن کی حیثیت سے احتجاج کرتے ہوئے فلاں جرم کیا۔" یوں عدالت میں سیاسی مقدمات کی حیثیت بھی سیاسی نہ رہی اور یہی وجہ ہے کہ نوآبادیاتی دور میں عدلیہ کے کردار کا جائزہ لینا ایک کافی مشکل کام ہو گیا ہے۔ البتہ اس دور میں عدلیہ کے کچھ مقدمات میں ایسے فیصلے مل جاتے ہیں جن سے ان کے کردار کی عکاسی ہوتی ہے اور جو یقیناً امتیازی اور غیر شفاف تھا۔

ہندوستان میں برطانوی عدلیہ کی اکثر سزائیں سنگین اور غیر مساوی رہی ہیں اور اسی طرح سے جانبدارانہ فیصلوں کی مثال بھی سامنے آتی ہے۔ ابتدائی برطانوی عدالت جسے میئر کی عدالت کہتے تھے اس نے حملے کے مقدمے میں ایک ہندوستانی ملزم کو ایک ماہ تک گاڑی کے پیچھے باندھ کر نو زنجیروں والے کوڑے سے سزا دینے کا فیصلہ سنایا۔ نقب زنی کے ایک ملزم کو سزائے موت سنا دی گئی۔ جعل سازی کے ایک ملزم کو سزائے موت دی گئی۔ سپریم کورٹ آف کلکتہ نے ایک انگریز سپاہی کو ایک سال قید اور بیس روپے جرمانے کی سزا دی۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے ذاتی دشمنی پر ایک دوسرے سپاہی کو مار ڈالا تھا۔ ایک اور انگریز سپاہی جس نے باکسنگ میں ایک دوسرے سپاہی کو قتل کر دیا اسے ایک ہفتہ قید اور ایک روپیہ جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ لیفٹیننٹ چارلس رائس جس نے کانپور میں ایک دوسرے افسر کو ذاتی دشمنی پر قتل کر ڈالا تھا اسے ایک سو روپیہ جرمانہ اور ایک ماہ قید کی سزا سنائی گئی۔ (49) مقدمہ ملکہ معظمہ بنام ڈوما بائیدہ میں مدراس ہائیکورٹ نے قرار دیا کہ

یورپی اور امریکی ملزمان کو کالے پانی کی سزا نہیں دی جا سکتی بلکہ ان کو صرف Penal Servitude کی سزا دی جا سکتی ہے۔(50) جبکہ ہندوستانیوں کو کالے پانی کی سزا دی جا سکتی تھی۔ نیز ہندوستانیوں کی 7 سال سے زائد قید کو بھی کالے پانی کی سزا میں بدلا جا سکتا تھا۔(51) بال گنگا دھر تلک جنہیں دفعہ Cr.P.C 124-A کے تحت حکومت کے خلاف تحریر و اشاعت پر 6 سال تک کی سزا دی گئی تھی۔ اس کو پریوی کونسل نے اپیل کرنے کی اجازت ہی نہیں دی۔(52)

نند کمار کا مقدمہ بھی قابل ذکر ہے۔ نند کمار بنگال کا ایک بااثر شخص تھا جس نے کلکتہ گورننگ کونسل کے اراکین کی اکثریت کی حوصلہ افزائی پر وارن ہیسٹنگز کے خلاف رشوت خوری اور بدعنوانی کے الزامات رکھے۔ ہیسٹنگز کو یہ بات ناگوار گزری، اس کے ایماء پر ایک شخص موہن پرشاد نے چند روز بعد ہی نند کمار پر جعل سازی کا الزام لگا کر سپریم کورٹ میں دادرسی کی۔ سپریم کورٹ نے نند کمار کو مجرم قرار دے کر سزائے موت دے دی۔ تمام مورخین اور قانون دان اس بات پر متفق ہیں کہ نند کمار کو وارن ہیسٹنگز کی راہ سے ہٹانے کی غرض سے جھوٹا مقدمہ بنایا گیا۔ اس وقت مقدمے کی سماعت کرنے والا سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ایمپے ہیسٹنگز کا بہت قریبی دوست بھی تھا۔ اس مقدمے میں نند کمار کی جانب سے آنے والے صفائی کے گواہان پر خود ججوں نے بہت سخت جرح کی۔ پھر پریوی کونسل میں نند کمار کی اپیل کی درخواست کو بھی سپریم کورٹ نے خارج کر دیا۔ 1728 کا ایکٹ کے جس کے تحت نند کمار کو سزا دی گئی وہ کلکتہ میں باضابطہ طور پر نافذ نہیں ہوا تھا۔ نند کمار کا مقدمہ شروع سے ہی جانبدارانہ تھا۔(53)

کمال الدین علی خان جو ہگلی کا ایک کسان تھا اسے کلکتہ ریونیو کونسل کی طرف سے مالگزاری کی عدم ادائیگی پر بلا ضمانت قید کر لیا۔ کمال الدین کا موقف تھا کہ اس پر کوئی رقم واجب الادا نہیں ہے۔ ان معاملات میں عموماً ضمانت ہو جاتی تھی لیکن اس کی ضمانت نہیں لی گئی۔ سپریم کورٹ نے ماتحت عدالت کے فیصلے کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے کمال الدین کی ضمانت لے لی۔(54) سروپ چند کے مقدمے میں سروپ چند کے ذمہ کلکتہ کی گورننگ کونسل کی کچھ رقم واجب الادا تھی جس سے سروپ چند انکاری تھا لیکن کونسل نے سروپ چند کو قید کر لیا۔ اس پر سپریم کورٹ کو مداخلت کرنی پڑی اور اس نے کہا کہ کونسل کو کوئی حق نہیں کہ وہ اپنے معاملے میں خود ہی جج بن جائے۔(55)

یہ کچھ مثالیں تھیں۔ ابھی اس بات پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے کہ نوآبادیاتی عہد میں برطانوی عدالتوں کے فیصلے اوراحکامات کس حد تک درست تھے۔

اگرچہ نوآبادیاتی دور میں ریاستی جبریت کے کرتا دھرتا انگریز تھے مگر وہ اتنی بڑی تعداد میں نہیں تھے کہ کروڑوں ہندوستانیوں کو قابو کر سکتے۔ اس لئے انگریزوں نے عدلیہ انتظامیہ اور مقننہ تینوں سطحوں پر اپنی مرضی کے مقامی لوگوں کو جگہ دی۔ انہوں نے ہندوستانیوں میں ایسا طبقہ پیدا کر لیا جو کہ مڈل کلاس کہلایا اور جب انگریز ہندوستان چھوڑ کر گئے تو اسی مڈل کلاس کا اعلیٰ حصہ ہندوستانی طبقہ اعلیٰ بن کر حکمران بن گیا۔ انتظامیہ میں سب سے مؤثر کردار پولیس اور فوج کا تھا جس نے حکمران کے ہر اشارے پر ''جو حکم'' ہی کہنا تھا۔ پولیس اور فوج کی صرف اعلیٰ قیادت انگریز تھی باقی تمام عام سپاہی اور درمیانے درجے کے افسران ہندوستانی ہی ہوتے تھے۔ ان ہندوستانیوں کا کردار پورے نوآبادیاتی دور میں نہایت گھناؤنا رہا ہے۔ انہوں نے اپنے ہم وطنوں پر بغیر سوچے سمجھے گولیاں چلائیں اور ان کا استحصال کیا۔ نوآبادیاتی اثرات جو آج ہمیں نظر آتے ہیں ان کے ذمہ دار اگر ایک جانب انگریز ہیں تو دوسری جانب وہ ہندوستانی بھی ہیں جو Yes Men بنے رہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے یہ ہندوستانی انگریزوں کی استحصالی پالیسی کے آلہ کار کیونکر بنے رہے۔ تو اس کا جواب یوں ہے کہ انگریزوں نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہندوستانی صنعت وتجارت اور دیگر ذرائع معیشت کو تباہ کر کے اپنی معیشت مضبوط کی اور ذرائع پیداوار اپنے ہاتھ میں لے لئے یوں تمام تر ملازمتوں اور سرکاری ذرائع آمدنی پر ان کا غلبہ ہوگیا۔ اب وہ ہی لوگوں کو تسلی بخش روزگار فراہم کرتے تھے جبکہ ہندوستان کے مقامی حکمران اپنی کمزور معیشت کی وجہ سے ایسا کرنے سے قاصر تھے۔ اسی چیز نے نوآبادیاتی نظام کے سپاہیوں، فوجیوں، ججوں اور دیگر سرکاری ملازمین کو انگریزوں سے وفاداری پر راغب کیا۔ انگریز جاتے ہوئے اقتدار ان ہی لوگوں کے سپرد کر گئے جو آج بھی ہمارے سروں پر مسلط ہیں۔

# حوالہ جات


1. *Indian Penal Code.* 1898, (I.P.C,) Sec, 350.
2. *The First Indian War of Independence* 1857-1859, by Marx and Engels, p. 30. Progress Publishers, Moscow, 1978.
3. *History of the Freedom Movement in India* by R.C.Majumdar vol: I, p, 89-90. Book Traders, Lahore.
4.

5. *Constitutional History of India* by R.R.Sethi and Vidya Dhar Mahajan, p. 52, Published by S. Chand & Co. Delhi 1956.

6- انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ از علامہ عبداللہ یوسف علی مطبع کریم سنز پبلشرز کراچی۔ 1967 صفحہ نمبر 298۔

7. *Constitutional History of India* p. 54-58.
8. *Ibid.*, p. 64-66.
9. *Ibid.*, p. 113.
10. *History of Freedom Movement in India* Vol. IV, p. 493.
11. *The Indian Penal Code,* 1860. Sec: 53. Compiled by D.E.Cranenburgh, Published by Law Publishing Press, Calcutta. 1902.

12. *Ibid.*, Sec: 132.
13. *History of Freedom Movement in India.* Vol. II. p. 61-87.
14. *Ibid.*, p. 256.
15. *Ibid.*, p. 256.
16. *Ibid.*, p. 256.
17. *Ibid.*, p. 256.
18. *Ibid.*, p. 257.
19. *Ibid.*, p. 257.
20. *Ibid.*, p. 260-261.
21. *Ibid.*, p. 490.
22. *Ibid.*, p. 490.
23. *Ibid.*, p. 491-495.
24. *Ibid.*, Vol. III, p. 2, 16-42.
25. *Ibid.*, p. 131-137, 190-200.
26. *Ibid.*, p. 342.
27. *Ibid.*, Vol. IV, p. 490-492, 500-502.

28- علم سیاست از ارسطو مطبع فکشن ہاؤس لاہور 2004ء۔

29. *I.P.C.* Sec, 326.
30. *I.L.R*, 22 Bom 112.

31- ہندوستان کی قانونی تاریخ از ایم پی جین جلد دوم ص616-622۔ مطبع ترقی اردو بیورو نئی دہلی 1982ء۔

32. *Code of Civil Procedure*, 1882. ed. by Hukm Chand. 1898. Bombay. p. 4-6.

33- ہندوستان کی قانونی تاریخ جلد دوم ص1025-1069۔

34. *Ibid.*, p. 986-991.

35. *Ibid.*, p. 1009.
36. *Cr.P.C.* 1861, Sec, 325, Cr.P.C. 1872 Sec, 241, Cr.P.C. 1882, 275.
37. *I.L.P.* 19 Mad 483.
38. *I.P.C.* Sec, 56.
39. *Cr.P.C.* Sec, 34-A.
40. *Cr.P.C.* Sec, 111; Cr.P.C. p. 233.
41. *Cr.P.C.* Sec, 275.
42. *Cr.P.C.* Sec, 326.
43. *Cr.P.C.* Sec, 443.
44. *Cr.P.C.* Sec, 443(3).
45. *Cr.P.C.* Sec, 528-A(3).

46- ہندوستان کی قانونی تاریخ۔ص1089تا1094۔

47. *Cr.P.C.* (cited above) p. 56.
48. *Cr.P.C.* Sec, 54-55.

49- انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ۔ص94-95۔

50. *I.L.R.* 19 Mad. 483.
51. *I.P.C.* Sec. 59.
52. *I.L.R.* 22. Bom 112.

53- ہندوستان کی قانونی تاریخ۔ص187-199۔

54. *Ibid.*, p. 239.
55. *Ibid.*, p. 197-199.

❁❁❁❁❁

# فرقہ واریت کی ترقی میں نوآبادیات کا کردار

پروفیسر ریاض صدیقی

1947ء میں ملک گیر ہندو مسلم دنگوں کے طوفان کے سائے میں برصغیر کا بٹوارہ ہو گیا تھا۔ موئین جوداڑو و ہڑپا کی عظیم الشان شہری تہذیب سے لے کر 1857ء سے پہلے تک اس نوعیت کا کوئی واقعہ سات ہزار برسوں کی تاریخ کے صفحات پر رقم نہیں ہوا تھا۔ بٹوارے کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے حکمرانوں نے اپنی سیاسی پالیسی کی بنیاد ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور دشمنی پر رکھی تھی جس کو ایک پختہ نقطہ نظر کے تناظر میں بروئے کار لانے کے لئے ضروری تھا کہ کٹر پنتھی علمائے سُو کی سرپرستی کی جائے۔ اس سرپرستی کا بروقت فائدہ اٹھاتے ہوئے ان علمائے سُو اور ہندوستان میں کٹر پنتھی ہندو قوتوں نے بھی قومی سیاست، اقتدار کے ڈھانچے، سرکاری انتظامیہ، ذرائع ابلاغ اور تعلیم کے شعبوں سے اپنا منافع وصول کیا تھا۔ اردو مسلمانوں کے مداح، جمہوریت کے علم بردار اور سیکولرازم کے پرچارک فیبین سوشلسٹ جواہر لال نہرو نے راشٹریہ سیوک سنگھ کے ہاتھوں گاندھی کے قتل کے بعد سنگھ پریوار کو بہت سی رعایتیں دی تھیں۔ نہرو، مولانا آزاد اور رفیع احمد قدوائی پر سنگھ پریوار کے حامی ہندو کانگریسی وزراء پوری طرح حاوی تھے۔ 1950ء میں جب بابری مسجد کے اندر مورتیاں رکھ دی گئی تھیں تو نہرو نے چپ سادھ لی تھی۔ ہندوستان کے آئین میں مذہبی فرقہ واریت کے لئے ایک چور دروازہ موجود تھا۔ یہ آئین مذہب و ریاست اور مذہب و سیاست کے مابین علیحدگی کا ضامن نہیں ہے بلکہ اس نظریئے کو جگہ دیتا ہے کہ "سرودھرم سمبھاؤ۔"

اس موضوع کو آگے بڑھانے سے پہلے ایک ایسے شہرہ آفاق مارکسی دانشور کی رائے کا ذکر

ضروری ہے جس پر تنقید کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ان کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ حمزہ علوی کا موقف کہ قائداعظم ایک سیکولر اور روادار ریاست کے اپنے موقف پر ثابت قدم تھے، مسلم لیگ ہمیشہ ہی ایک سیکولر سوسائٹی کی داعی تھی اور اس لئے ان دنوں کے تمام ملا ان کے دشمن تھے ہمیں حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ بٹوارے کے بعد مسلم لیگ کے وزیراعظم اور دوسرے تمام وزراء ظاہری طور پر سیکولر ہی دکھائی دیتے تھے۔ اسلام ان کے عمل میں نہیں تھا پھر انہوں نے قائداعظم کے موقف (11-اگست 1947ء) کو کیوں نظرانداز کر دیا تھا۔ ملا بھی جیسا کہ حمزہ صاحب کا موقف ہے ان کے مخالف تھے۔اس کے باوجود وزیراعظم نے اپنے اقتدار کو تحفظ دینے کی سیاست اور علاقوں میں پیدا ہونے والے تضادات پر قابو پانے کے لئے اسلام کو اپنی سیاست کا آلہ کار بنایا حالانکہ ان مسائل پر جمہوری اور سیکولر طریقوں سے قابو حاصل کرنا زیادہ آسان تھا۔ زیر نظر مضمون میں آگے جو تاریخی تناظر آئے گا اس میں اسی فرقہ واریت کے مسئلے کا مرکز تلاش کیا گیا ہے۔ برصغیر یا اب جس کے لئے دکنی ایشیا کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے تاریخ میں کبھی یک قومی، یک لسانی اور یک مذہبی ریاست نہیں رہا۔ کثیرالقومیتی، کثیراللسانی اور کثیرالمذہبی ریاست تو فطری تضادات ہی کا مجموعہ ہوتی ہے۔اس قسم کی ریاست میں جب مختلف علاقوں کے عوام اپنی خواہش اور اپنے ارادے سے وفاقیت کے ساتھ بندھن قائم کرتے ہیں تو اس جڑت کے استحکام کی بنیاد لوگوں کے اقتصادی وکاروباری مفادات، پیداواری رشتے اور منڈی کے تقاضے ہوتے ہیں جو کہ اتنے ناگزیر اور ترجیحی ہوتے ہیں کہ ان کی وجہ سے رابطے کی ایک ملک گیر زبان بن جاتی ہے۔ یہ کھچڑی زبان مختلف زبانیں بولنے والی قومیتیوں کی زبانوں کے مابین لین دین سے بنتی ہے اس لئے عوام نہ اسے بیرونی سمجھتے ہیں اور نہ اجنبی (اردو یا ہندی) اس قسم کی وفاقی ریاست میں موجود ثقافتی ولسانی اور نسلی وعلاقائی تضادات سے نجات حاصل کرنے کا ایک حل تو یہ ہے کہ وفاق کی تمام اکائیاں آزاد وخودمختار ملک بن جائیں جیسے کہ 1971ء میں بنگلہ دیش بن گیا تھا۔ انسانی حقوق اور قوموں کے حق خودارادیت کے آفاقی اصول کے مطابق یہی سب سے بہتر حل بھی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے ریاست کی سب سے بڑی اکثریت یا تو دوسری اقلیتوں کو اپنے مذہب میں شامل کرے یا پھر اسے ریاست کے حدود سے نکال باہر کرے اور اگر دونوں صورتیں ممکن نہ ہوں تو بڑی اکثریت چھوٹی اقلیتیوں کا قتل عام اور نسل کشی کے ذریعہ خاتمہ کر دے۔

1860-1947ء کے دوران برطانوی سامراج نے ہندوستان کو مذہبی، نسلی، علاقائی اور لسانی فرقہ واریت کی ایسی فاشسٹ فضا میں دھکیل دیا تھا جہاں کانگریس اور مسلم لیگ نے مسئلے کا حل اسی فضا سے استفادہ کر کے ڈھونڈا تھا۔

اب اگر اس مسئلے کو دوسرے رخ سے دیکھیں جس کو حمزہ صاحب نے بنیاد بنایا ہے اور ان کا موقف غلط بھی نہیں ہے تو ہم یہ ماننے پر تیار ہیں کہ کانگریس اور مسلم لیگ اپنے اپنے اقلیتی طبقوں کے اقتصادی و کاروباری مفادات کو پورا کرنے کے لئے مذہبی اور لسانی فرقہ وارانہ فاشزم کے دستیاب رجحان کو اپنی سیاست میں استعمال کر رہے تھے تاکہ کامیابی کی منزل تک پہنچ جائیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب سیاست میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے فرقہ وارانہ فاشزم کے موکلوں کو قابو میں کیا جائے گا تو پھر کامیابی کے بعد ان کو راستے سے کس طرح ہٹایا جائے گا۔ وہ تو پھر جان ہی لیں اس کی قریبی مثال عالمی سطح پر اسلامی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پرویز مشرف صاحب کا امریکی سامراج سے اتحاد ہے مگر یہ اتحاد بھی موکلوں پر قابو پانے میں بالکل ناکام ہو گیا ہے اور وہ خود ایک حملے سے بال بال بچ چکے ہیں فرقہ وارانہ فاشزم کے تعاون سے سیاسی فائدہ تو حاصل ہو گیا مگر 1947ء کے بعد گاندھی، نہرو اور قائداعظم تینوں نے خود کو بے بس محسوس کیا کیونکہ فرقہ واریت کے چھیڑے موکل جمہوری اور عوامی قوتوں پر حاوی آ چکے تھے۔ مذہبی فرقہ واریت نے گاندھی کو اور علاقائی و لسانی فاشزم نے لیاقت علی خاں کو قتل کر دیا تھا۔ اس قسم کی فرقہ وارانہ فاشزم کا خیال ہندوستان پر آٹھ سو برسوں تک راج کرنے والے مسلمان بادشاہوں کو نہیں آیا تھا۔

یہ بھی سوچنے کا نکتہ ہے کہ بٹوارے سے پہلے تک جیسا کہ حمزہ صاحب نے لکھا ہے ملا مسلم لیگ کے دشمن تھے اور یہ حقیقت ہے کہ مسلمان علماء کی بڑی جماعتیں مع جماعت اسلامی مسلم لیگ اور اسلامی ریاست پاکستان کے مخالف ہی رہے تھے۔ پھر کیا ہوا کہ بٹوارے کے بعد ایک سال کے اندر اندر پاکستان میں جمعیت العلمائے پاکستان اور جماعت اسلامی کا اتحاد قائم ہو گیا اور پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے لئے ان کے دباؤ کو جاگیردار حکمرانوں اور ان کے بیوروکریٹس نے مان لیا۔ قرارداد مقاصد کا قومی اسمبلی سے منظور ہو جانا ان کٹر پنتھی علماء کی جماعتوں کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ ہندو دشمنی اور ہندوستان سے نفرت کی سیاسی پالیسی کو بھی تقویت

ان ہی جماعتوں نے پہنچائی تھی۔ مورخوں نے ان ہی کے نقطہ نظر کو بنیاد بنا کر تاریخی بیانئے مرتب کئے اور تعلیمی نصابات میں بھی ان ہی کے نقطہ نظر کو نمایاں کیا گیا۔ برصغیر کے اجتماعی ماحول کو فرقہ وارانہ فاشسٹ رجحان سے کس نے آلودہ کیا تھا یا بقول میرؔ

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہب عشق اختیار کیا

اس کافر کو کھوجنے سے پہلے یہ حقیقت ذہن میں رکھئے کہ مذاہب اپنی حقیقی تعلیمات کے تناظر میں پوری طرح سیکولر یعنی غیر فرقہ وارانہ ہوتے ہیں۔ ان کی ابتدا ہی غریب عوام کی اکثریت کو ظالم و جابر قوتوں سے نجات دلانے کے لئے جدوجہد سے ہوئی تھی۔ میثاق مدینہ میں بھی مدینہ کے شہری صرف مسلمان نہیں قرار دیئے گئے ہیں بلکہ وہاں آباد ہر شہری کے لفظ امت کا استعمال ہوا ہے۔ بعد کے زمانے میں علمائے سُو نے بادشاہوں اور امراء کے مفادات کو تحفظ دینے کے لئے امت کے لفظ کو مسلمانوں تک ہی محدود کر دیا تھا۔

برصغیر میں مذہبی و لسانی فرقہ واریت کو سیاست اور انتظامی شعبوں کے تانے بانے میں پرونے کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں برطانوی حکام نے شروع کیا تھا اور اسے ملک گیر بنیاد فراہم کرنے کے لئے 1860ء تک تسلسل کے ساتھ جٹ کر کام کیا تھا۔ یہاں اگر کثیر الاقومیت کثیر اللسانیت اور دو مختلف مذاہب کا پھیلاؤ پختہ اور طاقتور نہ ہوتا تو امریکہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی طرح نو آبادیاتی سامراجی مختلف زبانوں، عقائد اور ثقافتوں میں بٹے ہوئے قبائل کا قتل عام کر کے ان کی نسلوں کا اسی طرح صفایا کر دیتے اور یورپ سے اپنے شہریوں کو لا کر برصغیر میں بسا دیتے اور پورے برصغیر میں اول الذکر کی طرح صرف انگریزی بولنے والی آبادی ہوتی۔ ہندوستان میں اس سامراجیت نے فرقہ واریت کا جو بیج بویا تھا 1857ء کے بعد اس کی فصل تیار ہو گئی تھی۔ اسی سیاست کے ذریعہ بعد میں انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ نے اپنے سیاسی مشن کی کامیابی کو یقینی بنایا تھا جس کے نتیجے میں ہندو ہندوستان اور اسلامی پاکستان جیسی ریاستیں بنی تھیں۔ دونوں ہی دیسوں کی غریب ننگی بھوکی اکثریت چھپن برسوں سے اس مذہبی لسانی نسلی اور علاقائی فرقہ واریت کی اذیت جھیل رہی ہے۔

کیا 1857ء سے پہلے کی تاریخ میں یہ صورت تھی؟ اس کا جواب نہیں میں ملتا ہے حالانکہ

اس ماضی کا برصغیر پسماندہ، روایت پرست اور مذہبی معاملات میں کٹر تھا۔ سماج ان پڑھ تھا اور جو پڑھے لکھے تھے انہوں نے بھی پرانی روایتی قسم کی تعلیم پائی تھی۔ اس کے باوجود لسانی اور مذہبی فرقہ واریت سماجی وسیاسی معاملات اور اجتماعی تعلقات میں نہیں تھی۔ مذہبی جھگڑے اور اختلافات ہندو اور مسلمانوں کے اپنے اپنے دائروں کے اندر رہتے تھے۔ بیسویں صدی کے ہندوستان میں جدیدیت، جدید تعلیم، صنعت کاری اور سائنسی سہولتوں کا رواج ہو گیا تھا۔ ترقی یافتہ جمہوری مغرب سے بھی اس کے رابطے ہو گئے تھے اور مقامی طالبعلم آکسفورڈ، کیمبرج اور لنکن ان تک پہنچ گئے تھے۔ ہندوستان کی جدید تعلیم یافتہ نسل بھی مغربی جدیدیت، روشن نظری اور حقیقت پسندی سے متاثر تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنما بھی کیمبرج، آکسفورڈ اور لنکن ان کے تربیت یافتہ تھے۔ ان حالات میں فرقہ وارانہ لسانی و مذہبی تشدّد کے رجحان میں اس قدر بڑھوتری یقیناً باعث حیرت تھی۔ اس سے بھی زیادہ اچنبھے کی بات تو یہ ہے کہ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی سے لے کر اس وقت تک صنعت وٹیکنالوجی اور کاروبار و عالمی روابط کی ترقی میں جو چمتکار ہوتی رہی ہے، جمہوری حقوق کا آہنگ بلند ہوا ہے اور تمام دنیا کی قوموں کی ایکتا کا نمائندہ اقوام متحدہ بنا اسی رفتار کے ساتھ دنیا کے تمام نیم ترقی پذیر اور ترقی پذیر ملکوں میں لسانی، مذہبی، نسلی اور علاقائی فرقہ واریت کا بھوت منڈلانے لگا اور اسی فرقہ واریت کے ذریعہ امریکی اور مغربی سامراجیوں نے سویٹ یونین کا کام تمام کیا، امریکہ اور یورپی علاقوں میں امن کی فضا قائم کی اور ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارہ قائم کر لیا۔

ہندوستان میں مذہبی و لسانی، علاقائی و نسلی اور ثقافتی فرقہ واریت کے بہت ہی غیر مؤثر رجحان کو سیاسی واقتصادی اور سامراجی مفادات حاصل کرنے کے لئے استعمال کی لازمی روایت کا زہر برطانیہ کی نوآبادیاتی سامراجیت لے کر آئی تھی۔ سترہویں صدی میں برطانوی، فرانسیسی اور پرتگالی سامراجیوں نے ہندوستان کے قیمتی وسائل کو لوٹنے اور وہاں کے دولت کے انبار کو یورپی ملکوں کی طرف منتقل کرنے کے لئے فرقہ وارانہ اور نسلی و علاقائی رجحانات کی مختلف قسموں کو اپنی قبضہ گیری کی سیاست کا آلہ کار بنایا تھا۔ نوآبادیاتی سامراجیت کا یہ بہاؤ سولہویں صدی میں یورپی ملکوں سے شروع ہوا تھا چنانچہ ان قوتوں نے ویاپاری تعلقات کے سائے میں شمالی وجنوبی امریکہ، کیریبین جزائر، افریقی اور ایشیائی ملکوں پر قبضے جما لئے تھے۔ اس زمانے میں ڈچ، فرانسیسی اور

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنیوں نے وہی کردارادا کیا تھا جو 1991ء کے بعد حکمراں امریکی سامراج کے اداروں ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن، ورلڈ بنک، آئی ایم ایف اور گلوبلائزیشن کے منصوبے نے ادا کیا ہے۔ اس سے پہلے کی تاریخ میں نوآبادیاتی سامراجیت جیسا کوئی نظام موجود نہیں تھا۔ دوسرے ملکوں پر طاقت کے ذریعہ قبضہ کرنے والے وہاں کے سیاسی، اقتصادی، مالی اور دوسرے دولت فراہم کرنے والے شعبوں پر اجارہ قائم کرنے کے بعد اسی دھرتی سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے تھے، ان کی تہذیب میں ڈھل جاتے تھے، ان کی زبانوں پر مہارت حاصل کرتے تھے اور مقامی خاندانوں میں بیاہ کر کے رشتے استوار کر لیتے تھے۔ وہ چونکہ مقامی اجارہ داروں اور دیاپاریوں کے مفادات کو بھی پورا کرتے تھے اس لئے ریاستی امور میں ان کا تعاون شامل رہتا تھا۔ ہندوستان پر حکومت کرنے والے مسلمان بادشاہوں نے بھی یہی کردارادا کیا تھا اور اپنے اسی کردار کی وجہ سے ہندوستان کے لگ بھگ پچاسی فی صد ہندوؤں نے جو اپنے دھارمک معمولات میں ہمیشہ ہی کٹّر رہے تھے مسلمان بادشاہوں کی حکمرانی کے ساتھ تعاون کیا۔ مسلمان بادشاہوں نے فرقہ وارانہ حسیّت کی مختلف قسموں کو اپنے اقتدار کے مفاد میں ہوا دینے سے گریز کیا تھا۔ ان کو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ نہ تو انہوں نے ہندوستان کی بے پناہ دولت کو اپنے آبائی ملکوں کی طرف منتقل کیا اور نہ ان کے ذہن میں اپنے آبائی علاقوں کی طرف واپس جانے کا کوئی تصور تھا۔ نوآبادیاتی سامراجیت کی طرح ان بادشاہوں نے نہ تو ہندو اکثریت کے دھرم اور ان کے دھارمک معاملات میں مداخلت کی اور نہ اپنی طاقت اور حکمراں حیثیت کا فائدہ اٹھا کر ان کو مسلمان بنانے کی کوشش کی۔ وہ ہندوستانی عوام کے نمائندہ ہونے کی بنا پر ہندوؤں کی مذہبی رسومات اور تہواروں میں حصہ لیتے تھے۔ اکثر امراء ہندوستانی عورتوں سے بیاہ کر لیتے تھے۔ امیر خسرؔو کے باپ نے ایک ہندوستانی عورت سے بیاہ کرلیا تھا۔ ان کو اپنی ہندوستانی ماں پر ناز تھا چنانچہ وہ خود کو ہندوستانی ترک کہتے تھے اور ہندی کو اپنی ماں بولی سمجھتے تھے۔

"ترک ہندستانیم من ہندوی گویم جواب"

اکبر نے مسلمانوں کے خلاف ہندوستان کی سب سے طاقتور اور جانباز راجپوت قوم کو جیتنے کے لئے ہندو راجپوت جودھابائی سے بیاہ کرلیا اور یوں مغل خاندان راجپوتوں کی سسرال بن گیا

تھا۔ اکبر کے بعد آنے والے مسلمان بادشاہوں نے راجپوتوں کے ساتھ اپنے خاندانی رشتوں کو نبھایا۔ حتیٰ کہ بڑھاپے میں اورنگ زیب نے بھی راجپوت اودے پوری سے بیاہ کرلیا تھا۔ یہ دعویٰ یقیناً مبالغہ ہوگا کہ مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں ہندو مسلم تضاد نہیں تھا مگر انہوں نے اس دبے ہوئے تضادات کے جن کو بوتل میں بند کر کے اسے سر بہ مہر کر دیا تھا۔ ایک مشترک ہندوستانی تہذیب اور سماج میں ہندو اکثریت اور مسلمان اقلیت نے اپنے مذہبی تشخص کو بہرحال قائم رکھا تھا تاہم مسلمان سماج نے ہندو اور ہندو سماج نے مسلمانوں کے اتنے گہرے اثرات بھی قبول کئے تھے کہ ہندوستانی اسلام عربی اسلام سے یکسر مختلف ہوگیا تھا اور یہ اختلاف بٹوارے کے بعد پاکستان کے مسلمان سماج میں آج تک اسی طرح دائم و قائم ہے۔ بٹوارے کے بعد دونوں ملکوں میں دولتمند بالائی سطح پر جو تبدیلی رونما ہوئی ہے وہ ہندوستان کی ہندو اور پاکستان کی اسلامی تہذیب کی طرف واپسی نہیں ہے گو کہ پروپیگنڈہ یہی کیا جاتا ہے۔ یہ اصل میں انگریزی زبان اور امریکی و مغربی تہذیب کی پیروی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو و مسلمان عوام کی بڑی اکثریت اور دولتمند بالائی طبقے کی اقلیت کے درمیان تہذیبی اور سماجی فرق کا فاصلہ بہت زیادہ ہے اور اب چھپّن برس کی نفرت و دشمنی کے بعد دونوں ملکوں کے حکمراں بالائی طبقے کو اس حقیقت کا احساس ہوا ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام کی اکثریت کی مشترک تہذیبی و تاریخی اور سماجی و لسانی جڑت اسی طرح برقرار ہے اور دونوں ملکوں کے عوام بھائی چارے کے جذبے کے تحت مل جل کر رہنا چاہتے ہیں۔ چند مسلمان بادشاہوں نے مذہبی کٹر پنتھیت کا مظاہرہ ضرور کیا تھا مگر ان کے بعد آنے والے بادشاہوں نے اپنی سیکولر پالیسی کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے ان کے اثرات کو زائل کر دیا تھا اسی طرح بعض کٹر پنتھی مسلمان علمائے سُو نے اپنی حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہندو دشمنی کی تحریک پیدا کی تھی مگر بادشاہوں نے اسے بھی سختی کے ساتھ دبا دیا تھا۔ آبادی کے توازن میں بہت زیادہ فرق کی وجہ سے جو معروضی حالات ہندوستان میں تھے سیکولر انداز نظر ہی کے متقاضی تھے۔ مسلمان بادشاہوں اور امراء نے ان معروضی حالات کو سمجھنے میں غلطی نہیں کی۔ مالیات اور ویاپار پر ہندوؤں کی اجارہ داری میں بھی بادشاہوں نے مداخلت نہیں کی چنانچہ نہ جانے کتنے گجراتی ہندو، شکارپور کے سندھی ہندو اور حیدرآباد سندھ کے ہندو افغانستان، وسطی ایشیا اور سنکیانگ کے مسلمان علاقوں میں جاکر آباد ہوگئے تھے اور وہاں اپنا ویاپار پھیلا لیا تھا۔ اس طرح

ان کے ذریعہ باہر کے ملکوں کا سرمایہ ہندوستان آتا تھا۔ انیسویں صدی تک گلوبل تجارت اور منڈیاں ان ہندوستانی کاروباریوں کے ہاتھ میں تھیں۔ بادشاہوں میں صرف محمود غزنوی نے نوآبادیاتی سامراجیت کا مظاہرہ کیا تھا مگر اس نے بھی نہ تبلیغ اسلام میں دلچسپی لی تھی اور نہ ہندوؤں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کی بت شکنی میں مذہبی جذبہ نہیں اقتصادی مفاد کارفرما تھا کیونکہ اسے تو سونے سے ڈھکے ہوئے بتوں کا سونا درکار تھا۔ وہ اس سونے کے انبار کو جمع کر کے اسے غزنی پہنچا دیتا تھا۔ اسی دولت کے ذریعہ اس نے اپنی شان دار راج دھانی غزنی کی تعمیر کا خواب پورا کیا تھا۔ اس کے بعد آنے والے مسلمان بادشاہوں نے خود کو ہندوستان کی دھرتی میں ضم کر لیا تھا۔ یہیں رہے یہیں مرے اور یہیں دفن ہوئے۔ انہوں نے ہندوستان کے سرمائے کو بھی ہندوستان سے باہر نہیں جانے دیا۔ نوآبادیاتی سامراجیوں کے برعکس ہندوستانی مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ دونوں کی رہائشی بستیاں مشترک تھیں۔ انگریزوں کی طرح انہوں نے مقامی آبادی سے دور اپنی علیحدہ بستیاں نہیں بسائی تھیں جہاں جلی حروف میں لکھا گیا ہو کہ اس علاقے میں ہندوؤں اور کتوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ مسلمان بادشاہوں اور ہندو رجواڑوں کے مابین لڑائیاں بھی ہوئیں مگر ان کی وجہ مذہبی اختلاف نہیں بلکہ سراسری سیاسی و اقتصادی اور دفاعی مفادات تھے۔ ہندو رجواڑوں کی انتظامیہ میں مسلمان بھی ہوا کرتے تھے۔ مرہٹوں اور شیعہ دکنی قوتوں کے خلاف اورنگ زیب کی لڑائی بھی سیاسی اقتدار کی ملک گیر ایکتا کے قیام کی جنگ تھی۔ ان لڑائیوں کی کمان جسونت سنگھ کے ہاتھ میں تھی مرہٹہ سرداروں کی فوج اور انتظامیہ میں بھی مسلمان موجود تھے۔ یورپی مورخوں نے ان لڑائیوں پر بھی شیعہ دشمنی اور ہندو دشمنی کا رنگ چڑھا دیا تھا۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں مرہٹوں نے دہلی کے اطراف اپنے قدم جما لئے تھے تو شاہ ولی اللہ دہلوی کے فرقہ وارانہ اندازِ نظر نے ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کے تابوت میں کیل ٹھونک دی اور انگریزوں کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔ انہوں نے دہلی کو کفار مرہٹوں کی یلغار سے بچانے کے لئے پیشہ ور افغان لٹیروں نادر شاہ اور احمد شاہ کو دہلی پر دھاوا بولنے کی ترغیب دی۔ ان لٹیروں نے پنجاب اور سندھ کے مسلمانوں اور ہندوؤں کا قتل عام کرنے کے بعد دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجائی، ہندوؤں اور مسلمانوں کا قتل عام کیا، محل اور شاہی خزانہ لوٹ لیا اور اپنا سالانہ بھتہ طے کرانے کے بعد افغانستان واپس چلے گئے۔ سندھ اور پنجاب پر انہوں نے اپنا راج قائم کر لیا۔

ان کو کفار مرہٹوں سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہندوستان کی مسلمان سلطنت سے۔اس تباہی میں نہ تو مسلمان عوام کا اور نہ شاہ عالم کا کوئی کردار تھا بلکہ یہ تباہی ایک کٹر پنتھی عالم کی غلط رہنمائی کی دین تھی جو فرقہ وارانہ فاشزم سے مغلوب تھا۔فرقہ واریت لازماً فاشزم ہی کو ہوا دیتی ہے اور فاشزم لازماً شکست پر ہی تمام ہوتی ہے مگر اپنی ہار تک پہنچنے سے پہلے وہ اجتماعی قتل عام اور نسل کشی کا کھیل کھیل لیتی ہے۔ یہ کھیل ہونا تھا سو ہو گیا مگر اس کے ذریعہ ہندوستان کی مسلمان سلطنت کو بچانے اور مرہٹہ قوت کو کمزور کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا۔بادشاہ بے بس تھا، خزانہ خالی تھا اور شاہی محل کے چولہے ٹھنڈے ہو گئے تھے۔اب عظیم ہندوستان نو آبادیاتی سامراجیوں کے سامنے ایک زندہ لاش کی طرح پڑا ہوا تھا اور کمپنی کا خزانہ مال سے بھرا ہوا تھا۔نو آبادیاتی سوداگروں نے اس سیاسی صورت حال کو اپنے حق میں فوراً استعمال کیا۔ان ہندوستانی فوجیوں کو جن کی تنخواہیں بند ہو گئی تھیں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی فوج میں بھرتی کر لیا تھا۔ 1757ء میں پورے بنگال پر ان کا راج تھا اور کول کتا ان کی راج دھانی ہو گیا تھا۔ممبئی اور مدراس کے علاقوں پر ان کا قبضہ پہلے ہی قائم تھا۔ اب ان کا ہدف اتر پردیش، پنجاب اور سندھ کے علاقوں پر اپنا تسلط قائم کرنا تھا۔غیر سرکاری طور پر کمپنی کے حکام نے اتر پردیش، دہلی اور پنجاب میں اپنی انتظامی اکائیاں قائم کر لی تھیں۔ پنجاب ان کی توجہ کا مرکز تھا کیونکہ وہاں مسلمانوں کے خلاف انہوں نے سکھوں کو اکسانے اور پنجاب سے برطانوی ہندوستان کے لئے سپاہیوں کو بھرتی کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔سکھوں کی مسلمان دشمنی کو انگریز حکام نے 1947ء میں خوب استعمال کیا تھا۔ان منصوبوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنے، اپنی ایمپائر کو استحکام دینے اور اپنے اقتصادی و سیاسی مفادات کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے ''لڑاؤ، تقسیم کرو اور راج کرتے رہو'' کی اپنی پالیسی کا اطلاق کیا تھا۔ان کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ ہندوستانی سماج میں علاقائی، لسانی، مذہبی اور نسلی تضادات محو خواب ہیں سو انگریز حکام نے ان کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ ہندوؤں کو محمود غزنوی، بعض مسلمان بادشاہوں، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کی ہندو دشمنی یاد دلائی۔ اس اختلاف کو متحرک کرنے کے لئے انہوں نے ہندی و اردو زبانوں اور ہندو و مسلمان مذاہب کے مابین موجود تضاد کی بنجر سرزمین کو نفرت و دشمنی کے بیج بونے کے لئے ہموار کیا ان تضادات کو جگا دینے کے باوجود ان سے ایک ایسی غلطی سرزد ہو گئی جس نے ہندوؤں میں ان کے خلاف نفرت پیدا کر دی تھی اور وہ تھی ہندوؤں کے بعض مذہبی عقائد میں

مداخلت مثلاً انہوں نے رسم ستی کو روکنے کے لئے قانون وضع کیا تھا اور اس کا اطلاق کیا تھا۔

فرقہ وارانہ تضادات کو ابھارنے میں انگلستان اور یورپی ملکوں کے مورخوں، سیاحوں اور دانشوروں نے اپنے مشن کو منطقی جواز فراہم کرنے کے لئے اوینٹلزم کی تھیوری وضع کی جس کا مقصد ماضی کے ہندوستان کی تہذیبی ولسانی اور سیاسی و مذہبی تاریخ کے حقائق کو مسخ کر کے اس تاثر کو بڑھاوا دینا تھا کہ حکمراں مسلمان اقلیت نے ہندوؤں پر مظالم توڑے تھے، ان کے دھارمک معاملات میں مداخلت کی تھی اور ان کی مذہبی زبان ہندی کا خاتمہ کر کے ان پر فارسی اور اردو مسلط کر دی تھی۔ تمام نو آبادیاتی تاریخی بیانئے اور سفرنامے اسی قسم کی گڑھی ہوئی کہانیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ برطانوی حکمرانوں کو اندازہ تھا کہ ان تاریخی بیانیوں اور سفرناموں کے اثرات مستقبل میں ہندوؤں اور مسلمان دانشوروں اور مورخوں کے درمیان محاذ آرائی (Polarization) کی مضبوط بنیاد کو جنم دیں گے۔ جس میں اہم کردار مذہب اور زبانیں ہی ادا کریں گی۔

گیارہویں صدی سے 1757ء تک اس قسم کی فرقہ وارانہ تقسیم کا کوئی کردار نہیں تھا اور نہ ان صدیوں کے دوران جو تاریخی بیانئے لکھے گئے ان میں ہندوؤں کے خلاف کوئی مواد ہوتا تھا۔ رابطہ عامہ کی زبان کے لئے لفظ ہندی ہی زبان زد خاص و عام تھا۔ ہندی کے دونوں رسم الخط یعنی ناگری اور فارسی رائج تھے۔ اکثر دوہا گو مسلمانوں نے اپنے دوہے ناگری رسم الخط ہی میں لکھے ہیں۔ بادشاہوں نے بھی رسم الخط پر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ سرکاری مہروں اور کاغذات پر بھی عموماً دونوں ہی رسم الخطوں میں عبارت درج ہوتی تھی۔ درباری و سرکاری زبان اگرچہ فارسی تھی مگر شاہی محل اور انتظامیہ میں نچلے طبقے کے ملازموں کی اکثریت کے لئے فارسی زبان پر عبور ہونا ضروری نہیں تھا۔ نچلے عملے اور ہندوستانی رعایا سے رابطوں کے لئے بادشاہ بھی ہندی زبان ہی بولتے تھے۔ وہ نہ صرف ہندی شعر و ادب بلکہ ہندوستانی سُر سنگیت اور راگ راگنیوں کی باقاعدہ سرپرستی کرتے تھے جس کی وجہ سے ہندو اور مسلمان سنگیت کاروں اور گائیکوں کے بڑے بڑے گھرانے ہندوستان کے ہر علاقے میں پھل پھول رہے تھے۔ شاہی محل میں سنگیت کار اور گائیک باقاعدہ ملازم ہوتے تھے اور ان کو شاہی لقب حاصل ہوتے تھے۔ بہت سی نئی مقامی راگ راگنیاں مسلمانوں ہی کی ایجاد تھیں۔ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی اور راگ راگنیوں کی ترقی میں مسلمانوں کا کردار ہی نمایاں تھا۔ اس ترقی اور نشوونما کا ایک اور وسیلہ صوفی بزرگان دین کا تھا جنہوں نے سُر

سنگیت اور راگ راگنیوں کو ہندوستانی عوام تک پہنچا دیا تھا۔ جس ایودھیا میں اب بابری مسجد کا سانحہ زبان زدِ خاص و عام ہے وہاں کبھی میر انیس ہندو سادھوؤں اور سنتوں کی کٹیاؤں میں ان کے ساتھ باتیں کیا کرتے تھے۔ انیسویں صدی میں چھپنے والی اردو کتابوں میں ہندو مصنفین بھی اپنی کتابوں کی ابتدا بسم اللہ اور حمد و نعت سے کیا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ اسلامی کتابیں معروف ناشر منشی نولکشور شائع کرتے تھے جن کو مسلمان سند تصور کرتے تھے۔ اکثر ہندو شعرا نعتیں اور مرثیے بھی کہتے تھے۔ نھولال وحشی کے مرثیے میں یہ شعر بھی موجود ہے۔

نرغہ کیا جب امت خانہ خراب نے
ہندوستان کو یاد کیا تھا امام نے

ہمارے مسلمان مورخوں نے محققوں اور علماء نے آج ان ہندو خاندانوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے جو کربلا کے قریب آباد تھے اور جن کے بزرگوں نے کربلا کے معرکے میں امام عالی مقام کے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ لیا تھا اور اپنی جانیں گنوائیں تھیں۔ ہندوستان کی عدالت میں جو تاریخی دستاویزات پیش گئی تھیں ان سے عدالت کو یہ ثبوت ملا تھا کہ رام مندر کو گرا کر مسجد تعمیر کرنے کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا یہ شوشہ صرف ایک انگریز خاتون مورخ نے چھوڑا تھا۔ کسی بھی مسلمان وقائع نویس اور مورخ یا یورپی مورخ نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مسلمان شاعروں اور دانشوروں میں بہتوں نے ہندو رسومات اور مذہبی تہواروں کو بھی موضوع بنایا تھا۔ رامائن و مہابھارت اور دوسری سنسکرت کتابوں کے بھی مسلمانوں نے ترجمے کئے تھے۔ ہندی شاعری پر بھی اہم کام مسلمانوں نے کیا تھا۔ انگریز اور یورپی مورخوں اور سیاحوں نے اپنے بیانیوں میں تاریخ کے ان حقائق کا نام تک نہیں کیا۔

ہندوستان سے عربوں کے رابطے بھی بہت پرانے تھے۔ عرب سوداگر ہندوستان کے جنوب مغربی علاقوں میں آتے تھے بہت سے عرب سوداگر یہاں آباد ہو گئے تھے، انہوں نے مقامی زبانیں بھی سیکھ لی تھیں اور مقامی ہندوستانی عورتوں سے بیاہ کر لئے تھے۔ اس طرح انہوں نے اپنی ہندوستانی نسل پیدا کی تھی۔ ان کے برعکس جب یورپی نوآبادیاتی سامراج کا پہلا سفارت کار واسکوڈی گاما ہندوستان آیا تھا تو اس نے بندرگاہ پر کام کرنے والے درجن بھر سے زیادہ

ہندوستانیوں کو قتل کر دیا تھا۔ مدراس پہنچنے والے انگریزوں نے بھی ہندوستانیوں کو قتل کیا تھا۔ اس تاریخی حقیقت کا ذکر شہرہ آفاق ہندوستانی ناول نگار ارن دھتی رائے نے اپنی انگریزی ناول مطبوعہ 2000ء میں کیا ہے۔ ہندوستان جیسے پُر امن اور سیکولر سماج کی تاریخ میں نسلی و مذہبی تعصب کا یہ پہلا واقعہ تھا۔

یورپی لٹیرے جو ہندوستان پر قبضہ کرنے کی نیت سے آئے تھے اپنے ساتھ یورپی نسل، یورپی تہذیب، یورپی زبانوں اور عیسائیت کی برتری کا تصور لے کر آئے تھے۔ ہندوستان کی بقول ان کے کالی، وحشی اور جاہل نسل کو تہذیب سکھانا انہوں نے اپنا مذہبی فرض سمجھ لیا تھا چنانچہ وہ برملا کہا کرتے تھے کہ خدا نے ان پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ جاہلوں اور وحشیوں کو تہذیب سکھائیں جس کے لئے ضروری تھا کہ یہ وحشی اور جاہل عیسائی مذہب اپنائیں یہی وجہ ہے کہ نوآبادیاتی لٹیرے اپنے ساتھ عیسائی راہبوں اور پادریوں کو لے کر آئے تھے گویا فرقہ واریت کی جڑیں ان کے مزاج میں تھیں۔ سترہویں صدی کے اواخر تک مدراس، ممبئی، گوا اور ٹھٹھہ میں عیسائی گرجا گھر قائم ہو گئے تھے۔ اکبر اعظم نے جب دہلی میں ابھرتے ہوئے فرقہ وارانہ رجحانات پر قابو پانے کے لئے مذہبی مباحثوں کا اہتمام کیا تھا تو اس میں پرتگالی عیسائی پادری بھی شریک ہوئے تھے۔ ارن دھتی رائے نے اپنے ناول میں بھی شامی گرجا گھر کی اس شاخ کا ذکر کیا ہے جو مدراس کے علاقے میں قائم کی گئی تھی۔ اس ناول کے فعال ہندوستانی کردار بھی عیسائی ہیں جن کے آباؤ اجداد کا تعلق شامی گرجا گھر سے تھا۔

1757ء کے بعد جب پورے بنگال پر انگریزوں نے قبضہ جما لیا تھا اور کول کتا ان کی راج دھانی بن گیا تھا تو گرجا گھروں کی شاخیں بنگال بہار اور اڑیسہ کے علاقوں تک پھیل گئی تھیں۔ ان شاخوں کو کام کرنے کے لئے ہدایات اور اخراجات کے لئے رقم انگلستان، روم اور اسکاٹ لینڈ کے مرکزی گرجا گھروں سے ملتی تھیں۔ وہ ہندوستان میں نوآبادیاتی سامراجیت کے پھیلاؤ اور استحکام کا ہراول دستہ بھی تھے۔ انہوں نے جیسا کہ ان کو ہدایت کی گئی تھی اپنے مراکز دیہی علاقوں کے اطراف محفوظ جنگلوں میں بنا لئے تھے جہاں مقامی غریب خاندانوں کے بچوں کو بائبل کی تعلیم ان کی مقامی زبانوں میں دی جاتی تھی۔ راہبوں اور پادریوں نے جن علاقوں میں وہ درس تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے وہاں کی مقامی زبانوں پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ 1850ء تک نوآبادیاتی

سامراجیت پورے ہندوستان پر قابض ہوگئی تھی چنانچہ ہندوستان کے ہر شہر اور دیہات میں گرجا گھر قائم ہو گئے تھے۔ 1816ء میں بائبل کی تعلیم کا ایک مرکز ہندوستانی عیسائی مبلغ آنند مسیح نے دہلی کے قریب ایک جنگل میں قائم کیا تھا۔

نوآبادیاتی سامراج کے راج کا جو دوسرا مرحلہ 1800ء سے شروع ہوا اس میں مذہبی سامراجیت کے ساتھ ساتھ لسانی اور ثقافتی سامراجیت کا منصوبہ بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں حکمراں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بالائی سطح پر انتظامی اور عدالتی شعبوں میں انگریزی کے استعمال اور ہندوستانیوں کے ایک خاص منتخب حلقے کو انگریزی اور مغربی علوم سکھانے کا بھی اہتمام کیا تھا۔ اس مرحلے میں انگریز حکام نے گرجا گھروں اور عیسائی مشنریوں کی بھی سرکاری سرپرستی شروع کر دی تھی چنانچہ اب غریب ہندوستانی عوام کو عیسائی بنانا، عیسائی ہو جانے کے بعد ان کو مالی امداد فراہم کرنا اور عیسائیت کا فروغ ان کی سرکاری پالیسی کا حصہ ہو گیا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسکاٹ لینڈ کے گرجا گھر نے الکونڈر ڈف کو ہندوستان بھیجا تھا جو 1829ء میں کولکتا آ گیا تھا۔ ہندوستان کے وائسرائے بینٹنگ اور اس کے حکام نے اس کی ہر طرح مدد کی تھی۔ ہندوستان میں ملک گیر سطح پر عیسائیت کی تعلیم کو پھیلانے اور عوام کو عیسائی بنانے میں اس کا کردار اہم رہا تھا۔ برہمو سماج کے روح رواں راجہ رام موہن رائے خود عیسائیت اور بائبل کے بڑے مداح ہو گئے تھے اور انہوں نے الکونڈر ڈف کے ساتھ بھی بھرپور تعاون کیا تھا۔ ان کے کئی چیلے بھی عیسائی ہو گئے تھے۔ انیسویں صدی کی پہلی چوتھ کے ختم تک غریب ہندوستانی عیسائیوں کی ایک قابل ذکر اکثریت ہر علاقے میں پیدا ہوگئی تھی جو اپنے مقامی ناموں کے ساتھ لفظ مسیح ضرور جوڑتی تھی۔ دہلی میں بھی مقامی عیسائیوں کا حلقہ پیدا ہو گیا تھا۔ دہلی کالج کے استاد رام چند بھی عیسائی ہو گئے تھے۔ 1857ء کے غدر کے بعد پکڑے جانے والے بعض مسلمانوں نے بھی انگریز جج کے سامنے اپنے عیسائی ہونے کا ذکر کیا تھا مگر غالب نے اپنے ایک خط میں واضح کیا ہے کہ وہ عیسائی نہیں ہوئے تھے بلکہ سزا کی زد سے بچنے کے لئے مصلحتاً اس قسم کا بیان دیا تھا۔

ہندوستان میں عیسائیت کے پھیلاؤ اور ہندوؤں و مسلمانوں کے مذہبی عقائد میں اس کی بے جا مداخلت کی وجہ سے عوام میں ایک جارحانہ اشتعال موجود تھا اور اس کا اندازہ انگریز حکام کو اٹھارہویں صدی کے اواخر ہی میں ہو گیا تھا۔ اس کی طرف سے غریب عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے

انگریز حکام ہندی وار دو زبانوں اور ہندو و مسلمانوں کے درمیان کے فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کے اپنے منصوبے کو بروئے کار لائے جو کہ ان کا سب سے زیادہ کامیاب منصوبہ ثابت ہوا تھا۔ انگریزوں کو یہ اندازہ تھا کہ غریب ہندوستانی کی اکثریت میں انگریزوں سے ٹکر لینے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ہندوستان کا مقامی باا ثر طبقہ برطانوی سامراجیت کا وفادار بن چکا تھا۔ بادشاہ خود کمپنی کا دست نگر تھا جس کو کمپنی اخراجات کے لئے سالانہ معاوضہ فراہم کرتی تھی۔ ہندوستان میں انگریز حکام نے لگ بھگ چھ سو ہندو راجاؤں اور مسلمان نوابوں کی ریاستیں بنادی تھیں جو انگریزوں کی وفادار تھیں۔ مقامی فوجی انگریزوں کے تنخواہ دار ملازم بن گئے تھے اور ان کا اقتصادی مستقبل محفوظ تھا۔ اکثر باا ثر ہندو اور مسلمان شخصیات جیسے راجہ رام موہن رائے اور سر سید انگریزی راج کے حامی تھے۔

زبانوں اور عقائد کی بنیاد پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور دشمنی کی پائیدار بنیاد قائم کرنے کے لئے انگریز حکام نے یورپی مورخوں اور سیاحوں کو متحرک کیا جنہوں نے ہندوستان کے ماضی کے ہر ہر پہلو کا احاطہ کیا اور نتائج کو نوآبادیاتی سامراجیت کے مفادات کو سائبان فراہم کرنے کے لئے یکجا کیا۔ انہوں نے تاریخ کے اصل حقائق کو جی بھر کر مسخ کیا اس زمانے تک ہندوستانی دانشوروں نے اپنی تاریخ قلمبند کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی چنانچہ اس خطا کا یورپی مورخوں اور سیاحوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا کیونکہ ان کو صحیح اندازہ تھا کہ جب آنے والے وقت میں ہندو اور مسلمان مورخ قلم اٹھائیں گے تو ان کے سامنے یورپی مورخوں اور سیاحوں ہی کا قلمبند کیا ہوا سرمایہ ہوگا جس سے وہ استفادہ کریں گے۔ اچنبھے کی بات تو یہ ہے کہ ان دانشوروں نے تاریخ کے ہر ہر حقائق کو پوری طرح مسخ کر کے تو بیان کر دیا لیکن عیسائیت کی تبلیغ اور ہندوستان کے سماج پر اس کے اثرات کی تاریخ کو موضوع نہیں بنایا۔ ان سب ہی مورخوں نے تاریخ کے اصل پس منظر پر پردے ڈال کر یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کے معروضی حالات متقاضی تھے کہ برطانوی سامراج کا تسلط قائم رہے جو ہندوستان کو جدید ترقی یافتہ مستقبل کی طرف لے جا رہا ہے کپلنگ کے بقول خدا نے ہندوستان کو راہ راست پر لانے کا بوجھ سفید نسل کے کاندھوں پر ڈالا تھا۔ عیسائیت کے موضوع پر کسی مسلمان اہل الرائے کی پہلی تجزیاتی کتاب سر سید کی ''اسباب بغاوت ہند'' تھی۔ دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ سر سید نے یہ کام بھی انگریز حکام ہی کی ایماء پر کیا

تھا۔ بہر حال 1857ء کا ہنگامہ اصل میں آزادی حاصل کرنے کا نہیں بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پیدا ہونے والی عیسائیت کے خلاف فرقہ وارانہ جذباتیت کی دین تھا۔ فرقہ واریت کے اس اجتماعی جذبے کی نشوونما کا کردار یقیناً انگریز حکام ہی نے ادا کیا تھا۔ یہ جذبہ تو انہوں نے ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کو جنم دینے کے لئے پیدا کیا تھا مگر اس کا اثر الٹا ہوا اور اس جذبے نے 1857ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایکتا پیدا کر دی تھی۔ یہ ایکتا انگریز حکام کے گلے آ گئی تھی اور اگر بروقت وہ تیسری فرقہ وارانہ مسلمان دشمن قوت یعنی سکھوں کو استعمال نہ کرتے تو امکان تھا کہ ان کو ہندوستان چھوڑنا پڑتا۔ پنجاب کے سکھوں کی مسلمان دشمنی نے ہندوستان کو مستقل غلامی کے جہنم میں دھکیل دیا تھا۔ 1857ء کے ہنگامے میں ہندوستان کی آزادی اور بہادر شاہ ظفر کے ساتھ وفاداری کا جو نعرہ ابھرا تھا اس کے پیچھے کارفرما قوت ہندو اور مسلمانوں کے مذاہب کو تحفظ فراہم کرنے ہی کی تھی۔ اسی قوت کو بیسویں صدی میں انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت نے بھی استعمال کیا تھا۔

یورپی مورخوں اور سیاحوں نے اپنے بیانیوں کے ذریعہ ہندوستان میں زیر زمین ہندو و مسلمان تضاد کو نمایاں کیا تھا۔ یہ بیانئے ہندوؤں کو باور کراتے ہیں کہ ان کی آبادی پچاسی فی صدی اور مسلمانوں کی پندرہ فی صد تھی مگر پندرہ فی صد مسلمان پچاسی فی صد ہندوؤں پر راج پاٹ کرتے رہے اور ان پر اتنا شدید جبر مسلط کیا کہ وہ حکمراں مسلمانوں کے خلاف اُف تک نہ کر سکے۔ انہوں نے اورنگ زیب کو خاص طور پر ایک کٹر پنتھی مسلمان اور ہندوؤں کا دشمن بنا کر پیش کیا۔ یک طرفہ طور پر اس تاثر کو ابھارا کہ اس نے ہندوؤں کے مندروں کو توڑ پھوڑ ڈالا مگر اس نے جن مسجدوں کو اسی طرح تڑوایا تھا اس کا ذکر بالکل نہیں کیا۔ انیسویں صدی کے اواخر تک ماضی کی ہندوستانی تاریخ پر فرقہ واریت کا رنگ چڑھ چکا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مورخوں نے ان ہی کہانیوں کو سچ سمجھ کر مسلمانوں کے کردار کو اتنا ہی مسخ کیا۔ اس کے ردعمل میں مسلمان مورخوں نے ہندوستان پر مسلمان اقتدار کے دفاع کو ترجیح دی اور ہندو مورخوں کے نقطہ نظر کو جذباتی انداز میں رد کیا۔ اس طرح شاطر انگریزوں نے ہندوستان کے مسلمان اور ہندو مورخوں اور دانشوروں کو بھی اکھاڑے میں لا کر کھڑا کر دیا تھا جس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ دھند میں ڈوبے ہوئے تاریخی بیانئے مرتب کرنے کی روایت مستحکم ہو گئی۔ ہندوستان کے بٹوارے کے

بعد پاکستان میں تاریخ کے جو عمومی بیانئے اور نصابی تاریخ مرتب کی گئی مزید مسخ شدہ واقعات ہی کے مجموعے ہیں۔

1800ء میں انگریز دانشوروں کی صف سے ڈاکٹر جان گلکرائسٹ منظر پر نمودار ہوئے جن کی اردو دوستی کے اکثر مسلمان ادبی مورخوں اور لسانی ماہروں خصوصاً مولوی عبدالحق نے گن گائے ہیں حالانکہ وہی پہلا انگریز ہے جس نے برصغیر کی سرزمین میں ہندی و اردو زبانوں اور ہندوؤں و مسلمانوں کے درمیان نفرت و دشمنی کے بیج بوئے تھے۔ اس نے ہندو قلمکاروں کو ترغیب دی تھی کہ وہ اپنے ہندی متون Text میں فارسی و عربی زبان استعمال نہ کریں بلکہ ٹھیٹ سنسکرت لفظوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ یہ وہی سنسکرت زدہ ہندی زبان تھی جو 1950ء کے بعد ہندوستان میں بالائی سطح سے لوگوں پر تھوپ دی گئی تھی مگر ہندوستانیوں کی بہت بڑی اکثریت نے آج تک نہ اس کو بولنا گوارا کیا اور نہ سننا۔ اردو کے قلمکاروں کو اس نے یہ ترغیب دی کہ وہ اردو کے متون میں ہندی اور سنسکرت زبانوں کے الفاظ نہ لائیں بلکہ ایسی زبان کو ترجیح دیں جو عام بول چال میں رائج ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے گلکرائسٹ کے اس کوشش کا عموماً ہندوؤں اور مسلمانوں پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوا تھا لیکن پڑھے لکھے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذہنوں میں شک کی ایک ریکھا ضرور بن گئی تھی۔ اس کی مزید نشو و نما نہ ہونے کی ایک تو وجہ یہ تھی کہ رسماً سہی 1857ء تک بہادر شاہ ہندوستان کا عالم علامتی بادشاہ ضرور تھا اور دوسری یہ تھی کہ خود بادشاہ اردو، ہندی اور پنجابی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور عملاً ہندوستانی قوم پرستی پر یقین رکھتے تھے۔ ان کے اس کردار کی وجہ سے ہندوستان کی ہندو اکثریت بھی ان کو پسند کرتی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے تجربے کے بعد انگریز حکام نے یہ حکم سرکاری طور پر جاری کیا (1834ء) اور لوگوں کو پابند کیا کہ وہ رابطے کی عام زبان کے لئے صرف لفظ اردو استعمال کریں۔ اسی حکم کے تحت فارسی کو ہٹا کر اردو کو سرکاری و دفتری زبان بنانے کا بھی اعلان کیا گیا تھا۔ ہندی اور اردو زبان کے درمیان فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کی لکیر کھینچنے کے بعد اردو کو دفتری زبان کا اعزاز بخشنے کا مقصد ہندوؤں میں اردو کے حوالے سے اختلاف کو منظر عام پر لانا تھا۔ 1832ء کے بعد اردو شعرا اور اہل الرائے نے لفظ اردو کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ہندی و اردو کے درمیان فرقہ وارانہ تقسیم کے نظریئے کو مستحکم کرنے کے لئے اردو کے مورخوں اور لسانی پنڈتوں نے یہ ثابت کیا کہ لفظ اردو اٹھارہویں صدی میں رائج ہو چکا

کیونکہ اردو کے سب سے بڑے دشمن ہندو تھے۔ اس دشمن کی وجہ یہ تھی کہ اردو کو بنانے سنوار نے اور ترقی دینے میں مسلمانوں ہی نے نمایاں کردار ادا کیا تھا کیونکہ یہی ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان تھی۔ تاریخی حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ 1834ء تک لفظ اردو زبان زد خاص و عام نہیں ہوا تھا اور اردو شعرا عموماً لفظ ہندی ہی استعمال کرتے تھے۔ لفظ ہندی اجتماعی لاشعور میں اس حد تک موجود تھا کہ غالب نے اپنے اردو خطوط کے مجموعے کا نام ''عود ہندی'' رکھا تھا۔ انگریز علماء کے شعور پر ہندو اور مسلمانوں کے درمیان فرق کا سرکاری نوآبادیاتی موقف اس قدر حاوی تھا کہ انہوں نے لفظ ہندوستان کے انگریزی ہجے ہندوستان (Hindoostan) اختیار کئے تھے جس کے ذریعہ وہ یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ ہندوستان کے معنی ہیں ہندوؤں کا وطن۔ ہندو راج کے زمانوں میں ہندوستان کا لفظ نہیں تھا اور اس ملک کو بھارت ورش کہا جاتا تھا۔ عرب اور ایرانی اصل میں اس دیس کو ہند کہتے تھے جس سے بعد میں لفظ ہندوستان بنا تھا۔ مگر کالونیل دور کی انگریزی نے جب پڑھے لکھے مسلمانوں کے ذہن کو نوآبادیا دیا تھا تو وہ ہندوستان لکھنے لگے تھے۔ 1843-1857ء کے دوران ہندی و اردو اور ہندو مسلمان تضاد ماضی کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہو گیا تھا مگر ہندوؤں کی طرف سے کسی اختلاف کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ صدیوں سے چلی آنے والی وہ تہذیبی اور لسانی روایت تھی جو کھوکھلی ہو جانے کے باوجود ابھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک سماجی معمولات میں موجود تھی۔ انیسویں صدی کے دوران انگریزی زبان اور جدید مغربی علوم کی تعلیم سے ہندوؤں کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ مسلمانوں نے 1857ء کے بعد تک انگریزی زبان، جدید مغربی علوم اور سائنس کی تعلیم کے خلاف جارحانہ مزاحمت کی تھی۔ اس عدم توازن کا یہ نتیجہ ہوا کہ دربار اور سرکاری ملازمتوں کی نچلی سطح میں ہندوؤں کی تعداد خاصی بڑھ چکی تھی جبکہ گنتی کے دو چار با اثر مسلمانوں کو نوآبادیاتی راج کا مداح بنانے کے لئے انگریزی نہ جاننے کے باوجود سرکاری ملازمت دی گئی تھی جیسے کہ سرسید جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے اور سرکاری ملازمتوں میں آ جانے کی وجہ سے یہ ہندو نوآبادیاتی سامراج کے زیادہ قریب آ گئے تھے ان کا یہ بھی خیال تھا کہ سرکاری ملازمتوں میں جو عدم توازن مسلمانوں کے دور اقتدار میں تھا اس کے فاصلے کو انگریز سرکار نے کم کر دیا ہے۔ اس باطل خیال کی ترویج و اشاعت بھی انگریز مورخوں اور سیاحوں نے کی تھی ورنہ اصل تاریخی حقیقت یہ ہے اس عدم توازن کا اندازہ سب سے پہلے

اورنگ زیب نے کیا تھا چنانچہ اس نے سرکاری انتظامیہ میں ہندوؤں اور مسلمان کا برابر کوٹا مقرر کر دیا تھا۔ جہاں تک سوال ہندو کاروباری طبقے کا تھا تو کاروباری طبقہ ہمیشہ اور ہر زمانے میں اپنے مفادات ہی کا پابند ہوتا ہے اور عموماً مقتدر طبقے ہی کا حامی بھی ہوتا ہے۔ اس کا اصل مذہب صرف منافع سازی اور منافع خوری ہی ہوتا ہے اسی لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندو کاروباریوں کے ساتھ معاملہ کرلیا تھا کیونکہ وہی ہندوستان کے بڑے بینکار بھی تھے اور وہی کردار ادا کرتے تھے جو اب ورلڈ بنک ادا کررہا ہے۔ کمپنی ان ہی سے سود پر قرضہ حاصل کرتی تھی۔ ان حالات میں فرقہ وارانہ بنیاد پر مسلمانوں کی مخالفت کا کردار ہندو کاروباری طبقہ ادا کررہا تھا اور ہندوستان میں فرقہ وارانہ استحکام کا بھی موثر ذریعہ تھا۔ ہندو کاروباری طبقہ کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے مارکوولس نے صحیح حقائق یکجا کیے ہیں۔ اس کے بقول وسطی ایشیا، سنکیانگ، شکارپور سندھ اور حیدرآباد سندھ میں آباد ہندو کاروباریوں کے مسلمانوں اور مسلمان حکام سے بہت اچھے تعلقات تھے اور وہ اسلام کا بھی بہت احترام کرتے تھے مگر بٹوارے کے بعد جب یہ کاروباری ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہوگئے تھے اور وہاں اپنا کاروبار از سرنو مستحکم بنیادوں پر قائم کرلیا تھا تو وہ ہندوستان کی کٹر پنتھی ہندو قوتوں کے سب سے بڑے حامی ہوگئے تھے اور اس بات پر خوش تھے کہ ان کو ان کی اپنی ہندو پہچان مل گئی ہے جس سے وہ اپنے وطن سندھ میں محروم رہے تھے۔

اردو کی ترقی کا ایک اور اہم ذریعہ دہلی کالج ثابت ہوا تھا جو انگریزوں ہی نے قائم کیا تھا۔ اس وقت ہندوستان کی سرکاری و دفتری تعلیمی زبان انگریزی ہوچکی تھی لیکن کالج کے گورے حکام نے مغربی علوم اور سائنس کی تعلیم کا ذریعہ اردو کو قرار دیا تھا اور تمام مضمونوں کی نصابی کتابوں کے اردو تراجم شائع کروائے تھے۔ بیسویں صدی کے اکثر اردو دانشوروں خصوصاً مولوی عبدالحق نے اسے اردو زبان کی کامیابی سے تعبیر کیا تھا۔ انگریز حکام نے اردو کو اس لئے ذریعہ درس و تدریس نہیں بنایا تھا کہ وہ اردو سے مرعوب تھے بلکہ ان کے ذہنوں میں یہ خیال گھر کئے ہوئے تھا کہ مسلمان اردو داں شرفا انگریزی بالکل نہیں جانتے ہیں اس لئے وہ انگریزی شعر و ادب، جدید علوم و افکار اور سائنسی موضوعات سے بے خبر ہیں۔ اس زمانے کے ہندوستانی سماج پر ان کے گہرے اثرات تھے اور ان پڑھ عوام کی اکثریت ان ہی کی آراء کو حرف آخر سمجھتی تھی اس لئے ضروری تھا کہ ان اردو داں شرفا تک انگریزی شعر و ادب، جدید علوم و افکار اور سائنسی خیالات اردو کے ذریعہ

پہنچایا جائے۔ اردوداں اساتذہ کے بعض جواں سال بچوں نے بھی دہلی کالج میں داخلہ لیا تھا۔ ان اردو دانشوروں اور شرفا کے طبقے کو نو آبادیانے (Colonize) کا جامع منصوبہ 1835ء میں لارڈ میکالے پیش کر چکا تھا اور اس پورے منصوبے کو انگریز حکام نے منظور بھی کر لیا تھا۔ اس کے باوجود دہلی کالج کو عارضی مدت تک کے لئے رعایت دے دی گئی تھی۔ دہلی کالج کا مقصد پورا ہوا تھا اور زیادہ تر معروف و باا ثر اردو دانشور مغربی افکار، انگریزی شعر وادب اور انگریزوں کے انتظامی طور طریقوں کے مداح ہو گئے تھے۔ اس کالج نے 1858ء کے بعد شروع ہونے والی سرسید تحریک کو بھی مولانا محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد جیسے قلمکار مہیا کئے تھے۔ اردوداں طبقے کی پہلی تعلیم یافتہ نسل پیدا ہونے کے بعد فورٹ ولیم کالج کی طرح دہلی کالج کو بھی بند کر دیا گیا تھا کیونکہ اب مسلمان شرفا کے بچوں کو باقاعدہ انگریزی، جدید علوم وافکار اور سائنسی مضامین پڑھانے کے لئے علی گڑھ میں تعلیمی ادارہ قائم ہو گیا تھا اور سرسید کے سب ہی ساتھی شبلی، حالی، آزاد اور نذیر احمد ان کے تعلیمی موقف کے ہمنوا ہو گئے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ تنازعے کو گرمی پہنچانے میں بنارس ہندو یونیورسٹی اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج دونوں نے اہم کردار ادا کیا تھا کیونکہ بنارس کالج کے ساتھ انگریز حکام نے لفظ ہندو کو اور علی گڑھ کے ساتھ لفظ محمڈن کو جوڑ دیا تھا۔ سرسید کی مجبوری یہ تھی کہ علی گڑھ کالج کے لئے سرکار برطانیہ کا تعاون درکار تھا چنانچہ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہوں نے تینوں الفاظ اینگلو، اورینٹل اور محمڈن کی ترکیب وضع کی تھی۔ علی گڑھ کالج نے گو کہ ہندوؤں کے داخلے پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی مگر لفظ محمڈن کی وجہ سے ہندو اسے مسلمانوں ہی کا کالج سمجھتے تھے۔ سرسید نے انگریز راج سے وفاداری کا برملا اظہار کیا تھا اور سائنسی بنیاد پر اسلام کی تعبیر وتشریح کی تحریک کو بڑھاوا دیا تھا۔ برطانوی راج کی مسلمان دشمنی پر قابو پانے کے لئے انہوں نے بائبل اور اسلامی تعلیمات کے درمیان مطابقت کے نظریئے کو بڑھاوا دیا تھا۔ ان اقدامات کی وجہ سے مسلمان کٹر پنتھی علماء کا طبقہ ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا اور چونکہ ان پڑھ، روایت پرست اور توہمات میں مبتلا مسلمان عوام کٹر پنتھی علماء ہی کی ہدایات کو حرف آخر سمجھتے تھے اس لئے مسلمان فرقہ واریت کا بازار ایک نئے روپ میں جلوہ گر ہوا تھا جس کا پہلا زوردار اظہار انگریزوں کے خلاف سید اسمٰعیل کی تحریک جہاد سے ہوا تھا جس کا انجام ہار اور سید صاحب کی شہادت پر منتج ہوا تھا۔ اس تحریک کا اثر بعض مسلمان شعراء پر بھی گہرا تھا چنانچہ اردو شاعر

مومن تحریک جہاد کے حامی تھے اور انہوں نے اس عنوان سے ایک مثنوی بھی کہی تھی۔ تحریک جہاد کے کرتا دھرتاؤں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ پنجاب میں اس کا حلالہ کرنے کے لئے برطانوی سامراج کی حاشیہ بردار سکھ مسلح قوت تیار بیٹھی تھی۔ سرسید کے خلاف دوسرا بڑا اور مؤثر محاذ مولانا محمد قاسم کی تنظیم دیو بند تھی جس نے برطانوی سامراج کی مخالفت کے لئے مذہب کو بروئے کار لاکر مسلمان عوام کو اپنے حق میں متحد کر دیا تھا۔ البتہ بعد کے دور میں علمائے دیو بند کا موقف تبدیل ہو گیا تھا اور وہ ہندوؤں و مسلمانوں دونوں کو ہندوستانی قوم قرار دیتے تھے۔ 1920ء کے بعد ان کا جھکاؤ سوشلسٹ نظریئے کی طرف ہو گیا تھا تاہم اپنے معمولات میں قدامت پسندی کی حد سے انہوں نے تجاوز نہیں کیا تھا۔ برطانوی سامراجیت سے ان کا اختلاف کبھی ختم نہیں ہوا۔ علمائے دیو بند کا فرقہ واریت سے گریز کے باوجود تحریک جہاد نے مسلمان فرقہ واریت کو بڑھاوا دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

1857ء کے غدر کے بعد جب پورے ہندوستان پر تاج برطانیہ کی عملداری کا اعلان کر دیا گیا تھا تب برطانوی ہندوستان کی سرکار نے آزادی کے ساتھ اپنے آمرانہ اختیارات سے کام لیا اور فرقہ وارانہ تقسیم کی آگ بھڑکانے کے لئے زیادہ موثر اقدامات کئے کیونکہ اب فضا اس کے لئے پوری طرح موزوں تھی۔ نوآبادیاتی حکام نے اس کی ابتدا ہندوؤں کے متبرک شہر بنارس سے کی۔ یہ شہر مسلمانوں کے زمانے میں بھی اتنا ہی متبرک تھا مگر اس زمانے میں بنارس ہندوؤں اور مسلمانوں کا شہر تھا اور وہاں فرقہ وارانہ فضا نہیں تھی۔ غالب بھی بہت دنوں تک بنارس میں رہے تھے اور اپنا زیادہ وقت گنگا گھاٹ کے حسین منظر سے لطف حاصل کرنے میں گزارتے تھے۔ انہوں نے بنارس سے اپنے دوست کو خط میں لکھا تھا کہ کیا کروں گنگا گھاٹ پر بیٹھ گیا ہوں اب تو جی یہ چاہتا ہے کہ گیروے رنگ کا لباس پہن لوں، ماتھے پر سندور کا ایک ٹیکہ لگا لوں، گلے میں جنیو پہن لوں اور کافر ہو جاؤں۔ بنارس کے حسن کی تعریف میں بھی انہوں نے کئی مثنویاں کہی تھیں۔ صبح بنارس کے حسن کی ترکیب بھی مسلمان شاعروں ہی نے وضع کی تھی جو ہندوستان میں زبان زد خاص و عام ہو گئی تھی۔ بنارس میں انگریز حکام نے علی گڑھ کالج کے قیام سے پہلے ایک کالج بنارس ہندو کالج کے نام سے قائم کیا تھا۔ تعلیمی اداروں میں مذہبی علامتیں جوڑنے کی روایت کو بھی انگریزوں نے ہی بڑھاوا دیا تھا چنانچہ بعض شہروں میں کرسچین کالج بھی قائم تھے۔ ابتدائی مرحلے میں بنارس

ہندو کالج سے بھی انگریز ہی وابستہ رہے تھے۔ یہاں انہوں نے سنسکرت کا شعبہ بھی قائم کیا تھا اور سنسکرت زبان کے احیا کی تحریک کی طرف ہندوؤں کو متوجہ کیا تھا۔ بنارس میں ہندو دانشوروں اور کارکنوں کو بھی انگریزوں ہی نے منظم کیا تھا اور ان کو باور کرایا تھا کہ ہندوؤں کی مذہبی زبان ہندی اور سنسکرت کی نشو ونما کے راستے مسلمان حکمرانوں، امراء اور علماء نے بند کر دیئے تھے۔ ہندی اور سنسکرت زبان کو زندہ و فعال بنانے اور بڑھاوا دینے کے لئے ضروری ہے کہ ہندو مسلمانوں کی اردو زبان کو ترک کر دیں جس پر اسلامی رنگ حاوی ہے۔ انگریزوں کے پاس طاقتور اور منظم انگریزی پریس بھی تھا چنانچہ اردو کی مذمت اور ہندی و سنسکرت کی حمایت میں باقاعدگی کے ساتھ مضامین، تبصرے اور خطوط ان انگریزی اخبارات میں چھپنے لگے جس کا یہ اثر ہوا کہ ہندوؤں نے بھی اس موضوع پر مضامین اور خطوط لکھنا شروع کر دیئے۔ 1860ء تک لسانی فرقہ واریت کا یہ تنازعہ اتنا پھیل گیا کہ الٰہ آباد اور بنارس میں درجنوں ناگرک سبھائیں بن گئیں اور انہوں نے پُر ہجوم احتجاجی جلسے شروع کر دیئے جن میں اردو کو ہٹا کر ہندی کو رائج کرنے کی مانگ کی جاتی تھی۔ اب اس تحریک میں بہت سے معروف اردو داں ہندو بھی شامل ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ سرسید کے قریبی ساتھی بھی تھے جیسے بھارتیندو۔ انہوں نے جب سرکاری کمیشن کے سامنے اردو کے خلاف بیان دیا تو سرسید حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ اس طرح فرقہ وارانہ لسانی فضا اترپردیش اور بہار تک پھیل گئی تھی۔ مسلمانوں کی طرف سے اردو کے حق میں 1867ء تک کوئی تحریک نہیں تھی۔ اسی زمانے میں بہار کے انگریز گورنر نے اردو اور مسلمانوں کے خلاف بہت سخت بیان دیا تھا اور بہار کی سرکار کو حکم دیا تھا کہ وہ دفتروں اور عدالتوں میں جہاں ضروری ہو ہندی بھی استعمال کرے۔ اس طرح انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو مراکز بنارس اور علی گڑھ کے درمیان ٹکراؤ (Polarisation) کو بڑھاوا دیا تھا۔ اس حقیقت سے آپ انکار نہیں کر سکتے کہ 1866ء تک سرسید نے ہندو مسلمان اور ہندی و اردو ایکتا کے حق میں ہندوستانی عوام کی رائے کو ہموار کرنے کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں داؤ پر لگا دی تھیں۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ لفظ ہندو کے معنی ہندو دھرم نہیں بلکہ وہ سب لوگ ہیں جو ہندوستان میں رہتے ہیں۔ اس ان تھک جدوجہد کے باوجود ان کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ فرقہ واریت کا زہر اب اتنا پھیل چکا ہے کہ یہ جدوجہد کارگر ثابت نہیں ہوگی تاہم 1867ء تک گیند کو انہوں نے ہندوؤں اور انگریزوں ہی کے علاقے میں رہنے دیا تھا۔

1867ء میں آخرکار یہ فرقہ واریت رنگ لائی اور جس فصل کے بیج جان گلکرائسٹ نے 1800ء میں بوئے تھے اس کی فصل پک کر تیار ہو گئی تھی۔ الہ آباد اور بنارس میں ہندی اردو اور گائے حلال کرنے کے مسئلے پر بہار میں ہندو مسلمان فرقہ وارانہ دنگے پھوٹ پڑے تھے۔ سرسید کے پاس بھی اب کوئی راستہ نہیں تھا سو انہوں نے اردو اور مسلمانوں کے حقوق کی مانگ اٹھائی، پہلی بار اردو کو مسلمانوں کی زبان اور مسلمانوں کو ایک الگ قوم قرار دیا۔ موقف کی اس اچانک تبدیلی پر ڈپٹی کمشنر شیکسپیئر نے بھی حیرت کا اظہار کیا تھا۔ موقف میں تبدیلی کے باوجود پاکستان کے مورخوں اور نصاب بنانے والوں کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ وہ دو قومی نظریئے کے بانی تھے۔ سرسید نے ہمیشہ مسلمانوں کو ہندوستانی ہی قرار دیا۔ ان کے ذہن میں دو مختلف مذاہب کی پیروکار قوموں کی بنیاد پر ہندوستان کے بٹوارے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ان کی صرف یہ مانگ تھی جو معروضی حالات کے تناظر میں بالکل صحیح بھی تھی کہ ہر شعبے میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے حقوق دیئے جائیں۔ 1938ء کے اوائل تک مسلم لیگ کے لائحہ عمل میں شامل نہیں تھا۔ فرقہ واریت سے دور رہنے کے باوجود سرسید کا موقف فرقہ وارانہ تنازعے میں مزید بڑھاوے کا سبب بنا تھا۔ انگریز سامراجیت نے ہندو اور مسلمان اہل الرائے کو جبر کے ایک ایسے موڑ پر لا کر چھوڑ دیا تھا جہاں فرقہ واریت سے اختلاف کے باوجود دونوں رہنما اس سے معاملہ کرنے پر مجبور تھے۔ ان حالات میں علی گڑھ اور آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اسی موقف کے حامی ہو گئے تھے جس کو 1906ء میں آل انڈیا مسلم لیگ نے اختیار کر لیا تھا اور علی گڑھ جیسا کہ بعد میں قائداعظم نے کہا تھا تحریک پاکستان کا ہراول دستہ بن گیا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کو مسلمان جاگیرداروں کی قیادت بھی علی گڑھ نے ہی فراہم کی تھی کیونکہ پنجاب اور سندھ کے اکثر جاگیرداروں کی اولادیں علی گڑھ سے فارغ التحصیل تھیں۔

فرقہ واریت کی فضا میں شدت کے باوجود 1930ء تک مسلمان مذہبی علماء کی طرف سے ایسی کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی تھی جس میں ہندو دشمنی کا عنصر ہو بلکہ بیشتر مسلمان علماء ہندوؤں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے سید اسمٰعیل شہید کی تحریک جہاد کے اثرات کو علمائے دیوبند نے زائل کر دیا تھا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے اسلامی سوشلزم کا جو لائحہ عمل مرتب کیا تھا اس میں ان کی ہندو دشمنی کا پہلو جڑا ہوا تھا۔ علمائے دیوبند خصوصاً مولانا عبیداللہ سندھی نے اس پہلو کو نظرانداز کر کے

ان کے لائحہ عمل کو سیکولر بنیاد پر استوار کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ ولی اللہ کی ہندو دشمنی کا پہلو بالکل دب گیا تھا اور اس وقت نظروں سے اوجھل رہا تھا جب تک کہ اپنے قیام کے بعد جماعت اسلام اس پہلو کو دوبارہ برسر عام نہیں لائی تھی۔ 1938ء تک کی ہندوستانی تاریخ کا احتیاط کے ساتھ تجزیہ کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہندو مسلمان اور ہندی واردوا یکتا کو برقرار رکھنے کے لئے مسلمان علماء، اہل الرائے اور رہنماؤں نے بڑی کوشش کی تھی مگر کٹر پنتھی ہندو قوتیں اور کانگریس کے اندران کا عمل دخل ہندو فرقہ وارانہ رجحان ہی کو بڑھاوا دے رہا تھا۔ مسلمان علماء، اہل الرائے اور رہنماؤں کی طرف سے جتنی بھی تجاویز پیش کی گئی تھیں ان سب کو کانگریس نے مسترد ہی کیا تھا۔ کانگریس کے سرکردہ نیتا آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کے حقوق متعین کرنے پر کبھی راضی نہیں ہوئے اور صرف زبانی یقین دہانیوں پر ہی کام چلاتے رہے۔ اس کے باوجود قوم پرست مسلمان علماء اور اہل الرائے کی خاصی بڑی تعداد آخر تک کانگریس میں شامل رہی تھی۔

انیسویں صدی کے آخری برسوں میں ہندوستانی مسلمان بڑے جوش وخروش سے پان اسلامی تحریک میں آ گئے تھے۔ سرسیدؔ کی وفات ہو چکی تھی مگر چونکہ پان اسلامیان یورپی نوآبادیاتی سامراج کے دشمن تھے اس لئے علی گڑھ کے کرتا دھرتاؤں نے ان سے اختلاف کیا تھا اور طالب علموں کو اس تحریک میں حصہ لینے سے منع کیا تھا۔ پھر بھی کچھ پُر جوش نوجوان طالبعلم اس تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ (مولانا محمد علی اور حسرت موہانیؔ وغیرہ)۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ علی گڑھ پوری طرح تحریک پاکستان کا مرکز بنا رہا تھا۔ اس تعلیمی ادارے میں سوشلسٹ اور قوم پرست مسلمان طالبعلم بھی تھے۔ بیسویں صدی کی پہلی چوتھ کے دوران ہندوستان سے برطانوی سامراج کو نکال باہر کرنے کی تحریکات پر جس کا ابھار خلافت تحریک تھی مسلمانوں ہی کا غلبہ رہا تھا۔ برطانوی ہندوستان کی سرکار نے اپنے خلاف بڑھتی ہوئی مزاحمتی تحریک سے نبٹنے کے لئے ہندوؤں کی کٹر پنتھی دھرم وادی فرقہ وارانہ قوتوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔ اپنے اقتدار اور سیاسی و اقتصادی مفادات کو تحفظ دینے کے لئے سرکار نے ان قوتوں کو منظم کیا تھا۔ آریا سماج، راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ اور ہندو مہاسبھا تنظیمیں قائم ہو گئی تھیں۔ دوسری طرف مسلمانوں میں فرقہ وارانہ اشتعال کو ابھارنے کے لئے برطانوی حکام ہندو مسلمان فسادات بھی کروا رہے تھے۔

1900-1920ء کے دوران ان فسادات کی تعداد سولہ تھی یعنی بیس برسوں کے دوران سولہ جب کہ 1923-1926ء کے دوران تین برسوں تک ان کی تعداد چھتر ہو گئی تھی۔ 1930ء تک مسلمان کٹرپنتھی علماؤں کی بھی کوئی ایسی جماعت موجود نہیں تھی جو دین ملائی سبیل اللہ فساد کے حق میں ہو۔ غریب ہندو اور مسلمانوں کی اکثریت بھی بے بس اور نہتی تھی۔ یہ حقیقت بھی قطعی مسلم ہے کہ عوام کی اکثریت فسادات کرواتی نہیں ہے بلکہ ان کو روکتی ہے۔ فسادات ہمیشہ حکمراں، حزب اختلاف و حزب اقتدار اپنے سیاسی و اقتصادی اور طبقاتی مفادات کو پورے کرنے کے لئے ہی کرواتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فسادات برطانوی سرکار ہی کروا رہی تھی جس کی معاون ہندو کٹرپنتھی جماعتیں تھیں۔ ڈپٹی کمشنروں کے سرکاری فرائض میں ایک فرض یہ شامل تھا کہ وہ فسادات کے لئے فضا بنائیں۔ اس گمبھیر مسئلے پر بیان دیتے ہوئے گاندھی نے کہا تھا کہ یہ پُراسرار دھا کہ چوکڑی ان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس قسم کے بیانات میں وہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اپنی بدلتی ہوئی پالیسیوں کے ذریعہ برطانوی سامراجیت ہی کے مفادات کو تقویت پہنچاتے تھے۔ 1920ء کے بعد ہندوستان میں دو ایسی ملک گیر تحریکات ابھریں جو ہندوستان میں برطانوی سامراج کے لئے پہلی بار سنگین خطرہ بنی تھیں اول خلافت اور دوم سوشلسٹ تحریکات۔ گاندھی، قائداعظم اور کانگریس و مسلم لیگ کے اہم لیڈران بھی سوشلسٹ تحریک کے خلاف تھے اس لئے وہ برطانوی سامراجیت کی سوشلسٹ دشمنی کی وجہ سے اس کے ساتھ تعاون بھی کرتے تھے۔

پان اسلامیوں کا مقصد تمام دنیا پر مسلط یورپی سامراج کے خلاف باغیانہ رجحان کو ابھارنا تھا۔ ہندوستان میں پان اسلامی قیادت بھی ہندو مسلم ایکتا کی پرچارک تھی مگر ہندوؤں نے اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی تھی انگریز حکام ہندوؤں کے اس غیر جانبدارانہ طرز عمل سے بہت مطمئن تھے۔ پان اسلامی تحریک کے پیچھے چونکہ فرقہ وارانہ حسیّت کارفرما نہیں تھی اس لئے ہندوستانی سماج میں اس نے ہندو مسلم تضاد کو جنم نہیں دیا تھا۔ برطانوی سامراج نے جب خلافت عثمانیہ پر دھاوا بولا تھا تو ہندوستان کی فعال مسلمان قیادت نے اسے بنیاد بنا کر خلافت تحریک شروع کی تھی۔ خلافت تحریک کا موضوع اگرچہ مسلمانوں ہی کا مسئلہ تھا مگر اس کے پیچھے اصل مقصد ہندوستان پر برطانوی راج کی کمر توڑنا ہی تھا۔ برطانوی سامراج ترکی اور عرب علاقوں پر اپنا تسلط

جمانے کے لئے خلافت کا خاتمہ چاہتا تھا۔ قائداعظم اور اقبال نے جو بعد میں مذہب کے سیاسی استعمال کے پرچارک ہو گئے تھے۔ خلافت کے بارے میں قائداعظم کا موقف تھا کہ وہ ایک مذہبی تحریک ہے جس کے نتیجے میں فرقہ واریت برپا ہوگی۔ خلافت تحریک سے اختلاف کیا تھا۔ اقبال ہر اس سیاسی موقف میں فریق بننے سے احتیاط برتتے تھے جس سے برطانوی سامراج کے خفا ہو جانے کا امکان ہو اسی لئے انہوں نے خطبہ الہٰ آباد میں "چاہے برطانوی وفاق میں رہتے ہوئے" کا جملہ شامل کرلیا تھا۔ محمد علی جوہر کی اشتعال انگیز سامراج شکنی سے ان کا عدم اتفاق اسی وجہ سے تھا۔ قائداعظم کا موقف بالکل غلط ثابت ہوا۔ خلافت تحریک کے ابھار نے ہندو مسلم ایکتا دوبارہ پیدا کر دی تھی۔ اس ایکتا نے ہندوستان میں برطانوی سامراج کی نیندیں حرام کر دی تھیں کیونکہ اس میں برطانوی سامراج کی حامی ہندوستان کی جاگیردار، سرمایہ دار، کٹر پنتھی ہندو مذہبی اور کاروباری قوتوں کو ہندو و مسلمان عوام کی اجتماعی قوت نے دیوار سے لگا دیا تھا۔ گاندھی اور کانگریس کی قیادت ہندو عوام کی اکثریت کو بھی خلافت تحریک میں لے آئی تھی اور یہ حقیقت ایک بار پھر ثابت ہوگئی تھی کہ اپنے عقائد پر سختی سے قائم رہنے والے عوام کی اکثریت میں فرقہ واریت کے جراثیم نہیں ہوتے ہیں۔ برطانوی سامراج نے 1860-1800ء کے دوران اپنی سیاسی چالوں اور اسٹریٹجک منصوبوں کو بروئے کار لا کر ہندوستان کو ہندو مسلم فرقہ واریت کا گڑھ بنا دیا تھا اس میں پہلی بار بلکہ آخری بار بھی ہندو اور مسلمان ایک ہو کر برطانوی سامراج پر پل پڑے تھے اور انگلستان کے سرمایہ داروں اور اس کی منڈی معیشت کو سخت دھچکا پہنچا تھا۔ 1920ء کے زمانے میں ہندوستانی مسلمان عوام کو برطانوی سامراج کے خلاف متحرک کرنے کے لئے ترک خلافت کے مسئلے کا استعمال ہی صحیح بھی تھا۔ اس مسئلے کو خواہ مخواہ مذہب سے نتھی کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ ترک خلافت کا خاتمہ برطانوی سامراج کے منصوبے کا حصہ تھا اور برطانوی سامراج نے ترکی کو سویٹ یونین کے خلاف اپنے مفادات پورے کرنے کے لئے اپنے دلال اور اتحادی بنا لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نوآبادیاتی سامراج کے زوال کے بعد حکمراں امریکی سامراج نے مشرق وسطی میں ترکی اسرائیل سامراجی محور قائم کر دیا تھا۔ خلافت تحریک کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں برطانوی سامراج تیز رفتار سے مقبول ہوتے ہوئے سوشلسٹ نظریئے کے خوف میں بھی مبتلا تھا۔ جس کا کچھ عمل دخل خلافت تحریک میں بھی تھا۔ برطانوی سامراج کو ان حالات میں زمین پیروں تلے

سے کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔اس کے پاس کوئی فوری متبادل راستہ اس کے علاوہ نہیں تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات ہوں سوا اپنے اختیارات اور سرکاری وسائل کو بروئے کار لاکر فسادات کروائے اور اس طرح اہسا کے پرچارک گاندھی کی کمزوری کا فائدہ اٹھایا۔انہوں نے فسادات کی باڑھ کو روکنے کے لئے خلافت تحریک کے خاتمے کا اعلان کردیا۔ان کا یہ بروقت اعلان برطانوی سامراج کے لئے زندگی کا سندیسہ لے کر آیا اور بھاگنے کا ارادہ کرنے والے برطانوی سامراج نے ہندوستان میں یہ سوچ کر دوبارہ قدم جمالئے کہ۔

''جب تک بس چل سکے ساغر چلے''

لیکن اب ہندوستان میں کیمونزم کا بھوت خوف بن کر ان پر سوار تھا اور اس سے نبٹنے کے لئے مذہبی ولسانی فرقہ واریت کو دوبارہ زندہ و فعال کرنا ان کے لئے ضروری تھا۔اس وقت تک مسلمان علماء کی جماعتوں میں جن کا مسلمان عوام پر کنٹرول تھا کوئی جماعت فرقہ واریت کے حق میں نہیں تھی بلکہ سب سے باا ثر ملک گیر جمعیت العلمائے اسلام کٹر سامراج شکن،قوم پرست اور سویت یونین کی طرف جھکاؤ رکھتی تھی۔ جماعت اسلامی ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ دوسری طرف برطانوی سامراج کی مداح کٹر پنتھی ہندو جماعتیں مستحکم ہو چکی تھیں۔ان جماعتوں نے خلافت تحریک میں گاندھی، کانگریس اور ہندوؤں کی شرکت کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور ہندوؤں سے یہ سوال پوچھا تھا کہ مسلمانوں کی مذہبی تحریک میں جس کا مرکز ہندوستان سے باہر کا ترقی تھا انہوں نے کیوں شرکت کی؟ ترکی میں اسلامی خلافت کے دوبارہ قیام سے ان کو کیا دلچسپی تھی؟اسی زمانے میں برطانوی حکام نے وناٹک سردار کرکی برین واشنگ کی کیونکہ خلافت تحریک نے اس کے اندر کے ہندو کو جگا دیا تھا۔اس نے ہندو ہندوستان کی بائبل مرتب کر کے 1923ء میں اپنی کتاب ''ہندتوا'' کے نام سے شائع کی تھی۔اس کی اشاعت کے بعد وہ تمام ہندو کٹر پنتھی پارٹیوں کا اوتار بن گیا تھا۔اس نے بھی ہندوستان کے برطانوی سامراج کی حمایت کی اور تمام جماعتوں کے دھرم

قبضہ کیا تھا اس لئے ہندوستان کے تمام مسلمان غیر ملکی ہیں ان کو یا تو ہندوستان چھوڑ کر چلا جانا چاہئے یا پھر ہندو دھرم قبول کر لینا چاہئے۔ انہوں نے اگر ان دو تجاویز پر عمل نہ کیا تو پھر تربیت یافتہ مسلح ہندو کارسیوک ان کا قتل عام کرنے میں حق بہ جانب ہوں گے۔ اسی دھارمک اصول پر عمل کرتے ہوئے بی جے پی کی سرکار نے 2000ء میں گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام کرایا تھا۔ ان جماعتوں کے عزائم اور ارادوں کے خلاف گاندھی نے بہت سخت ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ ان کے نعرے ''رام راج'' کو جب راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور ہندو مہا سبھا نے اپنے حق میں استعمال کیا تو گاندھی نے 1942ء میں اپنا وضاحتی بیان شائع کروایا اور کہا کہ رام سے ان کی مراد خدا بھی ہے اور گاڈ بھی ہے چنانچہ رام راج کا مفہوم خدائی راج ہے۔ اسی بنیاد پر خان عبدالغفار خان نے خدائی خدمتگار تنظیم بنائی تھی۔ اس اختلاف کے نتیجے میں سوارکر کی ہدایت پر تمام ہندو کٹر پنتھی قوتوں نے گاندھی کو ہندوؤں کا دشمن اور مسلمانوں کا ایجنٹ قرار دے دیا تھا اور ان کو قتل کرنے کا بھی ارادہ کر لیا تھا۔ ان کے قاتل ناتھو رام اور اس کے ساتھیوں نے دو بار سوارکر سے ملاقات بھی کی تھی اور گاندھی کو قتل کرنے کے اپنے منصوبے کی تفصیلات بھی اسے پیش کر دی تھیں۔ گرو کی آشیرواد ملنے کے بعد اس منصوبے کے مطابق جس طرح تیاریاں کی گئی تھیں اس کے کچھ مناظر بالی وڈ کی فلم ''ہے رام'' میں بھی شامل کئے گئے ہیں۔ اسی زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لئے شدھی اور سنگھٹن جیسی تحریکات بھی ان ہی جماعتوں نے شروع کی تھیں۔ بھگت سنگھ اور اس کی تنظیم نوجوان سبھا کی انقلابی سوشلسٹ مشاغل کے بارے میں جانکاری ان ہی کٹر پنتھی ہندو جماعتوں کے ذریعہ برطانوی حکام کو ملتی تھی۔ ان کے برعکس بیشتر مسلمان علماء اور اہل الرائے ہندوستان میں سوشلسٹ نظریئے کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ مولانا آزاد سبحانی اور مولانا حسرت نے کانپور میں ہندوستان کی پہلی کمیونسٹ پارٹی قائم کر دی تھی۔

خلافت تحریک کے چیلنج سے صحیح سلامت بچ نکلنے کے بعد اپنی دوسری جان لیوا سوشلسٹ تحریک کی کمر توڑنے کے لئے برطانوی حکام نے صرف کٹر پنتھی ہندو قوتوں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ کانگریس اور مسلم لیگ سے معاملہ کرنے کے لئے اپنی سیاسی اسٹریٹجی میں بھی بدلاؤ پیدا کیا۔ کانگریس کے اندر قوم پرستوں کے ساتھ ساتھ ایک سوشلسٹ دھڑا بھی شامل ہو گیا تھا جس کو کانگریسی قوم پرست اپنے سیاسی مفاد کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ اس اندرونی توازن کو کاونٹر

کرنے کے لئے کٹر پنتھی ہندو جماعتوں کے حامی بہت سے ہندو بھی چولا بدل کر قوم پرست بن گئے تھے اور کانگریس میں شامل ہو گئے تھے۔ دوسری طرف سوشلزم سے اختلاف رکھنے والے بعض مسلمان علماء مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے ان میں کچھ علمائے دیو بند اور علمائے اہل سنت بھی مسلم لیگ کی حمایت کرنے لگے تھے۔ کانگریس نے سیاسی مصلحت سے کام لیتے ہوئے ہندوستانی سوشلسٹوں کی مخالفت تو نہیں کی مگر سوشلسٹ نظریئے سے ان کا اختلاف ختم نہیں ہوا تھا۔ مسلم لیگ بہر حال سوشلزم کی مخالف رہی تھی۔ اس زمانے میں برطانوی سامراج کے لئے وہ مسلمان علماء قیمتی سرمایہ تھے جنہوں نے سوشلسٹ نظریئے کو مذہب دشمن اور سوشلسٹوں کو دہریہ قرار دیا تھا۔ اس لئے اب مذہب کا کارڈ سوشلزم کے خلاف سیاسی استعمال کے لئے برطانوی سامراج کو مل گیا تھا۔ دوسری طرف ان علماء کو برطانوی سامراج کی آشیر واد مل گئی تھی۔ افسانوی مجموعے انگارے (1934ء) کی اشاعت نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا چنانچہ اس کے خلاف ہندو کٹر پنتھی اور مسلمان کٹر پنتھی قوتوں نے ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ ان کو چونکہ انگریزی پریس کی حمایت حاصل تھی اس لئے انگریزی اخباروں نے بھی انگارے کے خلاف خبریں اور مضامین شائع کئے تھے۔ اس ہنگامے کے بعد سرکار نے انگارے پر پابندی لگادی تھی۔ اسی زمانے میں جمعیت العلمائے ہند سے الگ ہو کر مودودیؒ نے اپنی جماعت اسلامی قائم کی تھی۔ ان کا مشن اسلام کو کمیونزم کی یلغار سے بچانے کے لئے ایک متبادل اسلامی نظریئے کی دریافت تھا۔ انہوں نے جدید مغربی افکار اور سائنس کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ مودودیؒ نے قرآن مجید، احادیث مبارکہ اور فقہ کی تشریحات و تعبیرات کے ایسے بیانیے پیش کئے جن میں مغربی قسم کی جمہوریت، صحت مند جدیدیت، سائنس اور سرمایہ دارانہ نظام کے لئے بھی جگہ موجود ہے جبکہ ان کے مطابق سوشلزم مذہب دشمنوں اور دہریوں کا نظریہ ہے۔ بٹوارے تک تو جماعت نے نظریہ پاکستان، مسلم لیگ اور قائداعظم کی بڑھ چڑھ کر مذمت کی تھی لیکن پاکستان بننے کے بعد اس نے قلابازی کھائی اور قائداعظم، مسلم لیگ نظریہ پاکستان کی مداح ہو گئی تھی۔ بقول جماعت مغرب زدہ اور مذہب سے بے بہرہ قائداعظم اب جماعت کو سچے مسلمان نظر آنے لگے تھے۔ جماعت نے یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی سماج قائم کرنا اس کی ذمہ داری اور اسے سوشلسٹ نظریئے سے بچانا ان کا فرض ہے۔ جماعت نے اپنی تحریک کو جدید مغربی علوم اور سائنس سے واقف مسلمان دانشوروں، شرفاء، اساتذہ اور طالبعلموں

میں پھیلایا تھا جن کے ذریعہ مذہبی فرقہ واریت اور سوشلسٹ دشمنی کی تحریک کو بڑھاوا دینا آسان تھا۔

ہندوستان میں فرقہ وارانہ جنون کا جو بہاؤ خلافت تحریک کے بعد شروع ہوا تھا اس کی شدت میں مسلم لیگ کی قیادت نے اور زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ فرقہ واریت، سیاست میں مذہب کے استعمال کے مخالف اور ہندو مسلمان ایکتا کے سفیر قائداعظم نے 1935ء کے بعد سیاست میں مذہب اور دوقومی نظریے کے استعمال کو سیاسی لائحہ عمل کا حصہ بنالیا تھا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کانگریس کی قیادت نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ ان کو مجبوراً اپنا موقف بدلنا پڑا تھا تاہم وہ مذہب، اردو اور مسلمان اقلیتی صوبوں کو سیاست میں استعمال کئے بغیر بھی اقتصادی وانسانی حقوق اور حق خودارادی کی بنیاد پر پاکستان حاصل کر سکتے تھے۔ اقبال نے بھی ان کو رائے دی تھی کہ وہ مسلم لیگ کا مرکز پنجاب کو بنائیں اور مسلمان سماج کی سوشلسٹ اقتصادی بنیاد پر تشکیل کو ترجیح دیں۔ ان تجاویز کا کوئی جواب قائداعظم نے نہیں دیا تھا۔ ان بنیادوں پر پاکستان حاصل کرنے کے لئے ان کو سوشلسٹ سیاست سے کام لینا پڑتا مگر وہ برطانوی جمہوریت اور سرمایہ دارانہ نظام کے حامی تھے اور اس جمہوری سامراجی سیاست میں مذہبی ولسانی فرقہ واریت کا سیاسی استعمال ضروری ہوتا ہے۔ پاکستان کی تحریک کو مسلمان اکثریتی صوبوں تک محدود رکھنے کا کوئی فائدہ اس لئے نہیں تھا کہ ان صوبوں پر بٹوارے تک کانگریس حاوی تھی۔ مسلم لیگ کو ان علاقوں میں تھوڑی بہت حمایت سندھ اور زیادہ مسلم بنگال میں ضرور حاصل تھی مگر پنجاب، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اس کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ہی جماعتیں عوام کے مفادات کی نمائندہ نہیں تھیں البتہ ان کو اپنی سیاست میں منزل تک پہنچنے کے لئے استعمال ضرور کر رہی تھیں۔ کانگریس قوم پرست ہندو سرمایہ داروں، کاروباریوں اور پڑھی لکھی اشرافیہ کے مفادات کی نمائندہ تھی اسی لئے اس نے ہندوستان سے جاگیردارانہ نظام کو ختم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس وعدے کی وجہ سے مسلمان جاگیرداروں، نوابوں، زمینداروں اور نوکر پیشہ اشرافیہ میں عدم تحفظ کا احساس بڑھا کیونکہ سرمایہ دار اور کاروباری طبقہ مسلمانوں میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ طبقہ جو مزاجاً برطانوی سامراج کا مداح بھی تھا مسلم لیگ میں شامل ہو گیا اور یوں مسلم لیگ اس کے مفادات کی ترجمان بن گئی۔ دونوں ہی

جماعتوں نے اپنے حامی طبقے کے مفادات کو پورا کرنے کے لئے اپنی سیاست میں مذہبی اور لسانی فرقہ واریت کو استعمال کیا۔ کانگریس نے ہندوستانی قوم پرستی اور سیکیولرازم کا لباس پہن کر اور مسلم لیگ نے کھلے عام۔ پاکستان بن جانے کے بعد مسلمان ہندوستانی جاگیرداروں، نوابوں، اشرافیہ اور زمینداروں کو یقین تھا کہ ان کو اپنی کھوئی ہوئی جاگیریں، جائیداد، ملازمتیں اور گھر مل جائیں گے اور ہوا بھی یہی تھا۔ جبکہ بعد 1947ء جو مسلمان نواب جاگیردار اور نوکر پیشہ اشرافیہ ہندوستان میں رہ گئی تھی تباہ و برباد ہو گئی تھی۔ پاکستان میں بھی ساری تباہی اور بربادی کا بوجھ عام اکثریت ہی کو جھیلنا پڑا تھا اور آج تک وہ یہ بوجھ جھیل رہی ہے۔

ہندوستان کے بٹوارے کا جواز پیدا کرنے کے لئے اور فرقہ وارانہ نفرت و دشمنی ایک تاریخی حقیقت کے طور پر دونوں ملکوں کو منتقل کرنے کے لئے ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ملک گیر پیمانے پر برپا ہونے والے ہندو مسلمان فرقہ وارانہ فسادات کا تماشہ دیکھا۔ مسلم لیگ نے ان کی مذمت کرنے کی بجائے یہ موقف اختیار کیا کہ ان فسادات نے مسلم لیگ کے سیاسی موقف کی سچائی کو سند فراہم کر دی ہے۔ ماؤنٹ بیٹن کی تحویل میں بہت بڑی، منظم اور تربیت یافتہ فوج تھی مگر اسے اس نے فسادات پر قابو پانے کے لئے استعمال نہیں کیا۔ حیرت ہے کہ اتنی بڑی فوج اور پولیس بھی آخری وقت تک برطانوی سامراج کے ساتھ اپنی وفاداری نبھاتی رہی تھی۔

فرقہ وارانہ پاگل پن کی اس فضا میں ہندوستان کا بٹوارہ ہو گیا اور دونوں ملک نوآبادیاتی سامراج کے چنگل سے آزاد ہو کر نئی امریکی نوآبادیاتی سامراجیت کے جال میں پھنس گئے۔ ہندوستان سرمایہ داروں، کاروباریوں اور کٹر پنتھی ہندو فرقہ وارانہ قوتوں کے ہاتھ آ گیا جن کے سامنے سب سے بڑا دشمن اب پاکستان تھا۔ پاکستان نوابوں، جاگیرداروں، نوکر پیشہ اشرافیہ اور کٹر پنتھی علمائے سُو کی جنت بن گیا جن کے سامنے سب سے بڑے دشمن ہندوستان، ہندو اور سویٹ یونین تھے۔ اس دشمنی کو دونوں ملکوں کی حکومتوں نے اپنی سیاسی اور دفاعی پالیسیوں کی بنیاد قرار دیا اس لئے دونوں حکومتوں نے کٹر پنتھی فرقہ وارانہ قوتوں کی بھی سرپرستی کی سابق نوآبادیاتی اور بعد میں نئی نوآبادیاتی امریکی سامراجیت نے جس تسلسل اور نظم و ضبط کے ساتھ پسماندہ اور نیم ترقی پذیر ملکوں میں طبقاتی، نسلی، ثقافتی، لسانی اور مذہبی فرقہ واریت کا عالمی سطح پر استعمال کیا اور اب تک کر رہی ہے اور اپنی پسند کے بنائے ہوئے ان ملکوں کے حکمرانوں کے ذریعہ نفرت و دہشت اور قتل

و غارت گری کا جو بازار گرم کئے ہوئے ہے ان کی سب سے بڑی مخالف صرف عوام کی بڑی اکثریت ہی ہے۔ یہ اکثریت ہی ہر کڑے وقت میں سماجی رشتوں کے سیکولر انداز کا بھرپور مظاہرہ بھی کرتی ہے اور اس کے لئے قربانیاں بھی پیش کرتی ہے۔ تاریخ اس حقیقت کو سند فراہم کرتی ہے کہ فرقہ واریت کا مذاہب اور زبانوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہے کیونکہ ہر ملک کے عوام اپنے عقائد پر سختی سے قائم رہنے کے باوجود دوسرے مذاہب کے لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔ مذہبی اور لسانی فرقہ واریت کا سیاسی استعمال اعلیٰ مراعات اور حکمراں طبقے کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کا ایک مئوثر ہتھیار ہے جس کے لئے وہ فرقہ وارانہ مذہبی اور لسانی و علاقائی قوتوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ اگر عام اکثریت قومی و سیاسی اور انتظامی ڈھانچے میں ہو تو فرقہ واریت کا جن بوتل میں بند ہو جائے گا۔ اسی لئے 1947ء کے بعد سے اب تک عام اکثریت کو ان پڑھ، پسماندہ، غریب اور نہتا ہی رکھا گیا ہے جس کی شرح میں بڑھوتری ہی ہوتی چلی جارہی ہے۔ قدیم زمانوں کی تاریخ گو کہ سامراجی تسلط ہی کی تھی مگر ان زمانوں میں فرقہ واریت نہیں تھی کیونکہ زرعی اور گھریلو صنعت کے پیداواری رشتے فرقہ وارانہ رجحان کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ فرقہ واریت کا سیاسی استعمال یورپی صنعتی انقلاب کی ضرورت تھی۔ نوآبادیاتی سامراجیت کے پہلے مرحلے کے دوران جو ہندوستان میں 1800ء کے لگ بھگ تمام ہوا تھا ایسٹ انڈیا کمپنی نے کمپنی کے حکام نے ہندوستانی تہذیب، زبانوں، سماجی طور طریقوں، مغل زمانے کے طرز انتظام اور نظام تعلیم کو جاری رکھا تھا۔ کمپنی میں ملازمت کے لئے انگلستان سے آنے والوں پر لازم تھا کہ وہ پہلے فارسی، ہندی اور اردو زبانیں سیکھیں اور پڑھیں۔ صنعتی انقلاب کے بعد جب پیداواری رشتوں کا نیا روپ ابھرا اور منڈی معیشت نے نئے تقاضوں کو جنم دیا تب مغرب کی سرمایہ دارانہ سیکولر جمہوریت نے لسانی و مذہبی اور نسلی فرقہ وارانہ حسیّت کا اپنے مفادات پورے کرنے کے لئے استعمال شروع کیا تھا۔ یہ نظام پڑھا لکھا جو متوسط طبقہ پیدا کرتا ہے وہ ملازمتوں اور آمدنی کے وسائل تک پہنچنے کی دوڑ میں لسانی، علاقائی، نسلی اور مذہبی فرقہ واریت سے معاملہ کرتا ہے۔ مزید دیکھئے (حمزہ علوی کا مقالہ) سویٹ یونین اور سوشلسٹ ملکوں میں فرقہ واریت کی ناموجودگی کا سبب جیسا کہ امریکی اور یورپی سامراجیوں کا پروپیگنڈہ تھا ریاستی جبر ہرگز نہیں تھا بلکہ ریاست کا بلا امتیاز ہر شہری کو تمام حقوق، سہولتیں و مراعات اور خدمات کا فراہم کرنا تھا۔ ہر شہری کو یہ آزادی تھی کہ وہ اپنے مذہبی

معمولات پر کھلے عام عمل کرے مگر جب 1980ء میں امریکی سامراج کو سویٹ یونین کے اندر ہی وفادار غدار دستیاب ہو گئے تھے تو انہوں نے سب سے پہلے فرقہ وارانہ اور لسانی تضادات ہی کو ہوا دی تھی۔ پولینڈ میں اس فرض کی انجام دہی کا پورا منصوبہ امریکی صدر ریگن نے پاپائے روم کو سونپا تھا۔ اس کے بعد سے انہدام تک سویٹ یونین، یوگوسلاویہ، پچھمی جرمنی اور البانیہ میں جو فرقہ وارانہ دنگے ہوئے ان سب کا سرپرست امریکی سامراج تھا جس نے دیوار برلن کے انہدام کو عالمگیر سامراج کی ہیروازم کا استعارہ بنادیا تھا۔ اب آپ اس حقیقت کا ادراک کرسکیں گے کہ فرقہ واریت کی مختلف قسموں کا سابق نو آبادیاتی سامراجیت سے کیا رشتہ تھا اور آج کے زمانے میں نئی نو آبادیاتی عالمگیر سامراجیت سے کیا رشتہ ہے اور علاقائی قوم پرست و کٹر پنتھی مذہبی قوتیں ان کی آنکھ کا تارا کیوں بنی رہتی ہیں۔

# کتابیات اور حوالے


اوم پرکاش پرشاد ڈاکٹر۔ اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر (ہندی کتاب)۔ اردو ترجمہ، فکشن ہاؤس لاہور 2002ء۔

اوم پرکاش پرشاد ڈاکٹر۔ انیسویں شتابدی کا بھارت (ہندی مضمون)۔ خدا بخش لائبریری جرنل۔ پٹنہ جولائی 2001ء۔

ایڈورڈ سعید۔ اوریئنٹلزم رینڈم ہاؤس۔ نیو یارک 1978ء۔

اعجاز احمد۔ اِن تھیوری۔ نیشن اینڈ نیشنلزم۔ ورسو لندن 1992ء۔

الاکنڈ پٹیل۔ گجرات کی درگھٹنا۔ اکنامک اینڈ پالیٹیکل ریویو۔ ممبئی 14-دسمبر 2002ء۔

اے۔ ملر۔ الکونڈر رڈوف۔ کانن گیٹ پریس۔ لندن 1992ء۔

اے۔ جی۔ نورانی۔ دی ٹرائیل آف بھگت سنگھ۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن 1992ء۔

انوشہ آصف۔ پنجر، تقسیم ہند پر ایک منفرد فلم۔ روزنامہ ایکسپریس کراچی 17- جنوری 2004ء۔

احمد خان سرسید۔ ہندو اور مسلمانوں میں ارتباط۔ مقالات سرسید جلد 15، لاہور 1963ء۔

اسٹیفن ہاؤ۔ دی پالیٹکس آف کالونیلزم (ماؤنٹ بیٹن اور امریکہ کا کردار) بلیک ویل لندن 1994ء۔

ان دھتی رائے۔ دی گاڈ آف اسمال تھنگس (ناول) فلیمنگو لندن 1997ء۔

اچن ونائک۔ دی فیوریز آف انڈین کمیونلزم، ورسو لندن 1997ء۔

اولیور رائے۔ دی فیلیور آف پولیٹیکل اسلام، کیمبرج یونیورسٹی پریس 1994ء۔

ایلن ڈگلس۔ ریلیجن اینڈ پولیٹیکل کان فلکٹ ان ساؤتھ ایشیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی 1993ء۔

اقبال احمد شریف۔ وہن وِل دی جماعت اسلامی لرن۔ دلت وائس بنگلور 31-16۔ اگست 1991ء۔
ابوسلمان شاہ جہاں پوری۔ شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری۔ خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ۔ جنوری مارچ 2003ء۔
برانڈ اکاس مین۔ سیکولرازلاسٹ سنگھ۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی 1999ء۔
بریوس گرام۔ ہندو نیشنلزم اینڈ انڈین پالیٹکس۔ کیمبرج یونیورسٹی پریس 1963ء۔
بوبی ایس سید۔ اے فنڈامینٹل فیئر۔ زیڈ بکس لندن 1995ء۔
پرشانت کانت۔ مسلمان کال میں ہندووگیاں۔ ہندی مضمون۔ خدا بخش لائبریری جرنل ستمبر 2002ء۔
پارتھا چیٹرجی نیشنلسٹ تھاٹ اینڈ دی کالونیل ورلڈ۔ لندن 1986ء۔
تے پیوتمین۔ ہندو احیا پسندی اور ہندتو اتحریک۔ سہ ماہی تاریخ لاہور اکتوبر 2002ء۔
جان کے کولی۔ ان ہولی وارس۔ پلوٹو پریس لندن 1998ء۔
خضر ہمایوں۔ ہندوستان میں مسلمان سوشلسٹ تحریک کی تاریخ۔ وینگارڈ۔ لاہور 2002ء۔
حمزہ علوی۔ تخلیق پاکستان میں سماجی قوتیں اور نظریہ۔ سہ ماہی تاریخ لاہور اکتوبر 2002ء۔

حمزہ علوی اس زمانے کے عالمی شہرت یافتہ بعد نوآبادیاتی مارکسی دانشور اور تجزیہ کار ہیں۔ ان کی آراء سے اختلاف کرنا بہرحال چھوٹا منہ اور بڑی بات کہا جا سکتا ہے تاہم راقم کو زیر نظر مضمون کی دو آراء سے اختلاف ہے اول کہ خلافت تحریک پر مذہب کا غلبہ تھا۔ تقریباً ایسا بالکل نہیں تھا کیونکہ اس کے روح رواں مولانا محمد علی جوہر خود ہندوستانی قوم پرست اور سیکولر مزاج رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ کانگریس میں بھی رہے تھے اور مسلم لیگ میں بھی۔ گاندھی سے ان کے ذاتی دوستانہ مراسم اتنے گہرے تھے کہ وہ دہلی آ کر مولانا ہی کے گھر میں قیام کرتے تھے۔ کسی بات پر اگر غصے میں آ جاتے تھے تو اپنے دوست کو برملا پھٹکارتے تھے۔ گاندھی نے ان سے ایک بار اپنی غلطی پر معذرت بھی کی تھی۔

جمعیت العلمائے ہند اپنی قدامت پرستی کے باوجود فرقہ وارانہ جماعت نہیں تھی کیونکہ ہندوستانی قوم پرستی، سوشلسٹ قوتوں کے ساتھ تعاون اور سامراج شکنی اس کا 1947ء تک موقف رہا تھا اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ جمعیت العلمائے ہند کی سب سے زیادہ مذمت مسلم لیگ کے لیڈروں ہی نے کی تھی، ان کی کردار کشی کی تھی اور ان پر یہاں تک الزامات لگائے تھے کہ وہ ہندوؤں کے دوست تھے اور وندے ماترم کے ترانے میں شریک ہوتے تھے۔ اس پروپیگنڈے کی شدّت اتنی تھی کہ قوم پرستی کے حوالے سے علامہ حسین احمد مدنی کے ایک بیان کی اقبال نے مذمت کی تھی اور ان کے خلاف ایک قطعہ بھی کہا تھا۔ جن دیوبندی علماء نے مسلم لیگ کا دامن تھاما تھا وہ اصل میں قوم پرستی، سیکیولرازم اور سوشلزم کی طرف دیوبندی علماء کے جھکاؤ سے اختلاف رکھتے تھے۔ بٹوارے کے بعد باغی علماء کے اسی حلقہ نے جمعیت العلمائے پاکستان قائم کی تھی اور جماعت اسلامی سے ان کا سمجھوتہ بھی ہو گیا تھا۔

1938ء کے بعد قائداعظم نے مذہب کو سنجیدگی کے ساتھ سیاست میں استعمال کیا تھا۔ آزادی کے بعد ان کی جس تقریر پر بہت زیادہ انحصار کیا جاتا ہے اس کو اگر ان کا تمام تقریروں کے تناظر میں تجزیہ کیا جائے تو یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ وہ پاکستان کو ایک جدید اسلامی ریاست بنانے کے حق میں تھے۔ اسلام کا تفصیل کے ساتھ ذکر ان کی بیشتر تقریروں میں ملتا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس دعوے میں کتنی حقیقت ہے مگر ضیا الحق کے زمانہ اقتدار میں جماعت اسلامی کے امیر مولوی میاں محمد طفیل نے اپنے اخباری بیان مطبوعہ جنگ میں کہا تھا کہ قائداعظم نے پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی ذمہ داری مولانا مودودی کو سونپ دی تھی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ مسلمان عوام کی بڑی اکثریت میں فرقہ واریت کا رجحان

نہیں تھا، 1947ء کے بعد نہیں ہوا اور اب تک نہیں ہے لیکن پاکستان کے حکمرانوں، بیوروکریٹس، جاگیردار، دائیں بازو کے دانشور و مورخ اور اساتذہ 1938ء کے بعد فرقہ وارانہ آلودگی میں پھنس گئے تھے۔ اس زمانے میں اردو شعراء نے مسلم لیگ کی حمایت میں جو ترانے گائے تھے ان میں بھی پاکستان کو سرزمین اسلام اور قائداعظم کو ملت اسلامیہ کا پاسبان کہا جاتا تھا۔

رنجیت گوہا۔ کالونیل ہسٹوریوگرافی آف انڈیا۔ دہلی 1980ء۔
ر۔ مارکوویٹس۔ انڈیا میں گلوبل ٹریڈ 1947-1757ء۔ کیمبرج یونیورسٹی پریس 2001ء۔
رومیلا تھاپر۔ مدھیہ کالن بھارت (ہندی) دہلی 1970ء۔
رومیلا تھاپر۔ انٹرپیٹنگ ارلی انڈیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی 1992ء۔
سید سلیمان ندوی۔ عرب و ہند کے تعلقات۔ اردو اکیڈمی سندھ کراچی 1964ء۔
سید سلیمان ندوی۔ ہندوؤں کی علمی ترقی میں مسلمان حکمرانوں کی کوششیں۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ 2001ء۔
سید سلیمان ندوی۔ ہندوؤں کی ودیا اور سکشا سمبندھی پرگرتی میں مسلم ساشکوں کا یوگان۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ 1999ء۔
سبھاش چندر بوس۔ دی انڈین اسٹرگل 1934-1920ء۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی 1960ء۔

کانگریس اور مسلم لیگ کے سیاسی طریقہ کار سے ہٹ کر سبھاش چندر بوس ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو بالکل صحیح خطوط پر لے جا رہے۔ ان کی آزاد ہند فوج نے برطانوی سامراجیت سے بھی ٹکر لی تھی مگر گاندھی، کانگریس اور مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈران اس طریقہ کار کی مخالفت کر رہے تھے۔ آزاد ہند فوج میں مسلمان مجاہدین بھی شامل تھے۔

سے باہر رکھنے کے لئے کانگریس کے حامی قوم پرست مورخوں اور مسلم لیگ کے حامی مسلمان مورخوں نے بھی نظرانداز ہی کیا ہے۔

ایچ۔ٹی۔سورلے۔شاہ عبداللطیف بھٹائی ہز لائف ٹائمز اینڈ پوئیٹری۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی 1996ء۔

سورلے نے اپنی کتاب میں لگ بھگ تمام یورپی مورخوں اور سیاحوں کی کتابوں کے حوالے قلمبند کئے ہیں جنہوں نے برصغیر کی تاریخ کے اصل حقائق کو دفن کر دیا تھا۔خود سورلے نے بھی تاریخی حقائق کو خوب مسخ کیا ہے۔

طارق علی۔دی کمیشن آف فنڈ منٹالزم۔ورسو لندن 2002ء۔
علامہ حسین احمد مدنی۔نقش حیات۔دارالاشاعت کراچی 1986ء۔
عرفان حبیب۔مدھیہ کالن اتہاس۔رسالہ کلچر دہلی 29۔جولائی 1987ء۔
فری واین دتا۔ اقبال جناح اینڈ انڈیاز پارٹیشین۔ اکنامک اینڈ پولیٹیکل ویکلی دہلی دسمبر 2002ء۔
فلپ لاسن۔ایسٹ انڈیا کمپنی،اے ہسٹری۔لانگ مین لندن 1993ء۔
فرانسس رابنسن۔سپریٹزم امنگ انڈین مسلمز۔دہلی 1993ء۔
فریدرک گریر۔ پولیٹیکل اسلام ان دی انڈین سب کانٹی نینٹ۔ دی جماعت اسلامی۔ دہلی 2002ء۔
قاضی جاوید۔ڈاکٹر۔سب کانٹی نینٹ،اے ہسٹری آف ٹالرینس۔ساؤتھ ایشین پارٹنرشپ پاکستان 2001ء۔
کرافٹ وگرتھس۔ پوسٹ کالونیل اسٹڈیز دکنی ایشیا کی نوآبادیاتی سامراجیت پر مضامین۔ راوٹلیج۔لندن 1995ء۔
کریگ بیسٹر۔جن سنگھ۔اے بائیوگرافی۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ممبئی 1970ء۔
گیاتری چکرورتی۔کین سبالٹرن اسپیک۔وتج شمارہ 7(8) موسم سرما 1985ء۔
محمد امیر رانا۔جہاد کشمیر و افغانستان۔مشعل بکس لاہور 2002ء۔

مبارک علی ڈاکٹر۔ تقسیم ہند مختلف نقطہ ہائے نظر۔ سہ ماہی تاریخ اکتوبر 2002ء۔
مبارک علی ڈاکٹر۔ تقسیم ہند۔ سہ ماہی تاریخ اکتوبر 2002ء۔
مبارک علی ڈاکٹر۔ زبان کا سیاسی استعمال۔ سہ ماہی تاریخ اکتوبر 2002ء۔
مبارک علی ڈاکٹر۔ آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان۔ فکشن ہاؤس لاہور 1994ء۔
ونائک سوارکر۔ ہندتوا پانچواں ایڈیشن۔ ویرسوارکر پرکاش ممبئی 1969ء۔
ولیم فوسٹر۔ ارلی ٹریولزان انڈیا 1583-1619ء۔ دہلی 1968ء۔
ولی رضا نصر۔ مودودی اینڈ میکنگ آف اسلامک ریوایلزم۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن 1996ء۔
ہربنس کھیا۔ عہد وسطی کا ہندوستان۔ فکشن ہاؤس لاہور 2004ء۔

# متفرقات

ریاض صدیقی پروفیسر۔ سورلے سے مکالے۔ فکشن ہاؤس لاہور 2003ء۔
ریاض صدیقی پروفیسر۔ ایسٹ انڈیا کمپنی۔ سہ ماہی تاریخ شمارہ نمبر 20۔ 2004ء۔

## کالونیل ازم:

کالونیل ازم کے شیطانی کردار کے موضوع پر گرفتھس کی کتاب میں سارا سلیری، کم۔کم۔ سنگاری، پارتھا چیٹر جی۔ بھابھا ہومی۔ براج کچرو اور گیاتری چکرورتی کے مقالات دیکھیے۔

## تعلیمی نصاب:

سوشل اسٹڈیز کی نصابی کتابیں I-VII کلاسوں تک۔
اسلامیات کی نصابی کتابیں I-XIV کلاسوں تک۔
مطالعہ پاکستان کی نصابی کتابیں I-XIV کلاسوں تک۔
تاریخ کی نصابی کتابیں XI-XIV کلاسوں تک۔

رپورٹ:

کرائمز اگینسٹ ہیومینٹی ۔ جلد دوم مرتبہ جسٹس وی آر کرشن ۔ گجرات کا المیہ
رسالہ کمیونالزم کمبات ۔ گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی پر خصوصی شمارہ مارچ 2002ء۔

کانفرنس:

دکنی ایشیا پر نوآبادیاتی سامراجیت کے اثرات، کراچی 16- مئی 2004ء۔

# نقطہ نظر

# پس نو آبادیاتی ریاست میں فرد اور ریاست کا رشتہ

بلال احمد

گذشتہ سو سال منڈی کی حاکمیت کا زمانہ تھا۔ اگر ایک صدی کی مدت کچھ زیادہ محسوس ہو تو دوسری جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ تو یقیناً منڈی یعنی مارکیٹ کی جدلیات سے گہرے طور پر متاثر محسوس ہوتا ہے۔ سرمایہ دار دنیا کے ماہرین اقتصادیات نے اس دور میں نت نئے اصلاحی پروگراموں سے ترقی پذیر ممالک کے سیاسی و اقتصادی مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ تفصیلات میں اختلاف پایا جاتا ہے تاہم بنیادی فکر آج تک ایک ہی چلی آتی ہے۔ مثلاً سرمایہ داری ماہرین اقتصادیات کا کہنا تھا کہ بنیادی مسئلہ سرمائے کی کمی کا ہے (یہاں سرمائے سے مراد ہر وہ شے ہے جو پیداوار کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے۔ اس حوالے سے ہاتھ سے زمین کھودنے والے بیلچے سے لے کر انسان اور جدید ترین روبوٹ سبھی سرمایہ کے زمرے میں آتے ہیں)۔ اگر کسی طرح سرمائے کی اس قلت یا کمیابی پر قابو پا لیا جائے تو ترقی پذیر ممالک کے سبھی مسائل بتدریج حل کئے جا سکتے ہیں۔ سرمائے کی کمی کا ایک حل Trickle down Theory(1) کی صورت پیش کیا گیا۔ اس اقتصادی ماڈل کی رو سے ضروری ٹھہرا کہ امیر اور غریب کے فرق کو نمایاں ہونے دیا جائے تا کہ امیر لوگ زیادہ سرمایہ پس انداز کر کے سرمایہ کاری کر سکیں۔ خیال یہ تھا کہ سرمایہ کاری کے نتیجے میں روزگار کے نئے مواقع پیدا ہوتے ہیں جس سے بتدریج بے روزگاری دور ہو جاتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ امیر اور غریب کے درمیان حائل خلیج کم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ پاکستان میں 60 کی دہائی میں اس فارمولے کو آزمایا گیا مگر اس اقتصادی ماڈل کے دونوں مفروضے ہمارے ہاں غلط ثابت ہوئے۔ یعنی اس سے غربت میں تو اضافہ ہوا مگر غریب و امیر کی

آمدنیوں کی تفریق میں کمی واقع ہوئی۔(2)

اسی طرح ترقی کا Dualistic Model بھی ترقی پذیر ممالک میں سرمائے کی کمیابی پر قابو پانے کی غرض سے اپنایا گیا۔ چونکہ قلت سرمایہ کے باوصف تمام شعبے بیک وقت ترقی نہیں کر سکتے اس لئے دعویٰ کیا گیا کہ زرعی شعبے کی بجائے صنعتی شعبے کو ترقی دی جانی چاہئے۔ صنعتی شعبے کی پیداواری صلاحیت زراعت کی نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے نیز اس میں ترقی کے امکانات زیادہ ہیں اس لئے اس کی ترقی کے ذریعے بے روزگاری پر قابو پایا جاسکتا ہے نیز صنعتی ترقی کی بدولت زرعی شعبہ بھی ترقی کر جاتا ہے۔ اسی طرح balanced growth ماڈل کو بھی آزمایا گیا جس کے مطابق ترقی تبھی ممکن ہے جب وہ سب کے لئے ہو۔ یعنی نہ صرف زرعی اور صنعتی شعبوں کو برابر کی اہمت دی جانی چاہئے بلکہ اقتصادی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کی بہتری کے بغیر ترقی ممکن ہی نہیں۔ دوسری طرف Dependency Theory کے بنیادی مفکرین Prebish اور H. Singer نے ثابت کیا کہ ترقی پذیر ممالک کی اجناس کی قیمتیں تیزی سے گر جاتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی امیر ممالک پر محتاجی اس وقت تک بڑھتی جائے گی جب تک وہ درآمدات خود پیدا کرنے کے قابل نہیں ہو جاتے۔ اس فکر کے نتیجے میں import substitution industrialization کی طرف توجہ دی گئی۔(3) اسی فکر کے نتیجے میں بھارت جیسے ممالک نے درآمدات پر مختلف قسم کی پابندیاں عائد کر دیں تاکہ مقامی صنعت کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا جاسکے۔ ان افکار کو بائیں بازو کے مفکرین مثلاً گنٹر فرینک نے اپنی انتہا کو پہنچا دیا جو کہ شاید اس اقتصادی ماڈل کے نقیبوں کا مطمع نظر نہیں تھا۔

ستر کی دہائی میں جب یہ تمام خیالات اقتصادی ترقی اور سیاسی عدم استحکام کو دور نہ کر پائے تو basic needs-approach کی باتیں شروع ہوئیں۔ کہا گیا کہ بنیادی ضرورتیں یعنی خوراک، رہائش، تعلیم اور صحت جیسے مسائل کے حل کی طرف جب تک توجہ نہیں دی جاتی صنعتی ترقی نہیں ہوسکتی۔ اگرچہ ان خیالات کو ترقی کا متبادل ماڈل کہا جاتا ہے مگر حقیقت میں اس ماڈل کے تحت بھی ایسا صحت مند اور ذہین مزدور پیدا کرنا ہی مقصود تھا جو منڈی کی مشین میں ایک مستعد پرزے کے طور پر اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کر سکے۔(4)

اَسی کی دہائی کے وسط میں جب کہ اشتراکی اقتصادی وسیاسی ماڈل ناکامی سے دوچار ہو رہا

تھا تو عالمی امدادی ادارے Structural Adjustment Program کے لبادے میں neo-Liberal اقتصادی ماڈل پر عمل پیرا ہو رہے تھے۔ اگرچہ عملی طور پر تو آج بھی اسی ماڈل کی حاکمیت چلی آتی ہے تاہم 80 کی دہائی کے آخری سالوں میں شور اٹھا کہ یہ نیا تجربہ بھی کچھ ایسا کامیاب نہیں ہو پارہا۔ افریقہ کے بہت سے ممالک نے اپنی معیشتوں کو عالمی مالیاتی اداروں کے مشوروں سے ڈی ریگولیٹ کیا مگر اس کے نتیجے میں یہ ممالک ترقی کرنے کی بجائے مزید قرضوں میں ڈوب گئے۔(5)

جن دنوں سرمایہ دار دنیا Market Forces کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کے اقتصادی و سیاسی مسائل کا حل تلاش کر رہے تھے انہی دنوں اشتراکی دنیا بھی نئی طرز کی منڈی کے ذریعے دنیا کے اقتصادی، سیاسی حتیٰ کہ روحانی مسائل کا حل پیش کر رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اشتراکی نظریات کے حامیوں کی منڈی آزاد نہیں تھی جہاں Market Forces پیداوار اور قیمتوں کا تعین کیا کرتی ہیں۔ ان کی رائے میں اقتصادی منڈی میں ذرائع پیداوار نجی ملکیت میں نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر نجی ملکیت کی وجہ سے پیدا ہونے والی سماجی گروہ بندیوں کو ختم کر دیا جائے تو سبھی مسائل قابل حل ہیں۔ یہاں یہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ بیسویں صدی کے اشتراکی افکار ریاست و اقتصادیات کے مسائل حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پائے۔

90 کی دہائی میں جب کہ اشتراکیت کا خوف بھی دم توڑ چکا تھا neo-liberal اصلاحات کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہ ہو سکے۔ اسی دور میں اچانک good governance کی اصطلاح دنیا بھر میں مقبول ہونے لگی۔ غریب ممالک کو بتایا گیا کہ جب تک وہ اپنے اداروں کو فعال اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں بنائیں گے تب تک نہ صرف یہ کہ ترقی نہیں ہوگی بلکہ وہ مزید مقروض ہوتے چلے جائیں گے۔ انہی افکار کی روشنی میں گذشتہ ایک دہائی سے ترقی پذیر ممالک کی ریاستوں کے اداروں کو فعال بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ Decentralization اور Participation جیسی اصطلاحات کو انہی کوششوں کے پس منظر میں سمجھا جا سکتا ہے جن کا مقصد Market کو زیادہ سے زیادہ فعال بنانا ہے تا کہ بے روزگاری اور غربت کا سدباب کیا جا سکے۔ یہ انداز فکر غلط ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ منڈی سے ہی محصولات وصول کئے جاتے ہیں جن کی مدد سے ہسپتال، سکول اور سڑکوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ روزگار کے مواقع

بھی منڈی ہی میں پیدا ہوتے ہیں مگر جب تک ہم منڈی کے خبط سے نجات نہیں پائیں گے معاملات نہیں سمجھیں گے۔ ہمیں اس سے کچھ آگے سوچنا ہوگا۔

اگر چہ یہ بات درست ہے کہ جدید ادارہ سازی میں ناکامی کے باعث قیمتی اور کمیاب وسائل ضائع ہو جاتے ہیں اور اگر کسی طرح Governance کے مسئلے کا حل تلاش کر لیا جائے تو ترقی پذیر ممالک کی بے روزگاری اور غربت پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ مگر اس کا جو طریقہ کار عالمی امدادی ادارے اپنا رہے ہیں وہ درست نہیں۔ مثلاً 2002ء میں عالمی بینک نے جو سالانہ رپورٹ جاری کی اس کا عنوان ہے "Building Institutions For The Markets"۔

اس عنوان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عالمی بینک کے ماہرین منڈی کی خاطر اداروں کی اصلاح چاہتے ہیں۔ اس رپورٹ میں جگہ جگہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کیسے قانون کی حاکمیت کاروباری مقاصد کے لئے مفید ہے نیز فعال ادارے کیوں کر گردش زر میں مدد فراہم کر سکتے ہیں۔ میری رائے میں عالمی بینک کی فکر کو یکسر الٹانے کی ضرورت ہے۔ یعنی ہمیں ادارے منڈی کی خاطر نہیں بلکہ منڈی اداروں کی خاطر چاہئے۔ تاریخی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک نے ہمیشہ ریاست کے بنیادی ستونوں یعنی عدلیہ اور مقننہ کو اقتصادی ترقی کی بھینٹ چڑھایا ہے جس کے نتیجے میں انتظامیہ مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ ایوب خان ہوں یا جنرل مشرف سبھی نے اس روایت کو مکمل تندہی سے نبھایا ہے۔ گویا ترقی پذیر ممالک کو منڈی کے خبط سے ماورا ایسی قوتوں اور Processes کی نشاندہی کی ضرورت ہے جو ادارہ سازی میں ہماری رہنمائی کر سکیں۔ اس کے لئے ہمیں فرد اور ریاست کے تعلق پر غور کرنا ہوگا کیوں کہ ادارے فرد کے بغیر کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

## فرد اور ریاست کا تعلق

عرفان حبیب کا کہنا ہے کہ برصغیر پر برطانیہ کے قبضے سے قبل جدیدیت یعنی Modernization کی ابتدا ہو چکی تھی۔ (6) قطع نظر عرفان حبیب کے اس دعویٰ کے اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ برطانوی نوآبادکاروں نے قبضے کے بعد اداراتی سطح پر یہاں وسیع اکھاڑ پچھاڑ کی۔ انہوں نے ہمارے ہاں اپنی طرز کا عدالتی و انتظامی نظام متعارف کروایا جو ہمارے لئے کئی

حوالوں سے نیا تجربہ تھا۔ یہاں یہ ہرگز نہیں کہا جا رہا کہ انہوں نے ہمیں ہمارے حقوق سے
متعارف کروایا یا مقامی لوگوں کو ویسے ہی حقوق دیئے جیسے کہ ایک برطانوی شہری کو حاصل تھے۔
بلکہ ہم جانتے ہیں کہ نوآبادیاتی دور کے قوانین کا بنیادی وصف مقامی آبادی پر اپنی گرفت کو مضبوط
رکھنا تھا۔ برطانوی نوآبادکاروں کی اس کوشش نے گوں ناں گوں مسائل کو جنم دیا۔ اصلاحات نافذ
کرتے ہوئے انہوں نے مقامی آبادی کی روایات اور اقدار کو کسی قدر سمجھنے کی کوشش کی مگر تہذیبی
خلیج اور ابلاغ کے مسائل اس قدر گہرے تھے کہ اکثر بات ان کے پاس کئی حوالوں سے ہو کر پہنچتی
جس سے حقیقت کہیں دب کر رہ جاتی رہی۔ (7) اس ابہام کے نتیجے میں انہوں نے حقائق کو غلط
طور پر سمجھ کر اس کی ناقص تاویلیں گھڑیں اور انہی کی بنیاد پر اصلاحات کا عمل جاری کر دیا۔ اس
طریقہ کار کے نتیجے میں لوگ اپنی روایات سے کٹ گئے جس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ نئے تجربے
نے ان کو اپنے تہذیبی Asset سے جدا کر دیا۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ادارے ہوا میں کھڑے نہیں
کئے جا سکتے۔ ان کی ایک تاریخ ہوتی ہے جس کے ساتھ لوگوں کا اجتماعی تجربہ و شعور جڑا ہوتا ہے۔
جب کسی معاشرے میں اصلاحات کا عمل تہذیبی شعور اور اجتماعی تجربے سے کٹ جائے تو نئے
اداروں کو قبولیت نہیں مل پاتی جس سے اصلاحات کا عمل ناکام ہو جانے کا خدشہ موجود رہتا ہے۔

روایت سے کٹنے کے علاوہ ابتدا ہی میں مقامی متوسط طبقے اور نوآبادکاروں میں کھچاؤ اور
عداوت کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اگرچہ بڑے کاشتکاروں کو نوآبادکاروں نے کسی حد تک عزت و
تکریم سے نواز دیا تاہم عداوت کا جذبہ وہاں بھی کارفرما رہا کیوں کہ نئے حکمران نہ صرف اقتدار

جدید اداروں کے ساتھ بھی اس کے دل میں مخاصمت قائم رہی۔ (اندریں حالات راقم قبل از نو آبادکاروں کے دور کے بارے میں اداروں اور فرد کے تعلق کی نوعیت بیان کرنے سے قاصر ہے)۔ چنانچہ، ریاست جو کہ اداروں ہی کا مجموعہ ہوتی ہے، کو انہوں نے کبھی دل سے قبول نہ کیا اور نہ ہی ریاست کے اداروں کے ساتھ ان کا شہری یعنی Citizen والا تعلق قائم ہو پایا۔ اگرچہ یہ کہنا آسان نہیں کہ پس نو آبادیاتی ریاستیں نو آبادیاتی دور کا ہی تسلسل ہیں تاہم نو آزاد ریاستوں کے بنیادی ڈھانچے میں زیادہ تبدیلیاں نہیں کی گئیں۔ (8) بلکہ آزادی کے بعد فرد اور ریاست کا تعلق ایک نئے انداز اور طرز پر مزید مخاصمانہ ہو چکا ہے۔

تو گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید ریاست اور اس کے ادارے نہ تو مقامی لوگوں کے تاریخی تجربے اور جدوجہد کے نتیجے میں قیام عمل میں آئے جس کے باعث اداروں اور فرد کے درمیان ایک صحت مند رشتہ قائم ہو پاتا، اور نہ ہی نو آبادکاروں نے مقامی لوگوں کو جدید ریاست کے شہریوں کی حیثیت دی۔ مذکورہ بالا عوامل کے باعث ہر دو کی باہمی مخاصمت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اور ایک دفعہ جب یہ سلسلہ چل نکلا تو آزادی کے بعد بھی یہی رجحان کم و بیش قائم رہا۔ اس پیچیدہ صورت حال میں نو آزاد ریاستوں کے نئے حکمرانوں نے خیال کہ اقتصادی حالات کی بہتری سے وہ فرد اور ریاست کا کھویا ہوا تعلق بحال کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مگر گذشتہ چھ دہائیوں میں ہر قسم کے انقلابات اور اصلاحات کے باوجود یہ رشتہ نہ صرف ابھی تک قائم نہیں ہو پایا، بلکہ نو آزاد ریاستوں کے حصے بخرے ہونے کا عمل اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ تعلق وقت کے ساتھ ساتھ کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔ اگرچہ اسباب تو اور بھی گنوائے جا سکتے ہیں تاہم نو آبادیاتی تجربے کے باعث فرد جدیدیت کے ساتھ، جس کی ایک شکل نئی ریاست ہے، صحت مند انداز میں تعلق قائم ہی نہیں کر پایا جس کی ایک جھلک Bad Governance کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

## شہری کی دریافت

چند سالوں سے ماہرین کہہ رہے ہیں کہ منڈی ہی نہیں ریاست بھی ناکام ہو سکتی ہے۔ (9) گویا کامیاب ریاست مستعد منڈی کی دلیل ہے۔ یہ مفروضہ چاہے جتنا بھی سچ ہو شہری کی

دریافت میں ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ بنیادی بات فرد اور ریاست کے تعلق سے شروع ہونی چاہئے تاکہ پس نوآبادیاتی ریاست میں شہری کو دریافت کیا جا سکے۔ شہری سے مراد ایسا فرد ہے جو اپنے محلوں کو اپنے گھر کا حصہ سمجھتا ہو، جو بس کی نشستوں کو اپنا ذاتی سامان سمجھ کر استعمال میں لاتا ہو، اور ذاتی مفاد کی خاطر ملک کا قانون توڑنے والے کو گھر کی دیوار پھاندنے والے چور ہی کی طرح برا خیال کرتا ہو۔ مگر پس نوآبادیاتی ریاستوں کا فرد، جسے صدیوں سے شہری سمجھا ہی نہ گیا ہو، خطبوں اور نیک اعمال کی تلقین سے تو شہری نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے ہمیں دو طرح کے Processes کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہوگا۔ (میں نے اہمیت کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ نوآزاد ریاستیں مسلسل منڈی کے ذریعے ہی فرد کی دریافت کا کام کرتی آئی ہیں)۔ اول، ایسے پروسیس جو قانون کی بالادستی قائم کرنے میں مدد کر سکیں، ثانیاً، ایسے پروسیسز جو جمہوری طرز حکومت کی طرف لے جائیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک بھی کافی نہیں۔ مثلاً بھارت میں چھ دہائیوں سے جمہوریت قائم ہے مگر وہاں قانون کی بالادستی کا شعور کمزور ہے (گجرات میں فسادات کے موقع پر اکثر لوگ سیکولرازم اور بنیاد پرستی کی تو بات کرتے تھے مگر کوئی یہ نہیں کہتا تھا کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا ملنی چاہئے)۔ اگرچہ بھارت کی اعلیٰ عدلیہ کا وقار بلند ہے تاہم ضلعی سطح پر حالات پاکستان سے مختلف نہیں۔ (10) نتیجہ یہ ہے کہ بھارتی جمہوریت نہرو سے شروع ہوئی اور اب لالو پرشاد اور جے للیتا جیسے سیاست دان پیدا کر رہی ہے۔ جمہوریت ایک سطح پر لابنگ کا عمل ہے۔ ویسے تو جمہوریت دنیا میں کہیں بھی مسائل سے مبرا نہیں تاہم اگر لابنگ میں قانون قاعدے کو پس پشت ڈال دیا جائے تو جمہوریت کی آڑ میں جرائم پیشہ افراد اقتدار کے ایوانوں میں گھس جاتے ہیں جس سے جمہوریت مافیا ازم کو جنم دے ڈالتی ہے۔ دوسری طرف جمہوریت کی عدم موجودگی میں قانون قاعدے کی سختی آمریت کے سوا کچھ نہیں جس کے نتیجے میں سعودی عرب جیسی ریاست قائم ہوتی ہے۔

یہ درست ہے کہ قوانین حتمی طور پر عوام دوست نہیں ہوا کرتے اور ان میں بہتری کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ تاہم لوگ قوانین میں بہتری کے لئے اسی وقت جدوجہد کرتے ہیں جب ان کا اطلاق کیا جائے۔ جب فرد ریاست ہو جائے تو پھر قوانین کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ جمہوریت کے ساتھ ساتھ خودمختار، فعال اور شفاف عدلیہ ہی فرد اور ریاست کے درمیان اعتماد کو بحال کر سکتی

ہے۔ جب فرد کو عدالت کے کٹہرے میں انصاف ملتا ہے تو وہ ریاست کا شکر گزار ہوتا ہے۔ اس عمل سے وہ خود کو Subject کی بجائے شہری یعنی Citizen محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایسا شہری جو ریاست کے طاقت ور ترین فرد یا ادارے کو بھی قانون کی مدد سے سزا دلوا سکتا ہے۔ اور اگر وہ کسی سیاست دان کی مدد سے اپنا الو سیدھا کرے یا اپنے ذاتی تعلقات کو استعمال کرتے ہوئے اپنا کام نکالے تو وقتی سہولت کے باوجود ریاست سے اس کا اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ قانون کی بالادستی قلیل مدت میں قائم کی جا سکتی ہے اور جمہوریت کوئی سیدھا آسان راستہ ہے تاہم راستہ یہی ہے جس کے ذریعے شہری کی تلاش ممکن ہے۔ ویسے بھی جمہوریت کی صورت میں فعال، آزاد اور شفاف عدلیہ کی صورت سیاسی جماعتیں لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر سکتی ہیں۔ یعنی اس راستے میں کسی کا نقصان نہیں۔ صرف ہمیں منڈی کے خبط سے باہر نکل کر فرد اور ریاست کے باہمی اعتماد کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ نہ صرف اس لئے کہ ہمیں نیا شہری پیدا کرنا ہے بلکہ اس لئے کہ گذشتہ پچاس سالوں میں کسی ایک ایسے ملک کی مثال نہیں دی جا سکتی جو قانون کی بالادستی اور جمہوریت کا راستہ اپنانے کے باوجود اقتصادی و تہذیبی میدان میں ناکام رہا ہو۔ جب کہ ہم ایسے بہت سے ممالک کی مثال پیش کر سکتے جہاں انقلاب ناکام ہوئے اور نیو لبرل اقتصادی ماڈل نے غربت و بے روزگاری کو مزید پھیلنے میں سہولت پیدا کی۔

# References

1. (ed) Martin, Kurt (1991). *Strategies Of Economic Development.* Macmillan London.
2. (eds) Banuri, T, J. Khan, S, R. Mahmood, M. (1999). *Just Development. Beyond Development With A Human Face.* OUP. Pakistan.
3. Cypher J. M. Dietz J. L. (1997). *The Process Of Economic Development Rutledge.*
4. Ahmad, Bilal (2004). *Thinking Beyond Markets. The Historian. GCU.* Lahore.
5. Tetlezlaff, R (1994) *Good Governance And SAP. The World Bank Experience In sub-Seharan Africa.* PJAE. Karachi University.
6. Habib, (1963) *The Agrarian System Of Mughal India.* Asia Publishing House. New York.
7. Cohen, B. *Colonialism And Its Forms OF Knowledge.*
8. Meeta And Rajivlochan in their paper *"Rules: The Administrative experience in Tribal Development"* writes "However, despite his serious misgivings about the executive arm of the colonial government, Nehru

accepted the continuation of the bureaucracy for his Government".

9. Leftwich, A. Governance, *The State And The Politics of Development. Development And Change Vol 25.*
10. This fact was acknowledged by the former Chief Justice of Delhi High Court Rajider Shucher. He further told the writer that the reason for this miserable plight of subordinate judiciary is due to the dearth of resources. Ironically enough India had just detonated nuclear devices-one of the most expensive weapons program- when justice Rajider delivered this statement.

# تحقیق کے نئے زاویئے

# وائٹ مغلز

ڈاکٹر مبارک علی

ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارہویں صدی بڑی اہمیت کی حامل ہے، کیونکہ اس عہد میں سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیوں نے ایک نئے دور کا آغاز کیا تھا۔ مغل سلطنت کا استحکام تو ٹوٹ گیا تھا، مگر مغل کلچر اور روایات معاشرے میں گہرائی کے ساتھ سرایت کر چکی تھیں۔ مغل بادشاہ، سیاسی طور پر پس پردہ چلا گیا تھا، مگر اس کے نتیجہ میں جو صوبائی اور علاقائی ریاستیں ابھریں تھیں، انہوں نے مغل کلچر کی سرپرستی کرتے ہوئے اسے زندہ رکھا تھا۔ لہٰذا اس عہد میں امراء کے طبقے میں اس کلچر کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی اہم خصوصیت مذہبی رواداری تھی،۔۔۔۔ ایک مشترکہ ثقافت کی تشکیل۔

لہٰذا جب یورپی مہم جو یہاں پر آئے، تو ان میں ہر قسم کے لوگ تھے، یہ جلد ہی اس کلچر میں اس قدر ضم ہو گئے کہ اس کا ایک حصہ بن کر رہ گئے۔ ان کی زبان، لباس، رہن سہن، اور طور طریق ان سب پر مغل کلچر حاوی ہو گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ابتدائی دور اس کا ایک حصہ ہے۔ اس ابتدائی دور میں اہل ہندوستان نے کمپنی کو ان سیاسی طاقتوں میں سے ایک سمجھا کہ جو اس وقت ہندوستان میں تھیں، مثلاً مرہٹہ، راجپوت، روہیلے، اور سکھ، ان ہی میں سے ایک سیاسی طاقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی تھی کہ جو سیاسی اقتدار اور طاقت کے حصول میں برسرپیکار تھی۔

ولیم ڈیل ریمپل (William Dlrymple) کی کتاب وائٹ مغلز (White Mughals) اٹھارہویں صدی کے ہندوستانی معاشرے کی سماجی و سیاسی تاریخ ہے۔ اگرچہ اس کا موضوع جیمس کرک پیٹرک اور خیر النساء کا رومان ہے، اور کہانی کا مرکز حیدرآباد دکن کی ریاست

ہے کہ جہاں نظام علی خان کا دورِ حکومت ہے، مگر اس پس منظر میں اس نے ہندوستانی معاشرے کی تصویر کشی کی ہے، یہ معاشرہ امراء کا ہے، جو شاندار حویلیوں اور باغات میں گھرے مقامات پر رہتے ہیں، اس میں حیدر آباد دربار کی سازشیں، جوڑ توڑ، اور رقابتیں شامل ہیں۔ سماجی سرگرمیوں میں حویلیوں کی چار دیواری میں رہنے والی عورتیں بھی شامل ہیں، کہ پابندیوں کے باوجود اپنا خود مختارانہ کردار ادا کرتی ہیں۔ ان کے فیصلوں کے آگے اکثر مرد بے بس نظر آتے ہیں۔

اس معاشرہ میں ابتدائی دور کے یورپی لوگ ہیں کہ جو ہندوستانی معاشرے میں گھل مل گئے ہیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار اور اس کے اعلیٰ حکام کے رویوں میں تبدیلی کے آثار بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس بارے میں بھی معلومات ہوتی ہیں کہ کلکتہ اور مدراس میں یورپی کمیونٹی کی زندگی کس طرح سے گزرتی تھی۔

کتاب کی تیاری میں ولیم ڈیل ریمپل نے ہندوستان اور انگلستان کی لائبریریوں سے استفادہ کیا ہے بلکہ ان بنیادی ماخذوں تک رسائی حاصل کی کہ جواب تک کسی مورخ نے نہیں دیکھے تھے۔ خاندانی دستاویزات، انٹرویوز اور لاتعداد ذرائع سے اس نے ولیم کرک پیٹرک اور خیر النساء کی کہانی مکمل کی، جو کہ اپنی جگہ ایک ٹریجڈی ہے۔ لیکن اس کہانی کے اردگرد جو موضوع ابھر کر آتا ہے وہ ہے کلچرل اشتراک۔ بیک وقت یہ اشتراک مذہب اور سیاست کے فرق کے باوجود پروان چڑھتا ہے، مگر جب سیاسی مفادات غالب آ جاتے ہیں، تو اس کے ساتھ ہی مذہبی عداوتیں، نفرتیں، اور فرقہ وارانہ جذبات بھی ابھرتے ہیں اور اس اشتراک کو روکتے ہیں کہ جو دو کلچروں کو آپس میں ہم آہنگ کئے ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دو کمیونٹیز آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے دور اور رجعتی ہوتی چلی جاتی ہیں، معاشرے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے اور کلچر کی اس تفریق پر برتر و کم تر کے جذبات ابھرتے ہیں، جو ایک کو مہذب بناتے ہیں، تو دوسرے کو غیر مہذب۔

ولیم ڈیل ریمپل اس اشتراک کی مثال گوا سے دیتا ہے کہ جس پر 1510 میں پرتگیزیوں نے قبضہ کر لیا تھا، پرتگیزی اگرچہ مذہب کے معاملہ میں انتہائی پُر تشدد تھے، مگر وقت کے ساتھ گوا میں ایک ایسے کلچر کا فروغ ہوا کہ جس میں مذہبی یگانگت اور ہم آہنگی تھی، اس لئے جب اہل گوا کے عقاید کو پختہ بنانے کے لئے انکوئیزیشن (Inquisition) کے لوگ 1560 میں آئے تو انہیں یہ

شہر دہلی اور آگرہ کی مانند مغل شہر لگا۔ انہوں نے یہ دیکھ کر سخت دھچکا لگا کہ یہاں عیسائی، مسلمان، ہندو اور یہودی آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے پرتگیزی اتھارٹی سے درخواست کی کہ گوا میں رہتے ہوئے مذہبی فرق کو پیدا کرنا ان کے لئے لازمی ہے۔ اس لئے انکوئیزیشن کے محکمہ نے سختی کے ساتھ اس کلچرل اشتراک کو روکا۔ اگر کسی عیسائی خاندان کو ہندو روایت کا پابند دیکھا جاتا تھا تو اس کے تمام گھر والوں کو معہ ملازموں کے گرفتار کر لیا جاتا تھا، اور اس جرم پر ان پر تشدد کیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ان روایات اور رسوم و رواج کی فہرست تیار کی کہ جن کا تعلق ہندوستان سے تھا اور جنہیں اختیار کرنا ایک عیسائی کے لئے کفر کے برابر تھا، مثلاً بغیر نمک کے چاول پکانا، دھوتی پہننا، عورتوں میں چولی کا استعمال، اور سور کا گوشت کھانے سے انکار کرنا وغیرہ انکوئیزیشن کی اس سختی کی وجہ سے بہت سے عیسائی گوا سے ہندوستان کے ان علاقوں میں آ گئے کہ جہاں انہیں مذہبی و سماجی آزادی تھی۔

## (2)

شادی بیاہ کے سلسلہ میں طبقہ اعلیٰ کے کلچر میں بہت زیادہ پابندیاں ہوتی ہیں۔ ان میں مذہب، فرقہ، اور عقائد کے ساتھ ساتھ سماجی، معاشی اور سیاسی حیثیت کو دیکھا جاتا ہے۔ حیدر آباد دکن کے شاہی خاندان نے ٹیپو سلطان کے خاندان میں شادی سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ اس کا سماجی تعلق اعلیٰ خاندان سے نہیں تھا۔ خاص طور سے اعلیٰ ذات سے تعلق رکھنے والے، نچلی ذات کے لوگوں میں شادی نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں خاندانی روایات اور خون کی پاکیزگی کے تصورات اہم کردار ادا کرتے تھے۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں ان تصورات کو ٹوٹتا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ یورپی مہم جو، یا ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدے دار جو ابتدائی دور میں آئے انہوں نے ہندوستان میں امراء کے گھرانوں میں شادیاں کیں۔ کرنل گارڈنر کی شادی کھمبایت کے شاہی خاندان کی شہزادی ظہور النساء سے ہوئی۔ کرنل گارڈنر کے لڑکوں کی شادی بھی مسلمان لڑکیوں سے ہوئی۔ ایلن گارڈنر کی بیوی کا نام بی بی صاحب انگا تھا۔ اس دوسرے لڑکے جیمس گارڈنر کی شادی مغل شہزادے مرزا سلیمان شکوہ کی لڑکی ملکہ ہمانی بیگم سے ہوئی۔ اس کی لڑکیوں کی شادی مغل شاہی خاندان میں ہوئی۔ سوسن گارڈنر کی شادی مرزا انجم شکوہ سے ہوئی۔ ان کے علاوہ دوسرے

انگریز جنہوں نے ہندوستان میں شادیاں کیں، ان میں آکٹرلونی مشہور ہے اس کی تیرہ بیویاں تھیں جو شام کو تیرہ ہاتھیوں پر سوار ہوا خوری کے لئے نکلتی تھیں۔ اسکنر کی 14 بیویاں تھیں۔ جنرل ولیم پامر جو پونا میں ریذیڈنٹ تھا، اس نے اودھ کے امیر خاندان کی بیگم سے شادی کی تھی، جس کا نام فیض بخش بیگم تھا۔ ان ہی عورتوں میں بیگم سمرو مشہور ہے، جس نے کئی یورپیوں سے شادی کی اور مسلمان سے عیسائی مذہب اختیار کیا۔ لہٰذا اس تناظر میں حیدرآباد دکن کے ریذیڈنٹ میجر جیمس کرک پیٹرک (1764-1805) کی شادی دکن کے امراء کے خاندان، اور سیدانی خیرالنساء سے ہوئی۔ ان کے ایک لڑکا اور لڑکی ہوئی، لڑکے کا نام صاحب عالم اور لڑکی صاحب بی بی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔

ان شادیوں کو ہندوستانی معاشرے میں قبول کرلیا جاتا تھا۔ بیگم سمرو کی مثال کہ وہ عیسائی ہو گئی، مگر اس کے باوجود اس کی سماجی حیثیت برقرار رہی۔ شادی کے نتیجہ میں اکثر مذہب کی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ شوہر عیسائی رہتا تھا، تو بیگم مسلمان یا ہندو۔ اولاد کے سلسلہ میں بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ لڑکیاں مسلمان رہتی تھیں، جب کہ لڑکے عیسائی مذہب کو اختیار کر لیتے تھے۔

دستور یہ تھا کہ انگریز اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت کے لئے انگلستان بھیج دیا کرتے تھے، کیونکہ خیال یہ تھا کہ اگر وہ ہندوستان میں رہتے ہوئے تعلیم حاصل کریں گے تو ان کی وہ عزت نہیں ہوگی، جو انگلستان میں رہ کر اور وہاں ادب آداب سیکھ کر ہوگی۔ اس صورت میں انہیں ملازمت کے مواقع مل سکیں گے۔ اس وجہ سے وہ انگریز خاندان جو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اپنے بچوں کو گھر سے دور بھیج دیا کرتے تھے، جیمس کرک پیٹرک نے بھی اپنے دونوں بچوں کو انگلستان روانہ کر دیا۔ اس کا اثر جہاں باپ پر ہوا، وہ اپنی جگہ، مگر خیرالنساء سب سے زیادہ دکھی ہوئی، کیونکہ اس کے بعد وہ اپنے بچوں سے دوبارہ نہیں مل سکی۔ انگلستان میں ان بچوں کے نام بدل دیئے گئے صاحب عالم ولیم جارج ہوگیا، اور صاحب بی بی کیتھرائن ایورورا کرک پیٹرک، دونوں کو وہاں عیسائی بنالیا گیا۔ اس کے بعد کی کہانی ٹریجڈی میں تبدیل ہو جاتی ہے، جیمس کرک پیٹرک 1805 میں اچانک بیمار ہو کر حیدرآباد سے دور کلکتہ میں وفات پا جاتا ہے۔ خیرالنساء کلکتہ کا سفر اختیار کرتی ہے، اور وہاں اس کے تعلقات ہنری رسل سے ہو جاتے ہیں، مگر وہ اس کے ساتھ وفا نہیں کرتا ہے اور مدراس جا

کر ایک پرتگیزی خاتون سے شادی کر لیتا ہے۔

خیر النساء حیدر آباد ریاست کی سیاست کا شکار ہو کر مسالی پٹم میں جلاوطنی کے دن گذارتی ہے، اور بالآخر حیدر آباد جا کر 22 ستمبر 1813 میں 27 سال کی عمر میں انتقال کر جاتی ہے۔ انگلستان میں ولیم جارج کا جوانی میں انتقال ہو جاتا ہے۔ جب کہ کٹی (Kitty) بہت بعد میں جا کر اپنی دادی شرف النساء سے خط و کتابت کرتی ہے۔ یوں اس کہانی کا انجام ہوتا ہے۔ مگر بچھڑے ہوئے کردار آپس میں نہیں مل پاتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں وائٹ مغلو نے جس ہندوستانی کلچر کو اختیار کیا تھا، اس میں اس وقت، دراڑیں پڑنا شروع ہوئیں کہ جب کمپنی کی سیاسی طاقت میں اضافہ ہوا۔ اب حکمراں اور مفتوح قوموں کے درمیان فرق قائم رکھنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ کمپنی کے اعلیٰ عہدے داروں کو لندن میں بیٹھے ہوئے یہ خطرہ تھا کہ اگر اس کے لوگ ہندوستانی کلچر میں ضم ہو گئے تو ان کا تعلق بھی انگلستان سے ختم ہو جائے گا، اور شاید ان کا وہی انجام ہو جو کہ ہندوستان میں مغلوں کا ہوا کہ جو ہندوستانی ہو کر وسط ایشیا سے اپنی جڑیں کھو بیٹھے۔ اس وجہ سے یہ کمپنی کے مفاد میں تھا کہ فرق نہ صرف قائم رہے بلکہ اس میں شدت بھی آئے، 1798 میں کمپنی کے ڈائریکٹرز کی جانب سے یہ حکم آیا کہ اس کے ملازمین غیر عیسائی اور کافرانہ طور طریق اور رسومات سے دور رہیں اور ہندوستانی لباس پہننا ترک کر دیں۔

نسل کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے اور اس کی بنیاد پر حکومت و اقتدار پر قابض ہونے کے لئے ضروری تھا کہ ہندوستان میں شادی بیاہ سے روکا جائے۔ 1786 میں یہ حکم آیا کہ ہندوستان کی بیگمات سے جو بچے ہوں گے، یعنی اینگلو انڈین، ان کا اعلیٰ عہدوں پر تقرر نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ حکم بھی آیا اینگلو انڈین یتیم بچوں کو تعلیم کے لئے انگلستان نہیں بھیجا جائے گا، 1791 میں فوج اور سول سروس میں اعلیٰ عہدوں پر ان کی تقرری پر پابندی لگا دی گئی۔ اینگلو انڈین خاندان کے بچوں کے لئے ان کی جلد کا رنگ بہت اہم تھا۔ اگر وہ سفید رنگ کے ہوتے تھے تو ان کے لئے انگلستان اور ہندوستان میں برطانوی معاشرہ میں ضم ہونا آسان تھا، اگر ان کا رنگ کالا یا گندمی ہوتا تھا تو اس صورت میں وہ تعصب کا شکار ہو جاتے تھے۔

لیکن وائٹ مغلو کا یہ کلچر وقت کے ساتھ زوال پذیر ہو رہا تھا، اس صورت حال کی تصویر کشی

ایک فرانسیسی دی وارن (De Warren) نے پامر کے حوالے سے اپنی کتاب ''انگریزی ہندوستان'' میں اس طرح سے کیا ہے۔ (حیدر آباد دکن میں ریذیڈنسی کا کلچر بدل گیا تھا۔ جیمس کرک پیٹرک کے زمانہ میں اس پر مشرقی رنگ غالب تھا، اب یہ یورپی ہو گیا تھا۔)

> ریذیڈنسی میں ادب آداب میں سختی تھی، اگر چہ شائستگی تھی، مگر سرد مہری، گفتگو انتہائی آہستگی سے ہوتی تھی، جیسا کہ یورپ کے درباریوں میں ہوتا ہے، لیکن اس کے نزدیک ہی پامر کا مشرقی دربار تھا، جہاں ایرانیوں کی شائستگی اور تہذیب، مغلوں کا وقار، اور عربوں کی مہمان نوازی تھی۔ ولیم پامر کی میز پر ہمیشہ 20 مہمانوں کے لئے جگہ ہوتی تھی، میز پر پامر کی صدارت ہوتی تھی، اگر چہ اسے دوغلا ہونے کی وجہ سے حقارت سے دیکھا جاتا تھا، مگر اپنی ذہانت کی وجہ سے اس نے ترقی کی تھی، پستہ قد اور رنگت میں اسی قدر کالا جس قدر کہ اس کے عقب میں کھڑا ہوا ملازم، وہ خاموشی سے حقہ پیتا رہتا تھا، اس دوران وہ فارسی اور ناگری میں لکھی دستاویزات کو پڑھتا تھا، وہ کھانے کو کم ہی ہاتھ لگاتا تھا۔ اس کی خوبصورت بھتیجیاں اس کے ساتھ کھانے کی میز پر ہوتی تھیں۔ وہ انگریزی مہمانوں کی تواضع کرتی تھیں، جب کہ وہ شہر کے امراء کا استقبال کرتا تھا، فاضل پنڈت، پرہیز گار مولوی، باوقار امیر، یہ سب عزت کے ساتھ اس کو تسلیم کرتے تھے۔

1857 کی جنگِ آزادی، اس مشترک کلچر کے لئے اہم موڑ ثابت ہوئی، اگر چہ انیسویں صدی کی ابتداء ہی میں یہ کلچر رو بہ زوال تھا، وائٹ مغلو کی نسل آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ آکٹرلونی 1825 میں میرٹھ میں وفات پا چکا تھا۔ 1835 میں ولیم فریزر کا قتل ہوا، جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ عیسائی سے زیادہ ہندو ہے۔ اس نسل کے اہم کردار ولیم گارڈنر نے اپنی جاگیر پر 1835 میں وفات پائی۔

1857 کی جنگ ان وائٹ مغلو کے خاندانوں کے کچھ افراد نے تحریک آزادی کا ساتھ دیا اور کچھ کمپنی کے ساتھ ہوئے۔ لیکن جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو اس نے اس مشترک کلچر کو کہ جسے وائٹ

مغلو نے پروان چڑھایا تھا، ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ اب حکمراں اور محکوم کے درمیان فرق ابھر کر سامنے آیا۔ دونوں قومیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئیں اور اپنے اپنے کلچروں میں پناہ لی۔ اب انگریز حکمرانوں نے اپنے لئے کنٹونمنٹ اور سول لائنز کے علاقے بنائے تا کہ مقامی لوگوں سے علیحدہ رہا جائے۔ اب مشترک ناچ وگانے اور مشاعروں کا عہد ختم ہوا، اور اس کی جگہ انگریزی کلچر کا تسلط قائم ہوا، جس نے مقامی کلچر کو پس پشت دھکیل دیا۔

ولیم ڈیل ریمپل کی یہ کتاب وائٹ مغلو، اٹھارہویں صدی کے اس ہندوستان کی عکاسی کرتی ہے کہ جس میں امراء کے کلچر کا تسلط تھا، اور جس کی دلکشی اور جاذبیت کا شکار ہو کر ابتدائی انگریز بھی اس کا حصہ ہو گئے تھے۔

لیکن سامراج اشتراک کو پسند نہیں کرتا ہے، یہ فرق اور دوری کو قائم کرتا ہے، تا کہ حاکم و محکوم کا فرق رہے۔ یہ سیاسی اقتدار کے ساتھ، اپنے کلچر کو بھی مسلط کرنا چاہتا ہے، تا کہ سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی بھی مستحکم ہو اور اس کے خلاف مزاحمت کرنے والی تمام قوتیں ختم ہو جائیں۔

# تاریخ کے بنیادی ماخذ

ہندوستان کی معاشی تاریخ سے اقتباسات (جلد اول و دوم)

مصنف: رمیش دت

مترجم: غلام ربانی تاباں

ترقی اردو بورڈ نئی دہلی

# ہندوستان کی معاشی تاریخ

## دیباچہ

وی۔آر۔کیڈگل

بلاشبہ رمیش چندر دت اپنی نسل کے ہندوستانیوں میں ایک اہم شخصیت کے حامل تھے۔ انہوں نے جو کام بھی شروع کیا اس میں اپنے لئے ایک راستہ بنایا اور فوری کامیابی حاصل کی۔ وہ اُن پہلے ہندوستانیوں میں سے تھے جنہیں ہندوستان کی سول سروس میں داخل ہونے کا موقع ملا اور سول سرونٹ کی حیثیت سے انہوں نے ہر کام میں یکساں طور سے کامیابی حاصل کی۔ وہ اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز ہوئے اور چھبیس سال کام کرنے کے بعد جب وہ از خود ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو وہ ایک کمشنری کے قائم مقام کمشنر رہ چکے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ وہ ادبی شہرت کے خواہشمند تھے اور تمام عمر ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ ملازمت کے دوران بھی ان کا فرصت کا وقت ادبی کاوشوں میں صرف ہوتا تھا۔ ان کی پہلی تصنیف بنگالی ادب کی تاریخ تھی جو انگریزی میں لکھی گئی تھی لیکن انہوں نے بنگالی زبان میں بھی ادب کی تخلیق کی۔ پہلے انہوں نے کچھ تاریخی ناولیں لکھیں۔ اس کے بعد ایسی کہانیاں لکھیں جن میں عصری سماجی زندگی کی عکاسی کی گئی تھی۔ انہوں نے رگ وید کا بنگالی میں ترجمہ کیا اور بنگال کی ادبی انجمن کے صدر کی حیثیت سے بیش بہا تنظیمی کام کئے۔ اس کے بعد انہوں نے انگریزی میں قدیم ہندوستان کی تاریخ لکھنے کا اہم اور دقت طلب کام اپنے ذمہ لیا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ

مصنف مغربی علوم کے ساتھ سنسکرت کے ادب سے بھی پوری طرح واقفیت رکھتا ہو۔ دت نے دکھا دیا کہ یہ دونوں اوصاف پوری طرح ان میں موجود ہیں۔ ان کی قدر و منزلت ہوئی۔ ان کے اس علمی کارنامے کی بڑی تعریف کی گئی جس کے ذریعہ جدید ترین سائنسی تخلیق کی روشنی میں عام قاری کے لئے قدیم ہندوستان کی دلچسپ تصویر پیش کر دی گئی تھی۔

فرائض منصبی کی ادائیگی میں وہ جو کام اپنے ہاتھ میں لیا کرتے تھے اسے بہت سوچ سمجھ کر کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ ان کی سرکاری اور دوسری تحریروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں بنگال کے کسانوں کے متعلق ایک مضامین کا سلسلہ تھا جو 1874ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ 1884ء کے ٹینینسی بل Tenancy Bill پر جس زمانے میں غور کیا جا رہا تھا اس وقت انہوں نے بنگال کے لگان داری کے طریقے کے متعلق جو سرکاری رپورٹیں تیار کی تھیں۔ وہ ان کی معلومات اور ہمدردی کے ثبوت فراہم کرتی تھیں۔ اور ان کی قدر و قیمت کو عام طور سے تسلیم کیا گیا تھا۔ انیسویں صدی کے شروع میں انہوں نے چوکیداری ایکٹ کے سلسلے میں گاؤں کی پنچایت اور پولیس کے متعلق اپنے خیالات کو ایک کتابچے کی شکل میں شائع کیا تھا۔

ان کی تمام سرگرمیوں کی محرک ''وطن کی خدمت'' تھی۔ دت کا خیال تھا کہ انیسویں صدی کے بنگال کی تمام ناقابل فراموش ادبی شخصیتوں کی سرگرمیوں کی جان یہ تصور تھا اور خود ان کی زندگی بھی اس سے متاثر ہوئی تھی۔ ان کی تاریخی ناولوں، ان کی تاریخ تمدن ہند اور عظیم رزمیہ نظم کے ترجمے کا محرک یہ جذبہ تھا کہ ہندوستانیوں اور بدیسیوں کو ہندوستان کی بہترین میراث سے روشناس کرایا جائے۔ ہندوستان کے لوگوں سے ان کی گہری ہمدردی اور ان کی خوش حالی کی خواہش کے انعکاسات Bengal Peasantry اور Economic History کے علاوہ ان سیاسی کاموں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں جو ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے انگلستان میں انجام دیئے۔

یہ ظاہر ہے کہ وقت سے پہلے ملازمت سے علیحدگی کے جو بھی اسباب تھے ان میں سب سے زیادہ سبب یہ ہوگا کہ وہ سیاسی اور معاشی مسائل پر عام مباحث میں مؤثر انداز سے حصہ لے سکیں۔ ملازمت سے علیحدگی کے بعد کے زمانے میں انہوں نے ادبی سرگرمیوں کے بجائے سیاسی کاموں اور معاشی تحریروں میں زیادہ وقت صرف کیا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ہی انہوں نے

انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کی مال گزاری کے بندوبست اور قحط کے سلسلے میں نزاعی امور پر لارڈ کرزن سے بحث کی۔ اکنامک ہسٹری Economic History کی دو جلدیں مکمل کیں۔ ہندوستان کی طرف سے انگلستان میں اہم سیاسی کام کئے جس میں کچھ مدّت تک دادا بھائی نوروجی، ڈبلو۔ سی بنرجی وغیرہ کا تعاون انہیں حاصل رہا اور اس کے بعد گوکھلے کا تعاون انہیں حاصل ہوا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ہی گیکواڑ ان کی خدمات حاصل کر سکا جس کی وجہ سے بروڈا کے نظم ونسق میں اصلاحات ہوئیں۔ اسی زمانے میں انہوں نے لامرکزیت سے متعلق رائل کمیشن Royal Commission on Decentralisation کے ایک رکن کی حیثیت سے کام کیا۔ ان کی بڑی مصروف زندگی تھی۔ طرح طرح کی سرگرمیوں کی زندگی جو نہایت سودمند تھی۔ ان کی زندگی کا بنیادی اصول ذمہ داری کا احساس تھا۔ وہ انتہائی ذہین ہونے کے ساتھ جفاکش بھی تھے۔ وہ علم کے ساتھ حقائق کا ادراک بھی رکھتے تھے۔ مصلحت و اعتدال کے ساتھ وہ جذبات کی شدّت اور ہمہ گیر ہمدردی سے بھی عاری نہیں تھے۔

## (2)

چھبیس سال کی ملازمت کے بعد دت نے 1896ء میں پنشن لے لی۔ کئی سال تک وہ اور ملازمت کر سکتے تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ غیر متوقع بھی تھا اور عام دستور کے خلاف بھی۔ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ دو اسباب نے دت کو یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔ ان کی ادبی امنگ اور سیاسی کام کرنے کے لئے زیادہ آزادی کی خواہش۔ ان کا خیال تھا کہ وہ انگلستان میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھ کر یہ دونوں مقصد حاصل کر سکیں گے اور ملازمت سے علیحدگی کے بعد انہوں نے انگلستان میں بود و باش اختیار کر لی۔ ان کے سوانح نگار کا خیال ہے کہ انگلستان میں ان کے مشن کے خاص خاص مقصد مندرجہ ذیل تھے:

1- انگلستان میں ایسے انگریزوں کی ایک جماعت کی تنظیم کرنا جو ہندوستان سے ہمدردی رکھتے ہوں۔
2- ہاؤس آف کامنز کے اہم اراکین کے ذریعہ برطانوی پارلیمنٹ پر اثر ڈالنا۔
3- برطانیہ کے عام لوگوں اور خاص طور سے وہاں کے جمہوری اداروں کو ہندوستانی موضوعات

کے متعلق معلومات فراہم کرنا اور ان کی ہمدردی وحمایت حاصل کرنا۔

4- ادبی تخلیقات اور تاریخی تحریروں کے ذریعہ یورپ کی وسیع تر دنیا سے اپیل کرنا۔

1904ء میں برودا آنے سے پہلے انہوں نے 1897ء سے 1904ء تک تقریباً سات سال انگلستان میں گزارے۔ 1897ء میں لندن کے یونیورسٹی کالج میں ان کا تقرر تاریخ ہند کے لیکچرار کی حیثیت سے ہوا تھا اور اس طرح انہوں نے تقریریں کرنے کے لئے ایک پلیٹ فارم اور تاریخ کے عالمانہ مطالعہ کے لئے ایک محرک مل گیا تھا 1898ء اور 1899ء میں دت نے زیادہ وقت مہابھارت اور رامائن کے ترجمے میں صرف کیا اور دسمبر 1899ء میں انہوں نے لکھنو میں منعقد ہونے والے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کی۔ 1897ء ہی میں انہوں نے ہندوستان کے قحطوں کے متعلق ایک مضمون لکھ کر جو فارٹ نائٹلی ریویو Fort Nightly Review میں شائع ہوا تھا اور England & India کے عنوان سے ایک تاریخی خاکہ تصنیف کرکے جو 1757ء سے 1857ء تک کے سو سال کی ترقی کا ریکارڈ کے ذیلی عنوان کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ اپنی آئندہ سرگرمیوں کی نشاندہی کر دی تھی۔ اس کتابچے میں آئندہ لکھی جانے والی اکنامک ہسٹری کی خاص خاص باتیں جزوی طور سے دی گئی ہیں۔ حالانکہ معاشی تاریخ کے متعلق اس میں براہ راست کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں برطانوی ہند کی پالیسی اور برطانیہ کی گھریلو سیاست کی نشوونما کی کہانی بڑے دلچسپ انداز میں پیش کی گئی ہے۔ برطانوی پالیسی کا جائزہ لیتے ہوئے دت نے ہندوستان کی غربت اور قحطوں پر زور دیا ہے اور انہیں غیر ضروری برطانوی اخراجات کا نتیجہ بتایا ہے۔ جو عام لوگوں کی تباہی کے باعث تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ اس کا اصل علاج یہ ہے کہ انتظامیہ عام لوگوں سے رابطہ قائم کرے۔ ان کے جذبات و خواہشات کی نمائندگی کرے اور ان کا تعاون و ہمدردی حاصل کرے۔

1900ء کے ابتدائی مہینوں میں دت نے مختلف ہندوستانی صوبوں میں مال گزاری کے بندوبست کے متعلق لارڈ کرزن کو کھلی چٹھیاں لکھی تھیں۔ اسی سال کے آخری مہینوں میں انہوں نے ایک کتاب شائع کی تھی جو ان کھلی چٹھیوں کے علاوہ ایسے مضامین پر مشتمل تھی جو قحطوں اور ہندوستان میں مال گزاری کی تشخیص کے متعلق لکھے گئے تھے۔ دسمبر 1900ء میں انہوں نے ہندوستان کے کئی سابق انگریز حکام کا تعاون حاصل کیا اور سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کو ایک

مشترک یادداشت پیش کیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان میں مال گزاری کی تشخیص پر معقول بندشیں عائد کی جائیں۔ سابق ملازمین کی اس اہم عرضداشت کا جواب حکومت ہند کو دینا پڑا۔ یہ جواب ہندوستان میں مال گزاری کی پالیسی کے متعلق لارڈ کرزن کی مشہور تجویز کی صورت میں دیا گیا جو 1902ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان واقعات کے سیاق وسباق میں اکنامک ہسٹری لکھی گئی۔ انگلستان کے دوران قیام دت ہندوستان کے حالات پر تقریریں کرنے اور مضامین لکھنے میں مصروف رہے۔ ان تقریروں اور تحریروں کے موضوعات ان کی خاص خاص دلچسپیوں اور انداز فکر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ 1901ء اور 1902ء کی تقریریں اور تحریریں ہندوستان کے معاشی حالات، قحط اور اراضی کے مسائل کے علاوہ کاشتکاری ور صنعتوں کے موضوعات پر ہیں۔

ان میں سے زیادہ تر تحریروں اور تقریروں میں اس نامکمل مواد کی ابتدائی شکل دیکھی جاسکتی ہے جو اکنامک ہسٹری میں شامل کیا گیا۔

اکنامک ہسٹری آف انڈیا...... Economic History of India دو ضخیم جلدوں صنعتوں، کاروباروں اور حرفتوں کی واضح تاریخ ہے۔ آراضی کے بندوبستوں کی تاریخ کے متعلق یہ حرف آخر ہے۔ سرکاری حوالوں کے علاوہ آج لارڈ کرزن کی آراضی کی تجویز کو کوئی مشکل ہی سے پڑھتا ہوگا۔ مسٹر رمیش دت کی اکنامک ہسٹری کے دو یا تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور ہر وہ ہندوستانی جو ہندوستان کے معاشی حالات میں اور یہاں کے لوگوں کی تاریخ میں دلچسپی رکھتا ہے اس کتاب کا مطالعہ کرتا ہے۔''

اگر کوئی تاریخی تصنیف بنیادی طور سے ماضی کو عصری حالات سے مربوط کرے تو اس کی وجہ سے اس کی قدر وقیمت کم نہیں ہوا کرتی ہے۔ حقیقت میں اس بات پر اتفاق رائے ہو چکا ہے کہ بار بار تاریخ لکھنے کا جواز یہ ہے کہ ماضی یا ماضی کے کچھ حصوں کی تعبیر تو اس طرح کی جائے کہ وہ آئندہ نسلوں کے لئے بامعنی بن جائیں۔ عصری حالات سے دت کی تاریخ کے گہرے ربط نے ان حالات کے متعلق دت کے تصورات اور ان کے تاریخی ارتقاء کے متعلق مصنف کے خیالات کو سمجھنے کے لئے نہایت کارآمد بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں اپنے تناظر کو نہایت عمدگی سے پیش کرنے کا نمونہ مختلف کتابوں کے پیش لفظوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان تحریروں کے کچھ ٹکڑے ذیل میں یکجا کر دیئے گئے ہیں تاکہ ایک اجمالی خاکہ بن جائے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کے معاشی حالات پر قحطوں کے گہرے سائے پڑ رہے تھے۔ دت نے...... England And India کے پیش لفظ کے ابتدائی جملوں میں جو تصویر پیش کی ہے اس سے ان حالات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

"دنیا کے ہر گوشے میں پھیلی ہوئی برطانوی سلطنت کے لئے یہ سال مسرت کا سال تھا۔ لیکن ہندوستان کے لئے انگریزی راج قائم ہونے کے بعد یہ سب سے تباہ کن سال تھا۔ طاعون نے ایک صوبے کے قریب قریب سبھی بڑے شہروں کو ویران کر دیا۔ ایک دوسرے صوبے کے شہروں اور قصبوں کو ایک تباہ کن زلزلے نے برباد کر ڈالا اور ایک ایسے قحط نے جس کی وسعت کی نظیر ہندوستان میں نہیں ملتی۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تباہی مچا دی۔

لیکن 1897ء کا قحط تو قحطوں کے اس سلسلے کی ایک کڑی تھا جو موجودہ صدی میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہندوستان میں پڑتے رہے تھے۔ یورپ کی حد تک قحط داستان پارینہ بن گئے ہیں لیکن ہندوستان میں ہر نسل، بیس سال کی ہر مدت، اپنے دکھوں کی ایک کہانی سنا سکتی ہے۔ ملکہ کی تخت نشینی کے سال میں ایسا شدید قحط پڑا کہ شمالی ہند تباہ ہو گیا۔ قحط کے شکار ہونے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچی۔ اگلے بیس سال کی مدت کا آغاز اس سال ہوا جس سال ہندوستان میں بغاوت ہوئی تھی۔ اس میں تین قحط پڑے۔ شمال۔ مغرب کا قحط، اڑیسہ کا قحط اور بہار کا قحط۔ جس میں شائع ہوئی پہلی جلد The Economis History of India Under Early British Rule کے پہلے ایڈیشن کا پیش لفظ دسمبر 1901ء میں لکھا گیا تھا اور دوسری جلد The Economic History of India in the Victorian Age کے پہلے ایڈیشن کا پیش لفظ دسمبر 1903ء میں لکھا گیا تھا۔ دونوں جلدوں کے دوسرے ایڈیشنوں کے پیش لفظ اگست 1906ء میں لکھے گئے تھے۔ دت کا انتقال نومبر 1909ء میں ہوا۔ ان کی زندگی میں اکنامک ہسٹری کا کوئی اور ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ دوسرے ایڈیشنوں کے پیش لفظوں میں معمولی اصلاحوں اور دونوں جلدوں میں تھوڑی بہت ردو بدل کے علاوہ کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتابیں 1901ء اور 1903ء کی درمیانی مدت کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

دت کے کام کی اہمیت کو اور اکنامک ہسٹری کے اثر کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ یہ ایک ایسے شخص کی تصنیف تھی جو حاکم رہ چکا تھا، وسیع تجربہ

رکھتا تھا اور معاشی پالیسی اور سیاسی اصلاحات کے متعلق اپنے تصورات کو تسلیم کروانے کے لئے عملی سیاسی جدوجہد میں حصہ لے رہا تھا اس لئے تاریخ کی تصنیف لازمی طور سے عصری معاشی حالات اور ان کے نشوونما پانے کے انداز کے متعلق دت کے تصورات سے متاثر ہوئی۔ دت کے بہت سے ہم عصروں نے اس تاریخ کو سیاسی جدوجہد کا حصہ سمجھا۔ دت کی زندگی میں ان کی سوانح حیات کا ایک چھوٹا سا خاکہ شائع ہوا تھا۔ اس کا مندرجہ ذیل اقتباس اس نقطہء نظر کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

''اگر لارڈ کرزن سمجھتا تھا کہ اس مشہور نزاعی مسئلے پر وہ کوئی مسکت دلیل پیش کر سکے گا تو اس نے اپنے مخالف فریق کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ کھلی چٹھیوں کو شائع کرنے اور یادداشت پیش کرنے کے بعد مسٹر رمیش دت ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے نہیں رہے۔ انہوں نے جو کام ہاتھ میں لیا تھا۔ اس میں اپنی تمام قوت لگا دی۔ ہندوستان میں برطانوی راج کی ابتدا سے لے کر اس وقت تک تمام نیلی کتابوں Blue Books کا ایک بڑا ذخیرہ انہوں نے جمع کر لیا تھا جو دو سو سے زیادہ مجلد ضخیم کتابوں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے ان بیش بہا معلوماتی کتابوں کو کھنگال ڈالا۔ مال گزاری کے بندوبست صنعتوں اور ہندوستان کی مالیات کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا اور ایک جامع اکنامک ہسٹری اہم کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ پہلی جلد 1902ء میں چھپی اور دوسری 1904ء میں۔ یہ کتاب مسٹر رمیش دت کی مستقل مزاجی، محنت اور ادبی صلاحیتوں کا شاہکار ہے۔ یہ ہندوستان کی سال ملکہ نے ملکہ ہند کا لقب اختیار کیا اس سال مدراس میں خوفناک قحط پڑا جس میں جنوبی ہند کے پچاس لاکھ انسانوں کی جانیں گئیں۔ بدقسمتی سے ملکہ کی تاج پوشی کے ساٹھویں جشن کے سال میں ہندوستان میں ایک اور قحط پڑا ہے جس کی زد پر ہندوستان کا بڑا حصہ آ گیا ہے اور خیال ہے کہ لوگوں کو سہولت پہنچانے کی کوششوں کے باوجود لاکھوں انسان اس کے شکار ہو جائیں گے۔ جدید ہندوستان کی تاریخ میں 1837ء، 1857ء اور 1897ء سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ترقی اور خوشحالی کے بجائے تباہی اور بربادی کے سنگ میل۔''(1)

دت غربت اور ترقی نہ کرنے کے اسباب معلوم کرنے کے لئے بے چین تھے۔ مکمل صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے انہوں نے مندرجہ ذیل سوال اٹھائے۔

''کیا کاشتکاری کے میدان میں ترقی ہو رہی ہے؟ کیا صنعت وحرفت فروغ پا رہے ہیں؟

کیا مالیات کا مناسب انتظام کیا جارہا ہے تاکہ محصول ادا کرنے والوں کو اس کا موزوں معاوضہ مل جائے؟ کیا عام لوگوں کی مادی خوش حالی کی خواہشمند حکومت قومی دولت کے وسائل کو توسیع دے رہی ہے۔ جب ایک عام انگریز کسی ملک کی معاشی حالت کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اس قسم کے سوالات اٹھایا کرتا ہے۔ ہندوستان کے حقیقی حالات معلوم کرنے کے لئے بھی اس قسم کے سوالات کرنے پڑیں گے۔'' (2)

دت نے اپنی تاریخ کی دونوں جلدوں میں اس قسم کے سوالوں کے جواب وضاحت کے ساتھ دیئے ہیں۔ دونوں جلدوں کے پیش لفظوں میں ان کی تلخیص پیش کی گئی ہے جن کے مختصر اقتباسات ذیل میں درج کئے جارہے ہیں۔

''کسی قوم کی دولت کے ذرائع کاشت، صنعت وحرفت اور صحت مند مالیاتی نظام ہوا کرتے ہیں۔ انگریزی راج نے ہندوستان کو امن وچین کی دولت بخشی لیکن اس نے ہندوستان کی قومی دولت کے ذرائع کو نہ تو ترقی دی اور نہ ان کی توسیع کی۔''

''اس وقت تجارت اور صنعتوں کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے دوسری کتابوں میں India Under Early British Rule 1757-1857 اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کی ابتدائی برسوں میں ہندوستان کے تعلق سے حکومت برطانیہ کی تجارتی پالیسی کا جائزہ لیا ہے۔ اس زمانے میں حکومت برطانیہ نے آئرلینڈ اور نوآبادیوں کے تعلق سے جو پالیسی اپنائی تھی اس کا اطلاق ہندوستان پر بھی کیا گیا۔ کوشش کی جاتی تھی کہ ہندوستانی مصنوعات کی جگہ برطانوی مصنوعات حاصل کرلیں۔ یہ پالیسی کامیاب اور ہندوستان کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔ امتناعی محاصل عائد کرکے یورپ میں ہندوستانی مصنوعات کی درآمد کو ختم کردیا گیا اور برائے نام محاصل لگا کر برطانوی مال کی ہندوستان کو برآمد کی ہمت افزائی کی گئی۔ انگلستان کی ابتدائی تجارتی پالیسی کے دو مقصد تھے۔ برطانوی صنعتوں کے لئے خام مال ہندوستان میں پیدا کیا جائے اور برطانوی مصنوعات کی ہندوستان میں کھپت ہو۔ 1837ء میں جب ملکہ وکٹوریہ تخت پر بیٹھی...... اس وقت بھی سابقہ پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی...... ڈیڑھ صدی تک ہندوستان کے برطانوی حکمرانوں کی تجارتی پالیسی کا تعین ہندوستانی صنعت کاروں کے مفاد کے بجائے برطانوی صنعت کاروں کے مفاد کی بناء پر کیا جاتا رہا۔'' (3)

اب لے دے کے صرف کاشت ہندوستان کی قومی آمدنی کا ذریعہ رہ گئی ہے اور ہر پانچ میں سے چار ہندوستانی کاشت پر انحصار کرتے ہیں لیکن برطانوی حکومت کا عائد کردہ آراضی کا محصول نہ صرف بہت زیادہ ہے بلکہ اس کی بڑی خرابی یہ ہے کہ بہت سے صوبوں میں یہ بدلتا رہتا ہے در غیر یقینی ہوتا ہے...... ہندوستان میں ریاست نے لوگوں کے لئے نہ جدید صنعتیں شروع کیں ہیں اور نہ قدیم صنعتوں کی تجدید کی ہے۔ اس کے برخلاف حکومت ہر نئے بندوبست میں دخل اندازی کرتی ہے اور زمین کی پیداوار کا وہ حصہ لے لیا کرتی ہے جس کو وہ اپنا سمجھتی ہے۔"(4)

"ایک ہندوستانی شاعر نے کہا ہے کہ بادشاہ کے عائد کردہ محاصل زمین کا وہ نم ہے جس کو سورج پی جاتا ہے اور زرخیز بنانے والی بارش کی صورت میں زمین کو واپس کر دیتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی زمین کا نم ہندوستان کے بجائے دوسرے ملکوں پر برستا ہے اور انہیں زرخیز بناتا ہے۔"(5)

"چالیس سالہ زمانہ امن میں...... ہندوستان کا قرض برابر بڑھتا رہا اور اب (1901ء) 20,00,00,000 پاؤنڈ ہو گیا ہے۔ ہندوستان کی قومی آمدنی سے جو رقم "گھریلو اخراجات" کے لئے ہر سال انگلستان بھیجی جاتی ہے وہ بڑھ کر سولہ ملین ہو چکی ہے۔ ان یورپی حاکموں کی مجموعی تنخواہ دس ملین ہو جاتی ہے جو قریب قریب سب اعلیٰ عہدوں پر قابض ہیں۔ اس طرح ہندوستان کی خالص آمدنی کا نصف حصہ جو اس وقت چوالیس ملین پونڈ ہے۔ ہر سال ہندوستان کے باہر چلا جاتا ہے۔ بلاشبہ ہندوستان کا نم دوسرے ملکوں کی خوش حالی اور زرخیزی کا باعث بن رہا ہے۔"(6)

"ایک ایسے شخص کے لئے جس نے اپنی زندگی کے بہترین اور آسودہ ترین سال ہندوستانی انتظامیہ کے ایک رکن کی حیثیت سے گزارے ہوں۔ یہ کام نہ صرف تکلیف دہ بلکہ احسان فراموشی کے مترادف ہے کہ اسے انتظامیہ کے کمزور پہلوؤں یعنی حکومت ہند کی مالیاتی اور معاشی پالیسی کا تذکرہ کرنا پڑے۔ برطانوی ہند کی معاشی کہانی سنانے اور ہندوستان کی شدید افلاس کی توجیہ کرنے کا وقت آ گیا ہے اس لئے میں یہ ناگوار فرض ادا کر رہا ہوں۔ آپ کسی ملک میں اس قسم کے حالات پیدا کر دیجئے کہ اس کی صنعتیں تباہ ہو جائیں، اس کی زراعت پر غیر یقینی محاصل عائد کر دیئے جائیں اور وہاں اس قسم کا مالیاتی نظام قائم کر دیا جائے کہ اس کی آدھی آمدنی ہر سال ملک

کے باہر چلی جایا کرتی ہے تو دنیا کی خوش حال ترین قوم کو بھی جلد قحطوں کا سامنا کرنا پڑ جائے گا۔''(7)

چنانچہ دت نے اس وقت کے حالات کی تصویر پیش کی، ان کا تجزیہ کرنے کے لئے ضروری سوالات اٹھائے اور ان سوالوں کے ایسے جواب دیئے جن سے حالات کے تاریخی ارتقاء کی توضیح کی جا سکے۔ تاریخی تحریروں کو عصری مسائل سے اس طرح مربوط کر کے ان کے حل تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ اپنے زمانے کے مسائل کو حل کرنے کے اقدام کی واضح نشان دہی دت نے مندرجہ ذیل انداز میں کی۔

''ہر خرابی میں اس کے تدارک کی صورت مضمر ہوا کرتی ہے۔ ہندوستان کی مشینی صنعتوں پر عائد کئے جانے والے اکسائیز کے محاصل ختم کر دیئے جائیں اور جس طرح ہر متمدن حکومت اپنے ملک کی صنعتوں کی مدد کرتی ہے۔ ہندوستان کے لوگوں کی بھلائی کے پیش نظر ہندوستان کی حکومت کو جرأت کے ساتھ ہندوستانی صنعتوں کی امداد کرنی چاہئے۔ مال گزاری کے علاوہ آراضی کے تمام محاصل منسوخ کر دیئے جائیں اور مال گزاری کی تشخیص میں اعتدال کے ساتھ ضبط و نظم سے بھی کام لیا جانا چاہئے۔ قومی قرض چاہے ابتدا میں غیر منصفانہ ہو مگر اب ایک مسلمہ حقیقت بن چکا ہے۔ پھر بھی شہنشاہی ضمانت کی بنا پر سود کی شرح میں کمی کی جا سکتی ہے اور ایک ذخیرہ ادائی کے ذریعے رفتہ رفتہ اس کا حجم کم کیا جا سکتا ہے۔ انگلستان میں ہونے والے سول اور فوجی اخراجات انگلستان کو برداشت کرنے چاہئیں یا کم از کم جس طرح وہ نو آبادیات کے اخراجات کا ایک حصہ ادا کرتا ہے ویسے ہی اس کو ہندوستان کے اخراجات کا حصہ رسدی بار اٹھانا چاہئے۔ زیادہ ہندوستانیوں کو ملازمتیں دے کر ہندوستان کے سول اخراجات میں کمی کی جانی چاہئے۔ ہندوستان کے فوجی اخراجات کو سختی کے ساتھ کم کیا جانا چاہئے اور ہندوستان میں صرف ضرورت کے مطابق فوج رکھنی چاہئے۔ سرکاری قرضوں یا اس سود کی بنا پر جس کی ضمانت ہندوستانی محاصل کی بنیاد پر کی جائے۔ ریلوں کی مزید توسیع کی ممانعت کر دینی چاہئے۔ عام محاصل سے حاصل ہونے والے روپے سے آب پاشی کے ذرائع کو توسیع دی جانی چاہئے۔ ہندوستان سے سالانہ دولت کے نکاس کو رفتہ رفتہ کم کرنا چاہئے۔ ان مالیاتی اصلاحات کو نافذ کرنے کے لئے ہندوستان کے لوگوں کے نمائندوں کا یعنی محصول دہندگان کے نمائندوں کا تعاون حاصل کرنا چاہئے اور ان سے مدد لینی

چاہئے جو دنیا کے ہر ملک میں اخراجات کی کمی کے مسئلے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔"(8)

(3)

دت کی اکنامک ہسٹری ایک مستند کتاب ہے۔ خاص طور سے ابتدائی زمانے کی تاریخ کے لئے پارلیمانی دستاویزات کے بڑے ذخیرے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ دت نے بھی محسوس کیا کہ ہندوستان کی حکومت کمپنی سے شاہ انگلستان کو منتقل ہو جانے کی وجہ سے ہندوستان کے نظم ونسق کے متعلق پارلیمنٹ کی اس تحقیق وتفتیش کا سلسلہ منقطع ہو گیا جو کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے وقت کی جاتی تھی۔ تھوڑے وقفے کے بعد ہونے والی اس تفتیش کے نتیجہ اور دوسری معلومات جو وقتاً فوقتاً پارلیمنٹ سے حاصل ہوتی رہتی ہے، ایک بڑے ذخیرے کی صورت اختیار کر چکی تھی اور دت نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ دت کی تاریخ میں خصوصیت کے ساتھ رپورٹوں اور شہادتوں کے طویل اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ دت نے رپورٹوں، مراسلوں اور شہادتوں کے جو اقتباسات دیئے ہیں ان کے سلسلے میں اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ اکنامک ہسٹری لکھتے وقت دت کے ذہن میں زیادہ تر انگریز قاری تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنا کیس پیش کرتے وقت انگریز حکام کی کہی ہوئی باتوں کے اقتباسات کو بنیاد بنایا چاہے وہ بیانات سرکاری تھے یا غیر سرکاری۔

دت نے خصوصیت کے ساتھ اپنی پہلی جلد میں جو مواد پیش کیا ہے وہ زیادہ تر پارلیمنٹ کی دستاویزات، خصوصیت کمیٹیوں اور کمیشنوں کی رپورٹوں اور ان کے سامنے پیش کی جانے والی شہادتوں حکام کی روداددوں اور سرکاری مراسلوں پر مشتمل ہے۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ انہیں جو بھی ماخذ میسر آ سکے انہوں نے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے مل (Mill) کے (Kaye) اور ہنٹر (Hunter) کی طرح مستند تاریخوں، الفنسٹن (Elphinston) کاٹن (Cotton) لارنس (Lawrence) اور مل (Mill) کی طرح کی سوانح عمریوں، بکانن (Buchanan) اور بشپ ہبر (Bishop Heber) کے طرح کے مستند سفرناموں اور منرو (Munro) اور سلی مین (Slee Man) کی طرح کی مستند یادداشتوں سے مواد حاصل کیا۔ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ اٹھارہویں صدی کے آخری دور اور اس زمانے میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق کتابچوں، تجارتی مراکز کی رپورٹوں، انتظامی رپورٹوں، تجارتی مراکز میں نافذ ہونے والے ضابطوں اور

قوانین مال کے اقتباسات پیش کئے۔ دت نے زیادہ تر ایسا مواد استعمال کیا جو سرکاری سرگرمیوں یا تحقیقات کا نتیجہ تھا اور زیادہ تر غیر سرکاری مواد بھی خصوصی معلومات پر مبنی تھا۔ چنانچہ دت کی تاریخ بڑی حد تک ان اعداد و شمار، بیانات، واقعات، شہادت و خیال پر مشتمل ہے جو سرکاری رپورٹوں اور دوسرے ماخذوں سے نہایت سمجھداری کے ساتھ اخذ کئے گئے ہیں اور توضیحات و تشریحات کے ذریعے مربوط کر دیئے گئے تا کہ تاریخی ارتقاء کے ساتھ ان مقاصد اور پالیسیوں کی ایک واضح تصویر پیش کی جا سکے جو ارتقاء کی سمت کا تعین کرتے تھے۔

جس قسم کا مواد انہیں حاصل ہو سکا اس کے نتیجے کے طور پر اور تاریخی ارتقاء کے متعلق ان کے تصورات کے نتیجے کے طور پر بھی دت نے انگریزوں کو اور خصوصیت کے ساتھ انگریزی راج کو چاہے وہ کمپنی کا تھا یا شاہ انگلستان کا، فعال عامل سے تعبیر کیا اور ہندوستان کے لوگوں اور یہاں کے حالات کو بڑی حد تک مجہول قرار دیا۔ وہ صرف کبھی کبھی فعال عامل کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب ان پر ضرورت سے زیادہ بار پڑا اور اس کا شدید اور کبھی کبھی تشدد آمیز ردعمل ہوا۔ چونکہ اکنامک ہسٹری کی بنیاد پر سرکاری سرگرمیاں اور پالیسیاں ہیں اس لئے اس میں سیاسی حادثات و واقعات کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور ان واقعات کو معاشی تاریخ سے مربوط بھی کر دیا گیا ہے۔ سیاسی تاریخ کے لئے سمجھا جاتا تھا کہ وہ مختلف گورنر جنرلوں اور وائسرایوں کے ادوار حکومت اور ان کی داخلی اور خارجی جنگوں اور فتوحات کی تاریخ ہے۔ ہر دور کے سیاسی حالات بیان کرنے کے بعد دت نے مختلف معاشی موضوعات کا جائزہ لیا۔ انگریزی راج کے ابتدائی دور کی معاشی تاریخ میں دت نے تمام موضوعات اور تمام علاقوں کا جائزہ لینے کے لئے ادوار کی تقسیم کا طریقہ نہیں اختیار کیا۔ اس میں انہوں نے اپنے بیان کو مختلف سرگرمیوں، انتظاموں یا واقعوں مثلاً جنگوں یا مال گزاریَ کے بعد بندوبستوں سے مربوط کر دیا ہے۔ کسی خاص موقع پر جس موضوع کے متعلق انہیں زیادہ اور اہم مواد مل گیا۔ انہوں نے اس کو مرکزی موضوع بنا کر تاریخ لکھنی شروع کر دی لیکن عہد وکٹوریہ میں انہوں نے موضوع کو تین ادوار میں تقسیم کر دیا ہے۔ ہندوستان کمپنی کے زیر حکومت، ملکہ انگلستان کے زیر حکومت اور ملکہ سلطنت برطانیہ کے زیر حکومت۔

دونوں جلدوں میں دت نے مال گزاری کے بندوبست کے موضوع کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ مال گزاری کے بندوبست، مال گزاری کی تشخیص اور مال گزاری کی شرح کو اہمیت

دینا بھی چاہیے تھی۔ ہندوستان میں مال گزاری آمدنی کا اہم ترین ذریعہ تھی اور اس زمانے میں بھی رہی جس پر دت کی اکنامک ہسٹری محیط ہے۔ ہر حکومت انتظامی اور مالیاتی تاریخ کی تشکیل میں مال گزاری کے طریقے اور اس کے عمل درآمد کا اہم رول ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں زراعت ہندوستان کی سب سے اہم معاشی سرگرمی تھی اور کاشت اور کاشتکار کی قسمت کا دارو مدار مال گزاری کی شرح اور اس کی تشخیص اور وصولیابی کے طریقوں پر تھا۔ مدتوں تک ہندوستان میں فیض رساں اور جابر حکومت کے فرق کی بنیاد مال گزاری کے طریقوں کو سمجھا جاتا رہا تھا۔ اگر مال گزاری کا طریقہ اعتدال اور انصاف پر مبنی تھا تو حکومت فیض رساں سمجھی جاتی تھی اور ظالمانہ اور تباہ کن تھا تو حکومت جابر سمجھی جاتی تھی۔

انگریزوں نے پرانے زمانے کے بیرونی فاتحوں کے طریقہ عمل سے انحراف کیا اور اپنے پیش رووٗں کے طریقوں اور ضابطوں کو منسوخ کر کے اپنے تصورات کی روشنی میں نظم ونسق اور مال گزاری کا ایک نیا ڈھانچہ بنانے کی کوشش کی۔ اس ملک اور یہاں کے لوگوں کے لئے انگریز اجنبی تھے اور اس لئے عبوری دور میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ مورخ کو اس عبوری دور کا جائزہ لینے کے لئے اسے تین ذیلی ادوار میں تقسیم کرنا پڑا۔ پہلی ذیلی دور وہ تھا جب انگریزوں نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے زیادہ مداخلت کرنی شروع کی۔ ظاہر ہے کہ اس سے بہت سے علاقوں میں بدامنی پھیل گئی۔ اور اس وقت تک پھیلی رہی جب تک انگریزوں نے ان علاقوں پر قبضہ نہیں کرلیا۔ دوسرا ذیلی دور وہ تھا جو انگریزوں نے ان علاقوں کو اپنے قبضے میں لینا شروع کیا۔ شروع شروع میں اور خاص طور سے بنگال کی حد تک یہ قریب قریب نراج کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ امن قائم ہوا اور مال گزاری اور نظم ونسق کے نئے طریقوں پر عمل ہونے لگا۔ نئے نئے حاکم حالات سے پوری طرح واقف نہیں تھے ان میں جوش تھا اور کمپنی کے مطالبوں اور ضرورتوں کو پورا کرنا تھا اس کی وجہ سے تیسرے ذیلی دور میں بھی مال گزاری کی اتنی رقم وصول کرنے کی کوشش کی گئی جو زیادہ تر کسانوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس قسم کی کوششیں اس وقت کی گئیں جب کہ جنگ اور نراج کے اثرات پوری طرح زائل نہیں ہوئے تھے اس لئے ان کے نتائج شدید بھی ہوئے اور دوررس بھی۔ دت نے یہ مناسب سمجھا کہ مندرجہ بالا تینوں ذیلی ادوار پر طریقہ مال گزاری کے ارتقاء کی روشنی میں غور کریں۔

دت کی تاریخ کی دوسری جلد میں بھی مال گزاری اور بندوبست مرکزی موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس کتاب کا تعلق اس دور سے ہے جب ہندوستان پر شاہ انگلستان کی حکومت قائم ہوگئی تھی اور نسبتاً زیادہ پرامن حالات پیدا ہو چکے تھے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں دت کا خیال تھا کہ ہندوستان کی غربت کی ذمہ داری بڑی حد تک مال گزاری کے ناقص طریقے پر عائد ہوتی ہے۔ بندوبست کی جن خرابیوں کی طرف انہوں نے اشارہ کیا وہ تھیں تشخیص کی زیادہ شرح، شرح کا غیر یقینی ہونا اور اس امر کا امکان کہ تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد ہونے والی نظر ثانی کے موقع پر زراعت کی تمام تر مزید آمدنی مال گزاری میں شامل کر لی جائے۔ صرف بنگال کا بندوبست استمراری ان نقائص سے پاک تھا۔ ان حالات میں دت نے حتی الامکان کوشش کی کہ مختلف صوبوں میں مال گزاری کے نظریئے اور عمل درآمد میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ وہاں کے کسانوں کی فلاح و بہبود میں ان تبدیلیوں کا کتنا ہاتھ ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان کے زیادہ تر علاقوں میں مال گزاری کا بوجھ یقینی بہت زیادہ تھا اور صدی کے نصف آخر میں بھی یہ بوجھ اتنا زیادہ ضرور تھا کہ لاگت اور قیمتوں میں اہم تبدیلیوں اور پیداوار کی کمی کے زمانے میں اس کو محسوس کیا جاتا تھا۔ اس صدی میں مال گزاری کے طریقے برابر تبدیل ہوتے رہے اور بندوبست و تشخیص مال گزاری کے اصولوں پر مسلسل بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ دت نے ان واقعات و مباحثات سے مواد حاصل کیا تاکہ مال گزاری کی پالیسی میں اعتدال، دوررس تحفظ اور ترقی کے لئے محرکات کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کر سکیں۔

اس مخلصانہ تجزیے اور زوردار نزاعی بیانوں کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس کے متعلق کچھ شکوک و شبہات بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور وہ ہے بنگال کی دیہی علاقوں کے حالات کا بیان اور بندوبست استمراری کے فوائد۔ یہ بات زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ مشرقی بنگال کے کسانوں اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے کسانوں کی معاشی حالت کے فرق کو مال گزاری کے مختلف طریقوں کا نتیجہ سمجھا جائے۔ اپنی ایک ابتدائی کتاب The Bengal Peasantry میں دت نے بنگال کے کسانوں کی حالت کی کوئی دل خوش کن تصویر نہیں پیش کی تھی۔ حالانکہ اس کتاب کا اصل موضوع تو کسانوں کے حالات تھے لیکن اس میں نظم و نسق، دیہی صنعت اور محاصل کا جائزہ بھی لیا گیا تھا۔ ان مضامین میں جو 74-1873ء میں لکھے گئے تھے دت کی ان تحریروں کے متعلق

جو 1897ء کے بعد لکھی گئیں ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ دت نے ابتدا سے ان مسائل پر غور کرنا شروع کر دیا تھا اور اسی وقت ان کے خیالات میں پختگی آ چکی تھی۔ 1874ء میں کسانوں کی حالت اور بنگال کے بندوبست استمراری کے اثرات کے متعلق وہ جو خیالات قائم کر چکے تھے ان کا اظہار...... The Bengal Peasantry کے دیباچے کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتا ہے۔

''ان لوگوں کے علاوہ جو عمداً نظریں چراتے ہیں یہ واقعہ سب پر روشن ہے کہ کچھ زمینداریوں میں اور خاص طور سے چھوٹی زمینداریوں میں اور غیر منافع بخش شکمی کاشت میں متھوٹ یا انفرادی محصول اب بھی تباہ کن حد تک وصول کیا جاتا ہے اور یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ اس کی وجہ سے ادا کی جانے والی رقم قانونی مطالبے یا لگان سے دوگنی ہو جاتی ہے۔ کچھ زمینداریوں میں متھوٹ اب بھی وصول کی جاتی ہے۔ تمام زمینداریوں میں قانونی مطلب سے زیادہ رقم خاص خاص موقعوں پر نذرانے کے طور پر یا تو زمیندار خود وصول کرتے ہیں یا ان کے کارندے وصول کرتے ہیں۔ زمینداروں کے ہاتھوں میں اب بھی اتنی طاقت ہے کہ وہ کسانوں پر طرح طرح کے ظلم توڑ سکیں، انہیں پریشان کر سکیں اور برباد کر سکیں۔ ان کے خلاف قانون کسانوں کا تحفظ نہیں کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اکثر مقامات پر اب بھی کسانوں کو غلام بنا کر رکھا جاتا ہے اور وہ اپنے مالکوں کے غیر منصفانہ احکام و مطالبات کو تسلیم کر لیتے ہیں اور ان کے خلاف مزاحمت کا خیال بھی نہیں کر سکتے۔ اس قسم کے غیر یقینی حالات اور روز افزوں مطالبات نے اور اس قسم کی غلامی نے کسانوں کو اس قابل ہی نہیں رکھا ہے کہ وہ سمجھداری اور جزرسی سے کام لے سکیں، سوچ بچار کی عادت ڈال سکیں اور اپنی حالت سدھار سکیں۔ اس لئے ہم نے آئندہ صفحات میں زمینداروں کے اختیارات پر دائمی بندشیں عائد کرنے کی وکالت کی ہے۔''

بنگال کے حالات کے متعلق دو متضاد تصورات پائے جاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انیسویں صدی کے ربع آخر میں دیہی بنگال کے حالات جزوی طور سے خاصے سنبھل گئے تھے اور دت بعد میں جن نتیجوں پر پہنچے تھے وہ مطلق ہونے کے بجائے صرف اضافی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ لکھتے وقت دت کا خیال تھا کہ بنگال کے کسانوں کی حالت ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے کسانوں سے بہتر ہے۔

دوسرے موضوعات جن پر دت نے قلم اٹھایا صنعت وحرفت، محاصل درآمد برآمد اور بیرونی تجارت، ریلیں، آب رسانی کے ذرائع اور مالیات عامہ ہیں۔ان کا جائزہ لیتے وقت انہوں نے بدیسی راج اور برطانوی پالیسی کے مضر اثرات کی نشاندہی کی۔عصری اعداد و شمار، روداددوں اور کتابچوں سے سندیں مہیا کرتے وقت یہ ثابت کر سکے کہ کمپنی نے، کمپنی کے برطانوی ملازمین اور ہندوستانی گماشتوں نے قیمتیں گرا کے ہندوستانی بنکروں پر کتنے مظالم کئے۔صنعتی انقلاب کے بعد جب انگلستان کے لوگوں نے تجارت میں نسبتاً بہتر حیثیت حاصل کر لی اور مشین سے بنے ہوئے انگلستان کے مصنوعات کم قیمت پر فروخت ہونے لگے تو برطانیہ نے ان مصنوعات کو ہندوستانی منڈیوں تک پہنچانے کی پالیسی اختیار کی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی مصنوعات کم ہو گئے اور بیرونی مصنوعات کی درآمد میں اضافہ ہو گیا۔

دت کی تاریخ میں اور دوسرے ہندوستانی مصنفین کی تحریروں میں انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ریلوں اور آب رسانی کے ذرائع میں جو امتیاز کیا گیا ہے وہ بھی ہندوستانی معیشت کے بنیادی تصورات سے تعلق رکھتا ہے۔ریلوں کی تعمیر کے دو مقصد تھے۔پہلا مقصد دفاعی تھا تا کہ سرحدوں کی حفاظت اور داخلی امن وامان کو برقرار رکھنے کے لئے فوجوں کو تیزی کے ساتھ لایا لے جایا جا سکے۔دوسرا مقصد یہ تھا کہ ''ملک کے دروازے کھول دیئے جائیں'' انگریزوں کے نزدیک اس کے معنی یہ تھے کہ دور دراز حصوں کو بندرگاہوں سے ملایا جائے تا کہ درآمد ہونے والے برطانوی مصنوعات کی فروخت میں اور ملک کے اندرونی حصوں میں پیدا ہونے والے خام مال کی برآمد میں آسانی ہو۔اس زمانے میں انگریزوں کے نزدیک ملک کے دروازے کھولنے کے معنی یہ نہیں تھے کہ ملک کی معیشت کو ترقی دی جائے جیسا کہ دت نے بار بار اشارہ کیا ہے پرانی نوآبادیاتی پالیسی اس وقت بھی برقرار تھی۔اس پالیسی کا مقصد تھا کہ نوآبادیات اور مقبوضات کو انگلستان کے مصنوعات کی منڈی سمجھا جائے اور انگلستان کی معیشت کو جس خام مال اور خصوصی اشیاء کی ضرورت ہو ان کو مہیا کرنے کا ذریعہ سمجھا جائے۔دت کا اصرار تھا کہ آزاد تجارت کے اصول کو تسلیم کرنے سے بظاہر کتنی ہی تبدیلی کیوں نہ آتی ہو پھر بھی برطانوی پالیسی وہی پرانی نوآبادیاتی پالیسی ہے جس کی شکل بدل گئی ہے۔انہوں نے اپنی بات کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے لسٹ (List) کا ایک اقتباس مؤثر انداز سے استعمال کیا۔

ایک طرف ریلوں کا یہ رول تھا اور دوسری طرف اس کا امکان تھا کہ ایک کامیاب طریقہ آب رسانی کا ملک پر خوش گوار اثر پڑے۔ آب رسانی سے کاشتکار کا تحفظ ہو سکتا تھا اور زرعی پیداوار میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے اور تنوع بھی پیدا کیا جا سکتا تھا۔ حالانکہ ریلوں اور آب رسانی کے ذرائع دونوں کے لئے بڑے سرمائے کی ضرورت تھی لیکن اول الذکر کی وجہ سے ہندوستان کی معیشت کا مزید استحصال ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس آب رسانی صرف ایسا ذریعہ تھا جس سے ہندوستانی معیشت کی بنیاد مضبوط بھی ہوئی اور اس میں وسعت بھی پیدا ہوئی۔ یہ وجہ تھی کہ تیزی کے ساتھ ریلوں کی توسیع پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کرنے کی مخالفت کی گئی۔ خصوصیت کے ساتھ آب رسانی کے کاموں کو توسیع دینے کے بجائے ریلوں کو توسیع دینے پر وہ روپیہ خرچ کرنے کی مخالفت کی گئی جو قحط کے زمانے میں سہولت بہم پہنچانے کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

آخر میں مالیات عامہ کا مسئلہ تھا جس کے کئی پہلو تھے۔ برطانوی ہند کے نظم ونسق کے بھاری مصارف نے مال گزاری کی اونچی شرح کو ضروری بنا دیا تھا۔ برطانوی سلطنت کی توسیع کے لئے جو جنگیں لڑی گئیں اور اس مقصد کے لئے ہندوستان میں جو فوجیں رکھی گئیں ان پر خرچ ہونے والے روپے نے ان مصارف میں اور اضافہ کر دیا۔ ریلوں اور دوسرے غیر پیداواری کاموں کے لئے جو قرض لیا گیا تھا اس کے سود کی شرح انگلستان میں ہونے والے مصارف یا گھریلو مصارف، سرکاری ملازموں اور دوسرے لوگوں کا پس انداز کیا ہوا روپیہ جو انگلستان بھیجا جاتا تھا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک سے قابل لحاظ دولت باہر جانے لگی۔

ان حالات کے سیاق وسباق میں دت کی تاریخ کا مقصد تھا کہ سرگرمیوں کے بنیادی محرکات پر روشنی ڈالے۔ مخصوص پالیسیوں کے پس پشت کام کرنے والی طاقتوں کا تجزیہ کرے اور دکھائے کہ مسلسل ہونے والی تبدیلیاں بدیسی راج اور مقامی لوگوں اور ان کے رہنماؤں کی بے بسی کا لازمی نتیجہ تھیں۔ ان کی تاریخ نے جس میں دستاویزی شہادتیں فراہم کی گئی تھیں اس بات کی تشریح کر دی کہ برطانوی صنعت کار ایک زمانے میں ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی کپڑے کو کیوں انگلستان نہیں آنے دینا چاہتے تھے اور دوسرے زمانے میں ہندوستان میں برآمد ہونے والے برطانوی کپڑے پر 5 فیصدی محصول عائد کرنے کے خلاف کیوں تھے؟ اس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح برطانوی تجارت اور صنعتی مفادات نے ہندوستان میں ریلوں کی توسیع کی حمایت کی

اور سرمایہ داروں نے ریلوں کی تعمیر کے سلسلے میں سود کے لئے سرکاری ضمانت حاصل کر لی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر جنگیں اور سیاسی اقتدار کی توسیع کے منصوبے بلاضرورت اور بلا سوچے سمجھے شروع کئے جاتے تھے اور ان میں سے ہر جنگ اور منصوبے کی بنا پر ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ مالی بار برداشت کرنا پڑتا تھا جس میں سرمائے اور رواں اخراجات دونوں کا بار شامل ہوتا تھا۔ ان طاقتور سیاسی اور معاشی مفادات کے مقابلے میں جو ان پالیسیوں کو رواج دیتے تھے۔ خال خال دوراندیش برطانوی حاکم یا غیر سرکاری مبصر ہوتے تھے جو ان سے اختلاف کرتے تھے تھے۔ چنانچہ یہ دکھایا گیا ہے کہ پالیسیوں اور ان کے نتیجے میں ہونے والی تاریخی تبدیلیوں کی ذمہ داری ایسے گروہوں کی سرگرمیوں پر عائد ہوتی تھی جن کے ہاتھ میں سیاسی طاقت ہوا کرتی تھی۔ ماضی بعید اور ماضی قریب کی معاشی تاریخ کا ایک اہم اور فوری سیاسی نتیجہ بھی نکلا اور اس ضرورت کو محسوس کیا گیا کہ ہندوستان کے لوگوں کو ذمہ داری میں شریک ہونے کا موقع ملنا چاہئے۔

## (4)

دت نے ایک تاریخی دور ختم ہونے کے بعد اپنی کتاب لکھی تھی۔ ان کی تاریخ چھپنے کے فوراً بعد کئی ایسی تبدیلیاں آئیں کہ پانچ دہائیوں میں حالات بالکل بدل گئے۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائیوں میں مال گزاری کی تشخیص اور وصولیابی، آب رسانی کے ذرائع کی تعمیر اور لوگوں کو نمائندگی دینے کے متعلق سرکاری پالیسی میں خاصی تبدیلی آئی۔ تبدیلی کم از کم جزوی طور سے دت اور ان کے ساتھیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اسی زمانے میں زراعتی پیداواروں کی قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا جس کا بہت سے کسانوں کی معاشی حالت پر خوش گوار اثر پڑا۔ زراعتی پیداواروں کی قیمتیں پہلے کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے بڑھنے لگیں اور مانٹ فورڈ (Mont Ford) اصلاحات نے ہندوستانیوں کو سیاسی طاقت منتقل کرنے کا کام شروع کر دیا۔ معاشی میدان میں پہلی انقلابی تبدیلی یہ آئی کہ ضروری تفتیش کے بعد خاص خاص معاشی سرگرمیوں کی حد تک حفاظتی محاصل عائد کرنے کی پالیسی تسلیم کر لی گئی۔ اس کے علاوہ صوبوں میں عمومی وزیروں کا تقرر ہوا جس کی وجہ سے صنعت، زراعت، جنگلات وغیرہ کی طرف سرکار کی توجہ مبذول کرائی جا سکی اور ان کے لئے سرکار کی امداد حاصل کی جا سکی۔ بہت سی ریاستوں میں نظام مال گزاری میں اصلاح کے مطالبے پیش کئے جانے

لگے۔ اس کی وجہ سے تھوڑی مدت بعد نظر ثانی کرنے کے کام میں رکاوٹ پڑنے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھی دہائی کی کساد بازاری کے زمانے میں بھی ملک کے زیادہ تر حصوں میں کاشتکاروں پر مال گزاری کا بوجھ اس سے کم تھا جتنا اس وقت تھا جب دت نے اپنی تاریخ لکھی۔ دوسری عالمگیر جنگ اور ملک کی آزادی کے بعد حالات بالکل بدل گئے۔ دت کی تاریخ لکھے جانے کے پچاس سال بعد کے حالات میں اور ان حالات میں جو دت نے پیش کئے تھے کوئی مطابقت نہیں رہی تھی۔ یہ بات حکومت کی سرگرمیوں اور پالیسیوں پر خاص طور سے صادق آتی ہے۔

ان تاریخی تبدیلیوں کی وجہ سے دت کی کتاب کی اہمیت کم نہیں ہوتی ہے اور نہ ان کے بیان و تجزیے کا کوئی اہم حصہ غیر مستند و غیر معتبر قرار دیا جا سکتا ہے۔ مالتھس Molthus کے ساتھ بھی یہ حادثہ پیش آیا کہ اس نے انسانی آبادی کے بڑھنے کے متعلق جو نظریہ پیش کیا تھا اور جو اس کی تحریر کے زمانے سے پہلے مدتوں انسانی تاریخ کی امتیازی خصوصیت سمجھا جاتا تھا۔ اس کی کتاب پرنسپلس Principles کی اشاعت کے کچھ سال بعد تیزی سے بدل گیا۔ مسئلہ آبادی کے متعلق مالتھس نے جو بنیادی اصول بنائے تھے اس تبدیلی کی بنا پر نہ تو ان کی قدر و قیمت کم ہوئی اور نہ مقبولیت۔ دت نے بڑے عالمانہ انداز سے ڈیڑھ صدی کی معاشی تاریخ پیش کی اور غالب رجحانات کا تجزیہ کیا۔ وہ تاریخی دور جس کا انہوں نے ذکر کیا اور جس کے متعلق انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا خود ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالات کی جو تصویر انہوں نے بنائی تھی اس پر تاریخ بھی پڑ گئی۔ اس سے نہ ان کے کام کی اہمیت کم ہوتی ہے اور نہ ان کے خیالات کی صحت۔ لیکن اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ دت کے کام کی اہمیت اس زمانے سے متعلق ہے جس کے بارے میں انہوں نے لکھا تھا۔ ان کا معاشی تجزیہ دنیا کی جدید معاشی تاریخ کے اس اہم دور کی نمایاں خصوصیتوں سے مطابقت رکھتا ہے۔

غالباً دت نے سامراجی دور کی پہلی تاریخ لکھی جو سامراجی سلطنت کے محکوموں کا نقطہ نظر پیش کرتی ہے۔ اس میں اس مخصوص معاشی نظریئے کی موٹی موٹی باتیں ملتی ہیں جو کچھ مدت بعد نوآبادیاتی معاشیات کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ دت نے قبل از وقت وہ باتیں بیان کر دی تھیں جو کچھ مدت بعد نوآبادیاتی معاشیات کے مباحثوں میں کہی گئیں۔ ان

کے بیان میں کچھ ایسی باتیں بھی مضمر تھیں جو پس ماندہ قوموں کی معاشی ترقی سے متعلق تھیں۔ دت کی تمام تحریروں میں سیاسی تصورات اور معاشی پالیسیوں کے باہمی ربط کا شعور ملتا ہے۔ انگلستان کی عصری معاشی تحریروں میں اس ربط کو عام طور سے نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ دت نے بڑی کوشش کے ساتھ اس بات پر بھی روشنی ڈالی جواب تو سب ہی جانتے ہیں مگر اس زمانے میں سب کی نگاہ اس پر نہیں تھی یعنی غالب معاشی مفاد اور معاشی پالیسی کا باہمی رشتہ۔ چونکہ انہوں نے خود کو تاریخی مباحث تک محدود رکھا اس لئے راناڈے کے برعکس انہوں نے معاشی تصورات کی اضافیت سے بحث نہیں کی۔

معاشی مباحث اور ترقی کے تعلق سے یہ بات اہم ہے کہ دت نے معیشت کی اساس پر زور دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ معیشت کی پھیلاؤ رکھنے والی ہمہ جہتی ترقی کا پورا پورا شعور رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ترقی بڑی حد تک بچت کی بنا پر ممکن ہو سکے گی جو پیداواری طبقوں کے پاس چھوڑ دی جائے اور بارآور ہونے دی جائے۔ اس بات پر زور دینے کی وجہ یہ تھی کہ دت کے تصورات ان کے ماحول سے بہت متاثر تھے۔ صنعت کا تحفظ کرنے اور کاشتکاروں کی تکالیف دور کرنے کے علاوہ دت نے ریاست کی پالیسی اور سرگرمی کے مثبت پہلوؤں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ واقعہ یہ ہے کہ بھاری محاصل اور حکومت کے مصارف کی اونچی سطح پر ان کی نکتہ چینی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حکومت کی سرگرمیوں اور اخراجات میں کمی کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن اس بات کو دھیان میں رکھنا چاہئے کہ زیادہ محاصل اور بھاری اخراجات پر دت کے اعتراضات کا بنیادی تعلق اس بات سے تھا کہ محاصل و اخراجات کی وجہ سے ملک سے دولت باہر جاتی ہے۔ اس سلسلے میں دت اور ان کے ہم عصر انگریزی راج کا مقابلہ گزشتہ دور کے مطلق العنان حکمرانوں تک سے کرتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں اگر کوئی بادشاہ زیادہ محاصل لگاتا بھی تھا اور پیداکار لوگوں کے پاس بارآور ہونے کے لئے پیسہ نہیں چھوڑتا تھا۔ پھر بھی وہ وسائل ملک کے اندر رہتے تھے اور بادشاہوں اور درباروں کے اخراجات کی وجہ سے آبادی کے کسی نہ کسی حصے کو ان سے فائدہ پہنچتا تھا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دت کی تحریروں میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ ایک فلاحی ریاست کے بھاری اخراجات کو بھی ناپسند کرتے تھے۔

تاریخ لکھنے کے دوران دت کو اس بات کے زیادہ مواقع نہیں ملے کہ وہ معاشی ترقی کے عمل

کا جائزہ لے سکیں یا ان اثرات پر غور کر سکیں جو ایک محکوم ملک میں بیرونی سرمایہ کاری کا نتیجہ ہوتے ہیں اور جن کا مظاہرہ انگلستان اور ہندوستان کے باہمی رشتے سے ہوتا ہے۔ پھر بھی ان کی کتاب England And India کے ''اختتامیہ'' کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عمل کے مختلف پہلوؤں پر ان کی نظر تھی اور وہ اس کا پورا پورا اور منصفانہ تجزیہ کرنا چاہتے تھے۔

''ہندوستان میں ریلیں اور بار برداری کے لئے دخانی کشتیاں انگریزی سرمائے سے بنی ہیں اور ان کا سود اور منافع انگلستان آتا ہے۔ ان ترقی یافتہ ذرائع نقل و حرکت سے ملک کو طرح طرح کے فائدے ہوتے ہیں جن میں یہ فائدہ بھی کم اہمیت نہیں رکھتا کہ ملک کی فاضل پیداوار منڈیوں تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ نقل و حمل کے ان نئے ذریعوں سے ملک کے ایسے علاقوں کو بہت فائدہ ہوا ہے جن کی پیداوار کی کھپت پرانے زمانے میں صرف مقامی طور پر ہوتی تھی اور جو اپنی پیداوار منڈیوں تک نہیں بھیج سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں پیداوار کی قیمت میں عام طور سے اضافہ ہو گیا ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی مزید آمدنی عام لوگوں کی جیبوں میں صرف وہیں جاتی ہے جہاں ریاست کے مطالبے کا دائمی تعین کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے بڑے حصے میں یہ مزید آمدنی ریاست حاصل کر لیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان علاقوں میں جہاں ریلیں تعمیر ہو رہی ہیں کم مدت کے لئے مال گزاری کا بندوبست کیا جاتا ہے تاکہ یہ مدت ختم ہونے کے بعد ریلوں سے حاصل ہونے والے فوائد ریاست حاصل کر لے۔ ہندوستان میں چائے کی قسم کی نئی چیزیں پیدا کی جا رہی ہیں لیکن انہیں انگریز پیدا کر رہے ہیں اور ان میں انگریزی سرمایہ لگا ہوا ہے۔ ان کا منافع انگلستان آ جاتا ہے۔ ان سے ہندوستان کے کسانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ وہ قانون ہندوستان میں ''غلامی کا قانون'' کہلاتا ہے جس کے تحت چائے کے باغوں کے لئے مزدور بھرتی کئے جاتے ہیں...... حقیقت میں سونے کی سالانہ درآمد سونے کے زیورات اور زر بفت و کمخواب جیسے قیمتی کپڑوں کی فرسودگی اور گھس پس کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ وہ آرائشی اشیاء ہیں جو ہندوستان کے مالدار طبقے استعمال کیا کرتے ہیں۔ جس طرح پیرس سے آنے والے ریشمی ٹوپیاں اور چمڑے کے دستانے انگلستان کے کھیت مزدوروں کی دولت کے مظاہر نہیں۔ اسی طرح ہندوستان میں ہونے والی سونے کی درآمد ہندوستانی کسان کی دولت کو ظاہر نہیں کرتی۔ تجارت اور مفاد عامہ کے کام جو کسی ملک میں خود اس کے سرمائے سے کئے جائیں۔ وہاں کے لوگوں کی

مادی خوشحالی کی دلیل سمجھے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان کی حد تک اس قسم کے کام انگریزی پونجی کی منفعت بخش سرمایہ کاری ہے۔اس سے ہندوستان کو طرح طرح کے فائدے ضرور ہوئے لیکن اس کی وجہ سے ہندوستان کے کاشتکاروں اور دست کاروں کو کوئی مادی فائدہ نہیں پہنچا۔(9)

دت اور ان کے ساتھیوں کی تحریروں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے بیانیہ انداز اختیار کیا ہے اور اعداد و شمار پیش کئے ہیں۔لوگوں کے معیارِ زندگی کی سطح اور اسی قسم کی دوسری باتوں سے ان کی تحریریں بھری ہوئی ہیں۔قومی آمدنی کے سلسلے میں جو بھی معلومات وہ حاصل کر سکے اس کا انہوں نے پورا پورا استعمال کیا۔اکنامک ہسٹری کے آخری بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دت اعداد و شمار کا استعمال نہایت مؤثر انداز سے کرتے تھے۔قومی آمدنی کے تناسب سے ہندوستان کے اوسط محاصل کے متعلق ان کی مندرجہ ذیل رائے جدید اندازِ فکر کی غمازی کرتی ہے۔
''یہ باران لوگوں کو پیسے ڈال رہا ہے جن کی بافت ان کی غذائی ضرورتوں کو مشکل سے پورا کرسکتی ہے۔''

آج ہمارے لئے یہ کام مشکل نہیں ہے کہ کسانوں کے وسائل کی کمی اور ہندوستان کی معیشت پر سالانہ دولت کی نکاس کے مضر اثرات کے متعلق دت کی تشویش پوری طرح سمجھ سکیں۔ جدید معنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک غریب اور غیر ترقی یافتہ ملک ہمیشہ غریب رہے گا۔اگر اس کی چھوٹی موٹی بچت اور تھوڑا بہت پس انداز کیا ہوا روپیہ مسلسل ملک کے باہر جاتا رہے۔دت کی اکنامک ہسٹری کے دونوں جلدوں سے ہمیں یہ درس ملتا ہے۔

آخر میں یہ بتادینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تصورات کی تشکیل میں اور ان کے پرچار میں دت تنہا نہیں تھے۔یہ بات چھپی ہوئی نہیں کہ اس میدان میں پہلا قدم داد بھائی نوروجی نے اٹھایا تھا۔دت کے کئی ہم عصروں نے جن میں انگریز اور ہندوستانی دونوں شامل تھے، اس کی وضاحت کی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر زور دیا۔جدید تاریخ ہند کے نوآبادیاتی دور کی مسلسل و مربوط داستان دت نے سنائی۔اس کام کے لئے انہوں نے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں ایسا تاریخی مواد پیش کردیا جو مدتوں اپنی تازگی برقرار رکھے گا۔اس کے بیش بہا فوری نتائج سے قطع نظر یہ کتاب دت کی ذہانت،علمیت اور بے پناہ وطن دوستی کی ایک زندہ یادگار ہے۔

# حوالہ جات

1. *Dutt, England and India (1897) Preface.*
2. *Dutt Economic History of India Under Early British Rule, Preface.*
3. *Economic History of India in the Victorian Age Preface.*
4. *Economic History of India Under Early British Rule Preface.*

5- ایضاً۔

6- ایضاً۔

7- ایضاً۔

8. *Economic History of India in the Victorian Age, Preface.*
9. *Dutt England and India (1897)*, pp. 130 to 132.

# مقدمہ

چھ سال ہوئے لندن میں ایک تقریب منائی گئی جس نے برطانوی سلطنت کے اتحاد کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کر دی۔ عظیم ملکہ کے دورِ حکومت کے ساٹھ سالہ جشن میں حصّہ لینے کے لیے تمام برطانوی نوآبادیات و مقبوضات سے لوگ آئے تھے۔ ہندوستان کے پردیسی حکمراں کناڈا کے وفادار لوگوں اور آسٹریلیا کے جفاکش باشندوں کے شانوں سے شانے ملائے کھڑے تھے۔ ان مظاہروں میں اتنا جوش تھا کہ انگلستان میں اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس نے اصحابِ فکر کو جرات مندانہ اقدامات، خطرناک جدوجہد اور دانش مندانہ سمجھوتوں کی وہ طویل تاریخ یاد دلائی جس نے ایک عالمگیر سلطنت میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کر دی۔ مختلف خطوں اور مختلف ملکوں میں رہنے والی قوموں نے اُن جشنوں میں حصّہ لیا جو اس تقریب کے شایانِ شان تھے۔

لیکن ایک تکلیف دہ احساس لوگوں کی پریشانی کا باعث تھا۔ سلطنت کے تمام حصّوں میں ترقی و خوشحالی نظر آ رہی تھی اور اُن کے درمیان غریب و افلاس کے منظر صرف ہندوستان پیش کر رہا تھا۔ 1897ء میں اتنے وسیع پیمانے پر اور اتنا شدید قحط پڑا تھا جس کی مثال تاریخ نہیں پیش کر سکتی تھی۔ سلطنت کا سب سے کثیر آبادی رکھنے والا حصّہ اُس کی خوشحالی میں شریک نہیں تھا۔ انگلستان کے ماتحت ملکوں میں ہندوستان سب سے بڑا ملک تھا مگر وہ بڑھتی ہوئی دولت، ترقی پذیر صنعتوں اور فروغ پائی ہوئی زراعت کے فوائد سے محروم تھا۔

قحط کا سلسلہ 1898ء تک جاری رہا۔ 1899ء میں دم لینے کی فرصت ملی۔ 1900ء میں ایک اور قحط پڑا جس نے زیادہ بڑے علاقہ کو متاثر کیا اور زیادہ مدّت تک جاری رہا۔ اس آفت کا سلسلہ تین سال تک چلتا رہا اور لاکھوں انسان اُس کی نذر ہو گئے۔ جنوری 1903ء میں ہونے والے دہلی دربار کے وقت بھی ہزارہا لوگ کیمپوں میں پڑے ہوئے تھے۔

وہ معاشی خلیج جو ہندوستان اور سلطنت کے دوسرے حصّوں کے درمیان حائل ہے اِدھر کچھ

برسوں میں وسیع تر ہوگئی ہے۔ کناڈا اور دوسری نوآبادیات میں فی کس سالانہ آمدنی 48 پونڈ ہے۔ برطانیہ میں یہ آمدنی فی کس 42 پونڈ ہے۔ ہندوستان میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق فی کس سالانہ آمدنی 2 پونڈ ہے۔ برٹش ایسوسی ایشن کے پچھلے اجلاس کے موقع پر برطانیہ کے عظیم ماہر معاشیات سررابرٹ گیفن (Sir Robert Giffin) نے کہا تھا کہ یہ سلطنت کے لیے "ایسی سخت اور مشکل دشواری ہے کہ جیسے جیسے سلطنت کے اتحاد کو حرکی طاقت بنانے کا تصور فروغ پائے گا ویسے ویسے ہمارے مدبروں کو اس مسئلہ پر زیادہ غور کرنا ہوگا۔" سلطنت کی 5/6 آبادی کے بڑھتے ہوئے افلاس و انحطاط کی بنیاد پر سلطنت کے اتحاد کی عمارت نہیں بنائی جاسکتی ہے۔

حالانکہ قحطوں میں لاکھوں انسانی جانیں جاتی ہیں پھر بھی وہ تو ایک زیادہ مہلک بیماری کی علامتیں ہیں۔ اصل بیماری تو ہندوستان کے لوگوں کا دائمی افلاس ہے جس سے کسی حالت میں اُن کا پیچھا نہیں چھوٹتا۔ ایسے حالات کبھی پیدا نہیں ہوئے جب مجموعی اعتبار سے ہندوستان میں غذا کی قلت ہوئی ہو۔ 1897ء اور 1900ء میں بھی ہندوستان میں اتنی غذائی اجناس پیدا ہوتی تھیں کہ وہ پوری آبادی کی ضروریات پوری کرسکتی تھیں۔ لیکن لوگوں کے پاس اتنے وسائل بھی نہیں، وہ اتنی رقم بھی پس انداز نہیں کرسکتے کہ جب ایک علاقے میں فصلیں خراب ہوجائیں تو وہ قرب و جوار کے اُن علاقوں سے غذائی اجناس خرید سکیں جہاں فصلیں اچھی ہوئی ہوں۔ بارش نہ ہونے کی صورت میں تو کسی مخصوص علاقے کی فصلیں خراب ہوتی ہیں۔ لیکن شدید قحط پڑنے کی وجہ تو لوگوں کا افلاس ہے۔

اس کے ثبوت میں بہت سے واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں جن کا ہندوستان کے حکام کو بھی تجربہ ہے۔ میں صرف ایک واقعہ پر اکتفا کروں گا۔ ستائیس سال ہوئے مشرقی بنگال پر ایک تباہ کن آفت آئی۔ 1876ء میں طوفان آیا اور ایک بڑے علاقے میں سمندر کی لہر نے لوگوں کے مکان تباہ کردیئے اور فصلیں برباد کردیں۔ ایک نوجوان افسر کی حیثیت سے مجھے وہاں بھیجا گیا تاکہ میں وہاں کے نظم و نسق کی از سرِ نو تنظیم کروں اور جن علاقوں میں سب سے زیادہ تباہی ہوئی تھی وہاں کے لوگوں کی امداد کروں۔ وہاں کے کسان نسبتاً کم لگان ادا کرتے تھے اور اسی لیے عام حالات میں خوشحال رہتے تھے۔ اپنی کفایت شعاری اور مجوری کی بناء پر، جو ہندوستانی کسانوں کی عادت میں داخل ہیں، انھوں نے کچھ روپیہ انداز کرلیا تھا۔ اس سال انھوں نے اپنے پس انداز

کیے ہوئے روپے سے بہت بڑی مقدار میں چاول خرید لیا۔ وہاں نہ عام قحط پڑا نہ بڑے پیمانے پر ہمیں مالی امداد دینی پڑی۔ خوشحال کسانوں نے جس طرح اپنی مدد آپ کی اُسے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اگر مشرقی بنگال کے کسانوں کی طرح ہندوستان کے دوسرے کسان بھی خوشحال ہوتے تو فصلیں خراب ہونے کی صورت میں بھی قحط شاذ ہی پڑتے۔ لیکن مشرقی بنگال کے مقابلے میں مغربی بنگال میں لگان کی شرح پیداوار کے تناسب سے زیادہ ہے اور مدراس، بمبئی اور دوسرے علاقوں میں زمین کے محصول کی شرح تو بنگال کی شرح سے بھی زیادہ ہے۔ اس لیے لوگ بھی معاشی اعتبار سے نسبتاً کم حیثیت ہیں۔ جس کی وجہ سے قحط بھی بار بار پڑتے ہیں اور ان میں جانی نقصان بھی زیادہ ہوتا ہے۔ لوگوں کا افلاس قحط کی شدّت میں اضافہ کر دیتا ہے۔

کسی قوم کی دولت کے ذرائع زراعت، تجارت، صنعت و حرفت اور صحت مند مالیاتی نظام ہوا کرتے ہیں۔ انگریزی راج نے ہندوستان میں امن قائم کیا لیکن اس نے ہندوستان کی قومی دولت کے ذرائع کی ترقی یا توسیع نہیں کی۔

تجارت، صنعت و حرفت کے متعلق کچھ کہنے کا یہ موقع نہیں۔ اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں برطانیہ عظمٰی نے ہندوستان کی طرف جو تجارتی پالیسی اختیار کی تھی اس روداد کی میں ایک اور کتاب میں بیان کر چکا ہوں۔[1] اس زمانے میں انگلستان آئرلینڈ اور دوسری نوآبادیات کے تعلق سے جس پالیسی پر عمل کرتا تھا وہی ہندوستان کے لیے بھی اختیار کی گئی۔ ہندوستانی مصنوعات کی ہمّت شکنی اور برطانوی مصنوعات کی ہمّت افزائی کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس میں انھیں ہلاکت آمیز حد تک کامیابی ہوئی اور ہندوستان کی صنعتیں تباہ ہوگئیں۔ ہندوستانی صنعتوں پر امتناعی محاصل لگا کر اُنہیں یورپ جانے سے روکا گیا۔ برطانوی مصنوعات پر برائے نام محاصل عائد کیے گئے اور اس طرح ہندوستان میں ان کی درآمد کی ہمّت افزائی کی گئی۔ انگلستان کی ابتدائی تجارتی پالیسی کے دو مقصد تھے برطانوی صنعتوں کے لیے ہندوستان میں خام پیدا کیا جائے اور برطانوی مصنوعات کی ہندوستان میں کھپت ہو۔ بقول مورّخ ہوریس ہیمین ولسن (Horace Hayman Wilson) برطانوی صنعت کاروں نے ''اُس حریف کو دبانے اور بالآخر اُس کا گلا گھونٹنے کے لیے سیاسی ناانصافی کام لیا جس سے وہ برابر کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔''

---

1. انگریزی راج کا ابتدائی دور 1757-1837ء

1837ء میں جب ملکہ وکٹوریہ تخت پر بیٹھی، تو خرابی جڑ پکڑ چکی تھی مگر پہلے جس پالیسی پر عمل ہو رہا تھا اس میں ذرا بھی ترقی نہ آئی۔ ہندوستان کے بنے ہوئے ریشمی رومالوں کی اس وقت بھی یورپ میں مانگ تھی۔ اس لیے ہندوستان میں بنے ہوئے ریشمی کپڑے پر بھاری محصول قائم رکھا گیا۔ پارلیمنٹ نے اس امر کی تحقیقات تو کی کہ برطانوی کرگوں کے لیے ہندوستان میں کپاس کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے لیکن اس نے ہندوستانی کرگوں کو ترقی دینے کے سوال پر غور کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ سلیکٹ کمیٹیوں نے یہ پتا لگانے کی تو کوشش کی کہ ہندوستان میں برطانوی مصنوعات کی فروخت کس طرح ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کو نظر انداز کر دیا کہ ہندوستان مصنوعات کی تجدید کس طرح ہو سکتی ہے۔ 1858ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہونے سے بہت پہلے ہندوستان اپنی صنعتی اہمیت کھو چکا تھا۔ قوم کی گزر بسر کا انحصار بڑی حد تک صرف زراعت پر تھا۔

1858ء کے بعد بھی ہندوستان کے محاصل درآمد و برآمد پر برطانوی تاجر نگرانی کا اختیار رکھتے تھے۔ محاصل درآمد میں تخفیف کر کے برطانوی مال ہندوستان میں درآمد کرنے کے لیے سہولتیں مہیا کی جاتی تھیں۔ بمبئی میں کرگے لگائے گئے یا کپڑے کے مل بنائے گئے تو انگلستان میں جذبہ حسد پیدا ہو گیا۔ 1879ء میں پارلیمنٹ نے مطالبہ کیا کہ ہندوستان کے محاصل درآمد میں مزید تخفیف کی جائے حالانکہ اُس سال ایک قحط پڑا تھا، ہندوستان کو ایک جنگ کے مصارف برداشت کرنے پڑے تھے اور اس کے بجٹ میں خسارہ ہوا تھا اور پھر 1882ء میں نمک اور شراب کا علاوہ تمام محاصل درآمد ختم کر دیئے گئے۔

لیکن اس تخفیف کا خراب اثر ہندوستان کی مجموعی آمدنی پر پڑنے لگا۔ کسانوں پر نئے محاصل لگائے گئے، زراعت پر نئے بار ڈالے گئے پھر بھی ہندوستان کی مالی حالت خراب رہی۔ 1894ء میں تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ ہندوستان کے پُرانے محاصل درآمد کی تجدید کی گئی۔ ہندوستان آنے والے سوتی کپڑے اور سوت پر پانچ فیصدی محاصل عائد کیا گیا۔ ہندوستان کے ایسے سوتی کپڑوں کی قیمتوں پر بھی جو باہر سے آنے والے کپڑوں کا مقابلہ کر سکتے تھے توازن پیدا کرنے کے لیے پانچ فیصدی ڈیوٹی لگائی گئی۔ 1896ء میں سوت کو محصول سے مستثنیٰ قرار دیا گیا لیکن ہندوستان آنے والے سُوتی کپڑے پر ساڑھے تین فیصدی محصول لگایا گیا اور ہندوستان کے

کارخانوں میں بننے والے ہر قسم کے مال پر ساڑھے تین فیصدی اکسائز ڈیوٹی لگائی گئی۔ نفیس کپڑوں کے ساتھ ہندوستان کے بنے ہوئے ان موٹے جھوٹے کپڑوں پر بھی محصول لگایا گیا جو کسی طرح لنکا شائر کے کپڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ایک حسد رکھنے والی حکومت نے ڈھائی شلنگ روزانہ سے بھی کم کمانے والے بدبخت ہندوستانی مزدوروں کے موٹے جھوٹے کپڑوں پر بھی محصول لگا دیا۔ بمبئی کے نوزائیدہ کارخانوں کی ہمت افزائی کے بجائے ان پر ایسی اکسائز ڈیوٹی کا بار ڈال دیا گیا جس کی مثال متمدّن دُنیا کے کسی دوسرے حصّے میں نہیں ملتی۔ پچھلی ڈیڑھ صدی میں ہندوستان کے انگریز حکمرانوں کی تجارتی پالیسی کا تعیّن ہندوستان کے صنعت کاروں کے مفادات نے نہیں بلکہ برطانوی صنعت کاروں کے مفادات نے کیا ہے۔ مصنوعات کی وہ بڑی مقدار داستان پارینہ بن چکی ہے جو ستّرھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں پرتگال اور ہالینڈ کو ہندوستان سے برآمد کی جاتی تھی یا عرب اور انگریز تاجر لے جایا کرتے تھے۔ اب ہندوستان کی برآمدات زیادہ تر خام مال تک محدود رہیں۔ اُس کا بڑا حصّہ غذائی اجناس پر مشتمل ہوتا ہے۔ قومی آمدنی کے ایک ذریعے کی حیثیت سے صنعتوں کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔

اب رہ گئی زراعت۔ انگریزی راج میں امن اور تحفّظ نصیب ہوا جس کی وجہ سے کاشت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ لیکن جو لوگ کسانوں کی حالت سے واقف ہیں وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کاشت میں اضافے کی وجہ قوم زیادہ خوشحال ہوگئی، اس کے وسائل میں اضافہ ہوگیا یا قحطوں کے خطرے سے اب وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہیں۔

ہندوستان کے نظام مال گزاری کی تاریخ بے حد دلچسپ ہے۔ ایک ایسی قوم کی مادّی خوشحالی سے اس کا قریبی تعلّق ہے جس کا انحصار زراعت پر ہے۔ انگریزی راج کے ابتدائی دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کو ایک وسیع وعریض ذاتی جاگیر سمجھتی تھی۔ اس کے خیال میں اُسے حق حاصل تھا کہ زمین کی تمام پیداوار پر قبضہ کرے اور کسانوں اور زمینداروں کے لیے صرف اتنا چھوڑ دے جس سے وہ عام حالات میں بس زندہ رہ سکیں۔ یہ پالیسی کمپنی کی آمدنی کے لیے تباہ کُن ثابت ہوئی اور اصطلاحات کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ اس کے بعد کمپنی نے محسوس کیا کہ سمجھداری کا تقاضا ہے کہ زمینداروں کو مستقبل میں زراعت سے ہونے والے منافع کی ضمانت دی جائے۔ چنانچہ لارڈ کارنواس نے 1793ء میں بنگال میں بندوبست استمراری نافذ کیا۔

زمینداروں سے 90 فیصدی لگان کا مطالبہ کیا گیا لیکن انہیں یقین دلا دیا گیا کہ آیندہ سرکاری مطالبے میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ حالانکہ حکومت کا مطالبہ بہت زیادہ تھا لیکن 1893ء کے بعد زراعت میں جو توسیع اور لگان میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کا فائدہ کسانوں اور میینداروں کو پہنچا۔ آج بنگال کے کسانوں کی حالت بہتر ہے اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے کسانوں کے مقابلے میں وہ قحطوں کے بدترین اثرات سے زیادہ محفوظ ہیں۔

اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی میں ایک تبدیلی آئی۔ وہ دوسرے صوبوں میں بندوبست استمراری کی توسیع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے لگان کے ایک مناسب حصّے کو سرکاری مطالبہ قرار دینے کی کوشش کی تاکہ لگان کے ساتھ مالگزاری میں بھی اضافہ ہوتا رہے۔ شمالی ہندوستان میں اُس نے سرکاری مطالبہ لگان کا 83 فیصدی مقرر کیا۔ پھر اُسے 75 فیصدی کر دیا۔ کچھ مدّت بعد سرکاری مطالبہ 66 فیصدی کر دیا گیا۔ لیکن یہ مطالبہ بھی عملاً بہت زیادہ معلوم ہوا اور بالآخر 1855ء میں اس نے سرکاری مطالبہ لگان کا 50 فیصدی مقرر کیا۔ 1864ء میں مالگزاری کی شرح جنوبی ہند میں بھی نافذ کر دی گئی۔ زراعت کی آمدنی میں 50 فیصدی محصول بہت زیادہ ہے۔ متمدّن دُنیا کے کسی ملک میں مالگزاری کی تشخیص کی یہ شرح نہیں ہے۔ لیکن یہاں تک ہندوستان کا تعلّق ہے اگر اس بھاری شرح تشخیص میں اضافہ نہ کیا جائے تو اسے ہندوستان کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے۔

1858ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور حکومت ختم ہو گیا۔ ملکہ کی حکومت قائم ہونے کے بعد شروع میں جو وائسرائے ہوئے وہ صدق دل سے چاہتے تھے کہ زرعی خوشحالی کو ترقّی دی جائے اور ہندوستان کی زرعی دولت کے زرائع کی توسیع کی جائے۔ سر چارلس وُڈ (Sir Charles Wood) اور سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ (Sir Stafford North Cote) جیسے مدّبر اور لارڈ کیننگ اور لارڈ لارنس جیسے وائسرائے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ سرکاری مطالبے کا تعیّن اس طرح کر دیا جائے کہ قوم خوشحال ہو، ایک وفادار اور طاقتور درمیانی طبقہ وجود میں آ جائے اور اس کے مفادات اُسے ہندوستان کے انگریزی راج سے منسلک کر دیں۔ اگر ان کی صحت مند پالیسی پر عمل کیا جاتا تو قومی دولت کے ایک ذریعے کی توسیع ہو جاتی۔ آج قوم میں زیادہ خود اعتمادی ہوتی اور اس کے پاس زیادہ وسائل ہوتے۔ قحط شاذ ہی

پڑتے۔لیکن شاہی ملازمین کی پہلی نسل ختم ہونے کے بعد قوم کی خوشحالی کی کوششیں بھی بے جان ہوکررہ گئیں۔سامراج کے ارتقاء کے ساتھ مزید آمدنی اور مزید اخراجات کے مسئلے اُن کی توجہ کے مرکز بنتے گئے۔کیننگ اور لارنس کی تجاویز 1883ء میں مسترد کر دی گئیں۔

قارئین اُن دو اصولوں کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے جن پر مختلف خیال سے تعلق رکھنے والے حکام کار بند تھے۔ایک مکتب خیال وہ تھا وہ جس سے لارڈ کیننگ، لارڈ لارنس، لارڈ ہیلی فکس،(Lard Halifax) اور لارڈ اِدس لے (Lard Iddesleigh) متعلق تھے۔یہ لوگ چاہتے تھے کہ مالگزاری کا بندوبست استمراری کیا جائے۔اُن کے علم میں یہ بات تھی کہ ہندوستان میں زمینداروں کے بجائے قوم کی ملکیت سمجھی جاتی ہے، ہر کاشتکار کو اپنی جوت میں موروثی حقوق حاصل ہوتے ہیں اور مالگزاری کے دائمی تعین سے زمینداروں کے طبقے کے بجائے پوری قوم کو فائدہ ہوگا۔دوسرا مکتب خیال اُن لوگوں پر مشتمل تھا جو چاہتے تھے کہ تھوڑی تھوڑی مدت بعد بندوبست کر کے مالگزاری کے سرکاری مطالبے میں اضافہ کرتے رہیں۔سرکاری مطالبے میں اضافہ کرنے کا اختیار عموی طور پر بندوبست کے حکام کو دے دیا جائے۔

1880ء سے 1884ء لارڈ رپن ہندوستان کے وائسرائے کے فرائض ادا کرتا رہا۔اس نے دونوں مکاتیب کی رایوں کے درمیان ایک صحت مند سمجھوتا تجویز کیا۔اس نے ریاست کے اس حق پر اصرار کیا کہ وہ قیمتوں میں اضافے کی معقول بُنیاد پر مالگزاری کے سرکاری مطالبے میں اضافہ کر سکتی ہے۔اس نے ہندوستان کے کسانوں کو یقین دلایا کہ جب تک قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوگا۔اس وقت تک سرکاری مطالبے میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔اس طرح اس نے ریاست کا یہ حق تسلیم کر لیا کہ قوم کی خوشحالی میں اضافہ ہو تو مالگزاری میں اضافہ ہونا چاہیے۔قیمتوں میں اضافے کو اس نے بڑھتی ہوئی خوشحالی کا ثبوت قرار دیا۔اس نے کسانوں کو یہ یقین بھی دلا دیا کہ سرکاری مطالبے کا دائمی تعیّن کر دیا گیا ہے اور مطالبے کا تعیّن کھیت کی پیداوار کے اس تناسب کی بنیاد پر کیا جائے گا جو زمین کے محصول کے طور پر وصول کی جانی چاہیے۔لارڈ رپن کی اسکیم میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ریاست کے مطالبے کا تعیّن کر دیا گیا تھا اور کاشتکاروں کے ان حقوق کا تحفظ بھی کر دیا گیا تھا جن کے بغیر دنیا کے کسی حصّے میں زراعت فروغ نہیں پا سکتی ہے۔لیکن لارڈ رپن دسمبر 1884ء میں ہندوستان سے واپس چلا گیا اور سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے جنوری 1885ء

میں اس کے دانش مندانہ انتظام کو مسترد کر دیا۔ اور سمجھوتا جو کئی سال کی تحقیقات اور تشویش آمیز غور کے بعد ہوا تھا وائٹ حال نے رد کر دیا اور ایک زراعت پیشہ قوم کو ایک دفعہ پھر سرکاری مطالبے کے تعلق سے اُن غیر یقینی حالات کا سامنا کرنا پڑا جو زراعت کے لیے سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں۔

نظری اعتبار سے نصف لگان کا ضابطہ برقرار رہا۔ لیکن عملاً اس کی خلاف ورزی کی گئی۔ غدر کی جنگوں سے ہندوستان کی مالی حالت خراب تر ہو گئی تھی اور محاصل میں اضافہ ضروری ہو گیا تھا۔ انگریز تاجروں اور برطانوی رائے دہندگان کی مرضی کے خلاف تجارت پر محصول عائد نہیں کیا جاسکتا تھا اس لئے زراعت کو مزید محصول کا بار اُٹھانا پڑا۔ چنانچہ 1871ء میں مالگزاری کے علاوہ زمین پر کچھ اور محاصل بھی تشخیص کئے گئے۔ مالگزاری تو لگان کی 50 فیصدی تھی۔ لیکن نئے محاصل کو شامل کر کے زمین کے مجموعی محاصل لگان کے 56 فیصدی یا 58 فیصدی بلکہ کچھ صورتوں میں 60 فیصدی ہو گئے۔ ہندوستان کے لوگ سوچتے تھے کہ زراعت پر اگر مزید محاصل کا بار ڈالنا ہی تھا تو مالگزاری کی حد قائم کرنے سے کیا حاصل ہوا۔

1875ء میں مرحوم لارڈ سیلس بری سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا تھا۔ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جن باتوں پر اس نے توجہ مرکوز کی ان پر اس کی نظر کتنی گہری تھی۔ اس نے 1875ء میں ایک روداد لکھی تھی جس میں ہندوستان کی مالیاتی پالیسی کی کمزوریوں اور یک رُخے پن کی مذمت کی تھی۔ اس روداد کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے۔ لارڈ سیلس بری نے لکھا تھا ''میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے مالیاتی نظام میں جہاں تک ممکن ہو مجموعی قومی اخراجات کی رقم کا کمتر حصہ کسانوں سے وصول کیا جائے۔ یہ کفایت شعاری کی پالیسی نہیں ہے کہ آمدنی کا بڑا حصہ دیہات سے وصول کیا جائے جہاں سرمائے کی قلت ہوتی ہے اور شہری آبادی کو اس بار سے محفوظ رکھا جائے جہاں سرمائے کی افراط ہوتی ہے اور وہ آرائش و آسائش پر برباد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی آمدنی چونکہ ملک کے باہر چلی جاتی ہے اور اسے کوئی معاوضہ نہیں ملتا ہے اس لئے یہ خرابی زیادہ شدید صورت اختیار کر لیتی ہے۔ چونکہ ہندوستان کا خون نچوڑنا ضروری ہے۔ نشتر اُن مقامات پر لگایا جانا چاہیے جہاں خون کی افراط ہو یا کم از کم کافی خون مل سکے۔ اُن مقامات پر نشتر مارنے سے کیا فائدہ جو خون کی کمی کی وجہ سے خود بھی قوت کھو چکے ہیں۔''

لارڈ سیلس بری کی بات سنی اَن سنی کر دی گئی۔ جب سے روپیہ کی قیمت ایک شلنگ چار پنس

مقرر کر دی گئی ہے ہم بھرے پُرے بجٹ اور بار بار ہونے والی بچتوں کی داستانیں سُنا کرتے ہیں۔ لیکن اس نام نہاد خوشحالی سے فائدہ اُٹھا کر کسانوں کی دشواریاں دور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ 1871ء کے بعد مالگزاری کے علاوہ زمین پر جو خصوصی محاصل لگائے گئے تھے اُن میں سے ایک بھی منسوخ نہیں کیا گیا۔

ان واقعات سے جو میں نے مختصراً بیان کئے ہیں یہ ظاہر ہو جائے گا کہ قومی آمدنی کے ایک ذریعے کے طور پر انگریزی راج میں زراعت کو توسیع نہیں دی گئی۔ ان علاقوں کو چھوڑ کے جہاں بندوبست استمراری ہو چکا ہے ہر بیس سال یا تیس سال کے وقفے کے بعد بندوبست کے موقع پر مالگزاری پر نظر ثانی کی جاتی ہے۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ لگان یا معقول لگان کا 50 فیصدی بطور مالگزاری وصول کیا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بمبئی اور مدراس میں اس کی شرح زیادہ ہے۔ مالگزاری کے علاوہ زمین پر دوسرے خصوصی محاصل بھی لگائے جاتے ہیں۔ اُن میں ریاست حسب مرضی جتنا چاہے اضافہ کر سکتی ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ زمین کے محاصل کی شرح تشخیص زیادہ بھی ہے اور غیر یقینی بھی۔ دُنیا کے کسی بھی ملک میں اس قسم کے ضابطے نافذ کر دیئے جائیں تو وہاں کی زراعت دم توڑ دے گی۔ ہندوستان کے کسان کفایت شعار، جفاکش اور امن پسند ہیں۔ اس کے باوجود تباہ حال و بے وسیلہ ہیں اور قحط اور بھک مری کی زد پر رہتے ہیں۔ ان حالات پر کوئی انگریز بجا طور سے فخر نہیں کر سکتا ہے۔ ہندوستان میں اسی قسم کے حالات پائے جاتے ہیں جن کے تدارک کی کوششیں وہ آئرلینڈ میں کر رہے ہیں۔ یہ وہ حالات ہیں جن سے اگر وہ پوری طرح واقف ہو جائیں تو وہ انہیں ہندوستان میں بھی برداشت نہ کریں۔

اگر ہم دولت کے ذرائع سے ہٹ کر دولت کی تقسیم پر غور کریں اور ہندوستان کے مالیاتی نظام پر نظر ڈالیں تو اتنی ہی افسوسناک صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ ملکہ کے دورِ حکومت کے آخری دس سال میں ۔۔۔۔1891-92ء لغایت 1900-1ء۔۔۔۔ ہندوستان کی مجموعی آمدنی 647 ملین پونڈ ہوئی۔ چنانچہ سالانہ اوسط 65 ملین سے کچھ کم آتا ہے جس میں ریلوں، آبپاشی کے ذریعوں اور دوسرے ذرائع سے ہونے والی آمدنی بھی شامل ہے۔ ان دس برسوں میں انگلستان میں جو رقم خرچ کی گئی وہ مجموعی طور پر 159 ملین پونڈ ہوتی ہے جس کا سالانہ اوسط تقریباً 16 ملین پونڈ ہوا۔ چنانچہ ہندوستان کی مجموعی سالانہ آمدنی کا چوتھائی حصہ گھریلو اخراجات کے لئے انگلستان

بھیج دیا جاتا ہے۔ اگر اس رقم میں ہم انگریزی حکام کی تنخواہوں کے وہ حصے بھی شامل کرلیں جو ہر سال ہندوستان سے انگلستان بھیجے جاتے ہیں تو ہر سال ہندوستان سے انگلستان جانے والی رقم 20 ملین سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ دُنیا کا سب سے دولت مند ملک اس قدر گر گیا ہے کہ دُنیا کے غریب ترین ملک سے ہر سال یہ رقم وصول کرتا ہے۔ وہ لوگ جن کی فی کس آمدنی 42 پونڈ ہے ان لوگوں سے دس شلنگ فی کس وصول کرتے ہیں جن کی سالانہ آمدنی 2 پونڈ فی کس ہے۔ برطانیہ کے لوگ جو دس شلنگ فی کس وصول کر رہے ہیں اس سے ہندوستان کے لوگ تباہ ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کے لوگوں کی تباہی ہندوستان کے ساتھ برطانوی تجارت کو تباہ کر رہی ہے۔ وصول ہونے والی رقم سے برطانوی تجارت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا جب کہ اس رقم کی صورت میں ہندوستان کا خون مسلسل نچوڑا جا رہا ہے۔

ملک سے وصول ہونے والے محاصل اگر اسی ملک میں خرچ کیے جائیں تو روپیہ لوگوں میں گردش کرتا ہے، جس کی وجہ سے تجارت، صنعت اور زراعت بارور ہوتی ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں لوگوں کو واپس مل جاتا ہے۔ لیکن جب ایک ملک سے وصول ہونے والے محاصل دوسرے ملک کو بھیج دیئے جاتے ہیں تو وہ رقم ہمیشہ کے لئے کھو جاتی ہے۔ اس سے نہ اس کی تجارت وصنعت کو فائدہ پہنچتا ہے نہ وہ کسی صورت میں لوگوں کو واپس ملتی ہے۔ ہندوستان کی آمدنی میں سے 20 ملین پونڈ سے زیادہ ہر سال باہر چلے جاتے ہیں۔ ایک معجزہ ہوگا اگر یہ طریقہ مدتوں تک جاری رہے اور دُنیا کی دولت مندترین قوم تباہ نہ ہو جائے۔

1900-1ء میں ہندوستان کی مجموعی مالگزاری ساڑھے 17 ملین پونڈ تھی۔ اور اس سال گھریلو اخراجات کی مجموعی رقم 17 ملین پونڈ تھی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں سے وصول ہونے والی مجموعی مالگزاری کے بقدر رقم گھریلو اخراجات کے لئے ہر سال انگلستان بھیجی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی حکام اپنے نجی حساب میں کئی ملین پونڈ ہر سال بھیجتے ہیں۔ چونکہ ان کی تنخواہیں ہندوستان کی قومی آمدنی میں سے ادا کی جاتی ہیں اس لئے جُوں جُوں ہندوستان میں انگریز حکام کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اس کی مناسبت سے باہر بھیجی جانے والی رقم میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

گھریلو اخراجات کے لئے جو 17 ملین پونڈ انگلستان بھیجے گئے وہ مندرجہ ذیل مدوں پر خرچ

کئے گئے۔(1) ہندوستان کے قرض کا سود (2) ریلوں کا سود (3) سول اور فوجی اخراجات۔اس رقم کا ایک چھوٹا سا حصہ تقریباً ایک ملین پونڈ ہندوستان کو بھیجے جانے والے فوجی اور دوسرے سامان پر خرچ کیا گیا۔

انگلستان کے زیادہ تر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہندوستان کا تمام تر قرض اس برطانوی سرمائے کی نمائندگی کرتا ہے جو ہندوستان میں ترقیاتی کاموں پر صرف کیا گیا۔اس کتاب کے صفحات پر دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان کے سرکاری قرض کی حقیقی بنیاد وہ سرمایہ نہیں ہے۔ 1858ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور حکومت ختم ہوا اس وقت ہندوستان پر 70 ملین پونڈ قرض ہو چکا تھا۔اس دوران اس نے ہندوستان سے 150 ملین سے زیادہ رقم بطور خراج وصول کی تھی جس کی وصولی انصاف پر مبنی نہیں تھی۔اس رقم میں سود شامل نہیں ہے۔اس نے افغانستان کی جنگوں، چین کی جنگوں اور دوسری جنگوں کے اخراجات بھی ہندوستان سے وصول کئے۔حالانکہ یہ جنگیں ہندوستان کی سرحد کے پار لڑی گئی تھیں۔انصاف کی رُو سے اگر دیکھا جائے تو کمپنی کی حکومت ختم ہوتے وقت ہندوستان کی طرف کوئی رقم واجب الادا نہیں تھی۔ہندوستان کے سرکاری قرضے کی حیثیت ایک افسانہ سے زیادہ نہ تھی، ہندوستان سے جو رقمیں حاصل کی جا چکی تھیں ان میں سے سو ملین اس کو واپس ملنے چاہیے تھے۔

ملکہ کی حکومت کے پہلے اٹھارہ سال میں ہندوستان کا سرکاری قرض دُگنا ہو گیا۔1877ء میں جب ملکہ نے قیصر ہند کا لقب اختیار کیا تو قرض کی رقم 140 ملین پونڈ ہو چکی تھی۔اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ غدر کی جنگوں پر خرچ ہونے والی رقم کا بار جو تقریباً 40 ملین پونڈ تھی ہندوستان کو اُٹھانا پڑا تھا۔اس کے علاوہ 1867ء کی جنگ حبش کے اخراجات کے سلسلے میں ہندوستان کو ایک بھاری رقم ادا کرنی پڑی تھی۔

1877ء اور 1900ء کی درمیانی مدت میں سرکاری قرض 139 ملین سے بڑھ کر 224 ملین ہو گیا۔اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ضمانت شدہ کمپنیوں نے اور ریاست نے ہندوستان کی ضرورت اور اس کے وسائل سے زیادہ روپیہ ریلوں کی تعمیر پر خرچ کر دیا۔اس کی ایک اور بڑی وجہ 1878ء اور 1897ء میں افغانستان سے لڑی جانے والی جنگیں تھیں۔ہندوستان کے سرکاری قرض کی تاریخ حماقتوں اور ناانصافیوں کی ایک افسوسناک داستان ہے اور ہر غیر جانب دار قاری

خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس قرض کے کتنے حصے کی ادائیگی کی اخلاقی ذمہ داری ہندوستان پر عاید ہوتی ہے۔

گھریلو اخراجات کی آخری مد سول اور فوجی مصارف ہیں۔ اس پر نظرِ ثانی ہونی چاہئے۔ اگر ہندوستان میں انگریزی راج قائم ہونے سے انگلستان اور ہندوستان دونوں مستفید ہوئے ہیں تو انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ اس شاندار عمارت کو بحال و برقرار رکھنے کے اخراجات صرف ہندوستان کو نہیں برداشت کرنے چاہئیں۔ یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ انگلستان میں ہونے والے وہ تمام اخراجات ہندوستان برداشت کرے جن میں انڈیا آفس پر ہونے والے مصارف کے ساتھ وائٹ ہال کے کمرے صاف کرنے والی عورت کی اُجرت تک شامل ہے۔ چالیس سال سے زیادہ ہوئے جب ہندوستان کے ایک عظیم حاکم نے ایک منصفانہ سمجھوتے کی تجویز پیش کی تھی۔ 1809ء میں شائع ہونے والی کتاب Our Financial Relations with India میں سر جارج ونگیٹ (Sir George Wingate) نے مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان میں جو سول اور فوجی اخراجات ہوں انہیں خود ہندوستان برداشت کرے اور انگلستان میں ہونے والے اخراجات کی ذمہ داری انگلستان قبول کرے۔ جس طرح وہ نوآبادیات کے سلسلے میں کیا کرتا ہے۔ کیا اب بھی اس قسم کا مصنفانہ سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ ہندوستان سول اور فوجی مدات میں جو روپیہ انگلستان میں خرچ کرتا ہے اس کی مجموعی رقم 6 ملین پونڈ ہوتی ہے۔ اس رقم میں خاصی کمی کی جا سکتی ہے اگر اس کی ادائیگی کی ذمہ داری برطانوی محصول دہندگان قبول کریں۔ کیا یہ توقع بہت زیادہ ہے کہ انگلستان اتنا بار اٹھائے جبکہ ہندوستان ان سول اور فوجی مصارف کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہے جو ہندوستان میں کئے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں جو معاشی حالات پائے جاتے ہیں ان کی حقیقت یہ ہے کہ ان حالات میں کوئی بھی زرخیز، جفاکش اور پُرامن قوم ان مصائب سے دوچار ہو سکتی ہے جن کا آج ہندوستان کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر صنعتیں ختم کر دی جائیں زراعت پر بھاری محصول عائد کر دیا جائے اور قومی آمدنی کا ایک تہائی حصہ ملک سے باہر بھیج دیا جائے تو دُنیا کا ہر ملک دائمی افلاس اور بار بار پڑنے والے قحطوں کا شکار ہو سکتا ہے۔ ایشیا ہو یا یورپ معاشی قوانین یکساں ہوا کرتے ہیں۔ آج ہندوستان کا افلاس معاشی اسباب کی بناء پر ہے۔ اگر ان حالات میں ہندوستان خوشحال ہوتا تو یہ

معاشی معجزہ ہوتا۔لیکن سائنس کی دُنیا میں معجزے نہیں ہوا کرتے ہیں۔ معاشی قوانین اٹل ہیں اور یکساں انداز سے اپنا کام کیا کرتے ہیں۔ ہر خرابی میں اس کے تدارک کی تدبیر مضمر ہوا کرتی ہے۔ ہندوستان کی مشینی صنعتوں پر لگنے والا ایکسائز محصول منسوخ کر دینا چاہئے اور جس طرح ہر تمدن ملک کی حکومت اپنے ملک کی صنعتوں کی مدد کرتی ہے ہندوستان کے لوگوں کی خوشحالی کے پیشِ نظر حکومتِ ہند کو جرأت کے ساتھ ہندوستانی صنعتوں کی امداد کرنی چاہئے۔ مالگواری کے علاوہ زمین پر لگنے والے تمام محاصل منسوخ کر دیئے جانا چاہیں اور مالگواری کی تشخیص میں اعتدال کے ساتھ ضبط و نظم سے بھی کام لیا جانا چاہئے۔

سرکاری قرضہ ابتداء میں لاکھ غیر منصفانہ سہی لیکن اب ایک مسلمہ حقیقت بن چکا ہے۔ پھر بھی شاہی ضمانت شرح سود میں کمی کر سکتی ہے اور ایک ذخیرہ ادائی کے ذریعہ رفتہ رفتہ اس کو کم کیا جا سکتا ہے۔ انگلستان میں ہونے والے سول اور فوجی اخراجات انگلستان برداشت کرے یا کم از کم جس طرح وہ نوآبادیات کے اخراجات کا ایک حصہ ادا کرتا ہے اسی طرح ہندوستان کے اخراجات کے ایک حصے کی ذمے داری قبول کرے۔ ہندوستانیوں کو زیادہ ملازمتیں دے کر سول اخراجات میں کمی کی جائے۔ ہندوستان میں فوجی اخراجات کو سختی کے ساتھ کم کیا جائے۔ ہندوستان صرف اتنی فوج کے اخراجات برداشت کرے جتنی اس کے لئے ضروری ہے۔ سرکاری قرضوں سے یا محاصل کی بنیاد پر سود کی ضمانت کر کے ریلوں کی مزید تعمیر روک دی جائے۔ جہاں تک ممکن ہو معمولی قومی آمدنی کے روپے سے آبپاشی کے ذرائع کی توسیع کی جائے۔ ہندوستان سے ہونے والے سالانہ دولت کے نکاس کو رفتہ رفتہ کم کیا جائے۔ ان مالیاتی اصلاحات کو نافذ کرنے کے لئے ہندوستان کے لوگوں یعنی محصول دہندگان کا اشتراک و تعاون حاصل کیا جائے۔ ہر ملک میں صرف محصول دہندگان اخراجات کی کمی میں حقیقی دلچسپی رکھتے ہیں۔

جان اسٹورٹ مِل نے لکھا ہے۔ ''حکومت خود اختیاری کا تو ایک مفہوم ہے اور اس کی ایک حقیقت ہے۔ لیکن ایسی حکومت نہ ہوتی ہے نہ ہو سکتی ہے جس میں ایک قوم دوسری قوم پر راج کرے۔ ایک قوم دوسری قوم کا استحصال کر سکتی ہے اور اس کو جانوروں کی پرورش کے ایسے مرکز کے طور پر استعمال کر سکتی ہے جہاں خود اپنے باشندوں کے فائدے کے لئے دولت حاصل کر سکے۔'' اس بیان میں ایک گہری صداقت ہے۔ زیادہ تر لوگ عام طور سے دوسروں کے مفادات کا

خیال نہیں کیا کرتے۔ برطانوی رائے دہندگان اس حدتک انصاف پسند ہیں جس حدتک دوسرے ملکوں کے رائے دہندگان ہوا کرتے ہیں۔لیکن اُنہیں کون برطانوی رائے دہندگان کہے گا اگر وہ معمولاً اپنے مفادات کا پاس نہ کریں اور اپنے فائدے نقصان پر نظر نہ رکھیں۔ پارلیمنٹ رائے دہندگان کے احکام کی پابند ہے۔سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا جو برطانوی کابینہ کا رکن ہوتا ہے وزرا کی مشترک خواہشات کے خلاف نہیں جا سکتا۔کاونسل کے اراکین سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مقرر کرتا ہے۔ان کے متعلق کسی طرح نہیں سمجھا جاسکتا کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہندوستان کا وائسرائے خود سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کا ماتحت ہوتا ہے۔ ہندوستان پر حکومت کرنے کا اختیار وائسرائے کی عام کاونسل کو حاصل ہوتا ہے جو بقول سر ولیم ہنٹر ''چندسری حکومت'' کے مترادف ہے اور ہندوستان کے لوگوں کی نمائندگی نہیں کرتی۔ گورنر جنرل کی کونسل کے اراکین عام طور سے ان محکموں کے سربراہ ہوا کرتے ہیں جنہیں اخراجاتی محکمے کہنا چاہئے۔ جیسا کہ سر ڈیوڈ باربور (Sir David Barbour) نے ہندوستان کے اخراجات کا جائزہ لینے والے کمیشن (Indian Expenditure Commission) کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا ''عام طور سے رُجحان یہ ہے کہ محکمہ مالیات پر زیادہ روپیہ خرچ کرنے کے لئے زور ڈالا جاتا ہے۔اس کو زور ڈالنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔دوسرے محکمے زیادہ روپیہ خرچ کرنے پر برابر اصرار کرتے رہتے ہیں۔ان کے مطالبے مسلسل جاری رہتے ہیں۔'' ہندوستان کی حکومت کی مشینری میں ایسے عناصر کا فقدان ہے جو اخراجات میں کمی کے خواہشمند ہوں اور ایسی کوئی آواز نہیں جو محصول دہندگان کی نمائندگی کرے۔ موجودہ آئین میں مالیاتی اصلاحات کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر اخراجات میں کمی کرنی ہے تو آئین میں ایسی گنجائش نکالنی ہوگی کہ محصول دہندگان کے مفادات کی نمائندگی ہو سکے۔

تاریخ ہندوستان کی سلطنت کو جدید دور کا سب سے شاندار انسانی ادارہ قرار دے گی۔لیکن آئندہ کے مورخ نہایت افسوس کے ساتھ لکھیں گے کہ انگریزی راج نے ہندوستان کے لوگوں کو امن کی دولت تو دی مگر ان کے افلاس کو دُور نہ کر سکا،صنعت کاروں کی صنعتیں چھن گئیں،کسان بھاری اور غیر یقینی محاصل کے بوجھ کے نیچے دب گئے جس کی وجہ سے ان میں اتنی سکت بھی نہ رہی کہ تھوڑا بہت روپیہ پس انداز کر سکیں،قومی آمدنی کا بڑا حصہ انگلستان جانے لگا اور بار بار پڑنے

والے تباہ کن قحطوں نے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔اس کے برعکس خود انگریزوں کو اطمینان قلب حاصل ہو جائے گا اگر وہ کہہ سکیں کہ انگلستان جس طرح آئرلینڈ میں پچھلی غلطیوں کی تلافی کر چکا ہے۔اسی طرح اس نے بیسویں صدی میں ہندوستان کے تعلق سے ہونے والی پچھلی غلطیوں کی تلافی کر دی۔اُس نے مالگواری کی شرح کم کر دی،صنعتوں کو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا،ہندوستان کے لوگوں کو نمائندگی کا حق دے دیا اور وہاں کے لوگوں کے مفاد میں ہندوستان پر حکومت کی جس کی بناء پر وہاں کے لوگ محسوس کرنے لگے کہ وہ ایک عظیم و متحدہ سلطنت کے شہری ہیں۔

رمیش دت

لندن۔اگست 1906ء

# صنعتوں کا زوال

## (1813-1793)

پچھلے دو ابواب میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کی پہلی دہائی تک لوگوں کی ایک بڑی تعداد مختلف قسم کے پیدا آور کام کیا کرتی تھی۔ لاکھوں عورتیں کتائی کی اجرت سے اپنے خاندانوں کی آمدنیوں میں اضافہ کیا کرتی تھیں۔ لاکھوں انسان رنگ ریزی، چمڑہ رنگنے کا کام اور دھاتوں کا کام کیا کرتے تھے۔

لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ پالیسی نہیں تھی کہ ہندوستانی صنعتوں کو ترقی دی جائے۔ پچھلے ایک باب میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ 1769ء میں ڈائریکٹروں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ بنگال میں خام ریشم کی صنعت کو فروغ دیا جائے اور ریشمی کپڑے بنانے کی صنعت کی ہمت شکنی کی جائے۔ انہوں نے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ ریشم کاتنے والوں کو کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے اور انہیں ''حکومت کے اختیارات استعمال کر کے اور سخت سزائیں دے کر'' (1) دوسروں کے لئے کام کرنے سے باز رکھا جائے۔ ان احکامات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ہندوستان میں ریشمی اور سوتی کپڑے کی صنعتوں کا زوال ہونے لگا اور وہ لوگ جو پچھلی صدیوں میں یورپ اور ایشیا کی منڈیوں کو مال مہیا کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ مقدار میں مال باہر سے منگوانے لگے۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اس (2) سوتی کپڑے کی قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو انگلستان سے بیس سال میں صرف ان بندرگاہوں کو بھیجا گیا تھا جو راس امید کے مشرق میں واقع تھے۔ یہ مال زیادہ تر ہندوستان آیا۔

# سال مختممه 5-جنوری

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1794ء | 156پاؤنڈ | 1804ء | 5,936پاؤنڈ |
| 1795ء | 717پاؤنڈ | 1805ء | 31,943پاؤنڈ |
| 1796ء | 112پاؤنڈ | 1806ء | 48,525پاؤنڈ |
| 1797ء | 2,501پاؤنڈ | 1807ء | 46,549پاؤنڈ |
| 1798ء | 4,436پاؤنڈ | 1808ء | 69,841پاؤنڈ |
| 1799ء | 7,317پاؤنڈ | 1809ء | 1,18,404پاؤنڈ |
| 1800ء | 19,575پاؤنڈ | 1810ء | 74,695پاؤنڈ |
| 1801ء | 21,200پاؤنڈ | 1811ء | 1,14,649پاؤنڈ |
| 1802ء | 16,191پاؤنڈ | 1812ء | 1,07,306پاؤنڈ |
| 1803ء | 27,876پاؤنڈ | 1813ء | 1,08,824پاؤنڈ |

1813ء میں کمپنی کے چارٹر کی تجدید ہوئی۔ اس تجدید سے پہلے تحقیقات کی گئی تھی اور گواہوں کے بیانات لئے گئے تھے۔

وارن ہسٹنگز، ٹامس منرو اور سر جان مالکم کی طرح کے اہم گواہوں کے بیانات لئے گئے تھے اور ہاؤس آف کامنز نے ہندوستان کے لوگوں کی عام خوشحالی کے لئے سخت تشویش کا اظہار کیا تھا۔ لیکن جہاں تک صنعتوں کا تعلق تھا پارلیمنٹ کے اراکین نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ برطانوی مصنوعات کس طرح ان اشیا کی جگہ لے سکتی ہیں اور ہندوستانی صنعتوں کی قربانی دے کر برطانوی صنعتوں کو کیوں کر فروغ دیا جاسکتا ہے۔

پچھلی نصف صدی میں ہندوستان کو بار بار قحطوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جس سال گواہوں کے بیانات قلمبند کئے گئے تھے اس سال بھی ایک قحط بمبئی کو تباہ کر رہا تھا۔ بنگال اور مدراس میں صنعت وحرفت کا زوال ہو چکا تھا۔ پھر بھی گواہوں کے قلمبند کئے جانے والے بیانات میں ایک سوال بھی ایسا نہیں ملتا جس سے ظاہر ہو کہ دولت اُن ذرائع کی تجدید کے طریقے معلوم کرنے کی

کوشش کی گئی تھی جن پر قوم کی خوشحالی کا انحصار تھا۔اس کے بجائے ہمیں لگا تار اس قسم کے سوالات ملتے ہیں جن کے ذریعے وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ برطانوی مصنوعات کو کس طرح ہندوستان کے لوگوں کے سر منڈھا جاسکتا ہے۔

وارن ہسٹنگز سے سوال کیا گیا ''کیا آپ ہندوستان کے لوگوں کی عادات واطوار سے واقفیت کی بنا پر یہ بتا سکتے ہیں کہ ہندوستان کے لوگوں میں، خود اُن کے استعمال کے لئے، یورپی اشیا کی طلب کا امکان ہے۔''

وارن ہسٹنگز نے جواب دیا ''تجارت اُن اشیا کو مہیا کرتی ہے جن سے لوگوں کی ضرورتیں اور آسائش کے مطالبے پورے ہوں۔ ہندوستان کے افلاس زدہ لوگوں کی کوئی ضرورتیں نہیں ہیں۔ان کی ضرورتیں ان کے مکانوں، ان کی غذا اور ان کے تھوڑے بہت کپڑوں تک محدود ہیں اور یہ تمام اشیا اُنہیں اُس زمین سے مل سکتی ہیں جس پر وہ رہتے ہیں۔''(3)

سر جان مالکم نے، جو ہندوستان کے لوگوں کے درمیان ایک عمر بتا چکا تھا اور ان کے متعلق اتنی واقفیت رکھتا تھا جتنی کہ اس کے بعد کوئی انگریز حاصل نہ کر سکا، اس قوم کے حسن سیرت کی زور دار الفاظ میں تعریف کی۔شمالی ہند کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے کہا ''وہاں کے ہندو انسانوں کی ایسی قوم نہیں جن کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ اپنے اعلیٰ اخلاق کی بنا پر اس سے زیادہ نمایاں ہیں...... جتنے کہ وہ اپنی کچھ ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر ہیں۔وہ بہادر، عالی ظرف اور کریم النفس ہیں اور ان کی حق گوئی اُن کی جرأت کی طرح قابل ذکر ہے۔'' جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ برطانوی اشیا کے صارف بن سکتے ہیں یا نہیں تو اس نے جواب میں کہا ''وہ برطانوی اشیا کے صارف نہیں بن سکتے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس برطانوی اشیا کو خریدنے کے ذرائع نہیں ہیں چاہے اپنی سیدھی سادھی زندگی اور معمولی لباس کے باوجود اُن کی ضرورت محسوس کریں۔''(4)

گریم مرسر (Greum Mercer) نے، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت کے علاوہ مالگزاری کے اور سیاسی محکموں میں بھی کام کر چکا تھا، ہندوستان کے لوگوں کے متعلق کہا کہ وہ ''طبیعتاً رحم دل، طور طریق میں شائستہ، خاندانی رشتوں میں بامحبت، حکومت کے تابعدار اور مذہبی امور سے خصوصی لگاؤ رکھنے والے ہوتے ہیں اور مذہبی رسموں کی پابندی کرنے

اور تقریبیں منانے میں خصوصیت برتتے ہیں۔'' ہندوستانیوں کو یورپی مال سے روشناس کرانے کے تعلق سے اُس نے کہا کہ لارڈ ویلزلی نے روہیل کھنڈ میں میلے شروع کر کے اس مال کے لئے منڈیاں تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان میلوں میں برطانوی اونی کپڑوں کی نمائش کی جاتی تھی اور اس نے برطانوی ریذیڈنٹ کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس مقصد کے لئے ہردوار کے بڑے میلے میں شرکت کرے۔(5)

ایک اور گواہ جان اسٹریسی (John Stracy) کا بیان قابل ذکر ہے۔ اُس نے حکومت بنگال کے انڈر سکریٹری کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمہ عدلیہ میں کام کیا تھا۔ اُس نے کہا کہ ہندوستانی مزدور کی ماہوار آمدنی 3 شلنگ 6 پنس سے 7 شلنگ 6 پنس تک ہوتی ہے۔ اس قسم کی قوم یورپی مال کس طرح استعمال کرسکتی ہے۔ ''میرے علم میں یہ بات نہیں کہ وہ معمولاً یورپ کی بنی ہوئی کوئی بھی چیز استعمال کرتے ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ اونی کپڑے اور بڑے عرض کی نفیس سیاہ بانات وہ استعمال کر لیتے ہوں جو اتفاقی طور سے انہیں سستے داموں مل جاتی ہو۔''(6)

اس قسم کے سوالات ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ بات انسانی سرشت کے خلاف ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی خاطر اپنے مفادات قربان کر دے اور انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں انگریز مدبّروں نے امکانی کوشش کی کہ ہندوستانی صنعتوں کی قربانی کر کے برطانوی صنعتوں کو فروغ دیا جائے۔ کمپنی کے گورنر جنرل اور تجارتی ریذیڈنٹوں کی مدد سے برطانوی مصنوعات ہندوستانیوں کے سر تھوپے گئے اور امتناعی محاصل عائد کر کے ہندوستانی مصنوعات کو انگلستان جانے سے روکا گیا۔ اس کی تشریح ایک تاجر جان رینکنگ (John Ranking) کے بیان سے ہوتی ہے جس نے ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے شہادت دی تھی۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا ہاؤس میں فروخت ہونے والی اشیا پر بکری ٹیکس کتنا ہے۔''

''اُس کپڑے پر جس کو چھینٹ کہا جاتا ہے 3 پاؤنڈ 6 شلنگ 8 پنس فیصدی محصول درآمد لگایا جاتا ہے۔ اگر اس کپڑے کی کھپت انگلستان میں ہوتی ہے تو اس پر 68 پاؤنڈ 6 شلنگ 8 پنس فیصدی کا مزید محصول عاید کیا جاتا ہے۔''

ایک قسم کا مال اور جس کو ململ کہا جاتا ہے۔ اس پر 10 فی صدی محصول درآمد عاید کیا جاتا ہے۔ اگر اس کپڑے کی کھپت انگلستان میں ہوتی ہے تو اس پر 27 پاؤنڈ 6 شلنگ 6 پنس فی صدی کا مزید محصول عاید کیا جاتا ہے۔

''ایک اور قسم رنگین کپڑے کی ہے۔ اس کا استعمال اس ملک میں ممنوع ہے۔ اس پر 3 پاؤنڈ 6 شلنگ 8 پنس فی صدی محصول درآمد عاید کیا جاتا ہے۔ یہ کپڑا صرف برآمد کیا جاتا ہے۔''

''پارلیمنٹ کے اس اجلاس میں تمام محاصل کو یکجا کر کے اس پر 20 فی صدی کا محصول عاید کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس چھینٹ پر، جس کی کھپت انگلستان میں ہو، 78 پاؤنڈ 6 شلنگ 8 پنس فی صدی محصول اور انگلستان میں استعمال ہونے والی ململ پر 31 پاؤنڈ 6 شلنگ 8 پنس فیصدی محصول ہو گیا ہے۔''

ان امتناعی محاصل کے حقیقی مقاصد کو چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ جان رینلنگ نے مزید کہا تھا ''میں اس کو حفاظتی محصول سمجھتا ہوں تاکہ ہمارے مصنوعات کو ترقی دی جا سکے۔'' (7)

ان محاصل کا ہندوستانی مصنوعات پر کیا اثر ہوا؟ ہنری سینٹ جان ٹکر کا نام شمالی ہند کے بندوبست کے سلسلے میں پچھلے کسی باب میں آچکا ہے۔ وہ ہندوستان کا بہت زیادہ تجربہ حاصل کرنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو کر انگلستان واپس گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائریکٹر ہو گیا۔ اس نے ہندوستان کی طرف سے انگلستان کی تجارتی پالیسی کے اثرات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ پارلیمانی کمیٹی کی مندرجہ بالا تحقیقات کے دس سال بعد یعنی 1823ء میں لکھتے ہوئے اس نے نہایت زوردار الفاظ میں اس پالیسی کی مذمت کی تھی۔

''ہم نے ہندوستان کے تعلق سے اس ملک میں کیا تجارتی پالیسی اختیار کی ہے؟ ریشمی کپڑے اور وہ کپڑے جو ریشم اور سوت ملا کر بنے ہوتے ہیں مدتوں پہلے ہماری منڈیوں سے خارج کئے جاچکے تھے۔ حال میں کچھ تو 67 فی صدی محصول کی وجہ سے اور زیادہ تر بہتر مشینوں کی وجہ سے سوتی کپڑا بھی، جو ہندوستان کی خاص پیداوار ہے، نہ صرف اس ملک سے خارج کیا جاچکا ہے بلکہ ہم اپنے ایشیائی مقبوضات کی جزوی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنا سوتی کپڑا برآمد کر رہے ہیں۔ ہندوستان اس طرح ایک صنعتی ملک سے ایک زراعتی ملک میں تبدیل کر دیا گیا

ہے۔"(8)

اس سے بھی زیادہ اہم ہندوستان کے مورخ ایچ۔ایچ۔ولسن کی غیر جانبدارانہ رائے ہے۔

"اس ملک کے ہندوستان کونقصان پہنچانے کی ایک تکلیف دہ مثال یہ بھی ہے جس کا وہ محکوم ہوگیا ہے۔شہادت کے دوران (1813ء میں) کہا گیا تھا کہ ہندوستان کا بنا ہوا سوتی اور ریشمی کپڑا اس وقت بھی برطانوی منڈی میں انگلستان کے بنے ہوئے کپڑے کے مقابلے میں 50 سے 60 فی صدی تک کم قیمت پر بیچا جا سکتا ہے اور پھر بھی اس پر منافع کمایا جا سکتا تھا۔اس لئے یہ ضروری ہو گیا کہ ہندوستانی کپڑے کی قیمت پر 70 اور 80 فی صدی محصول عاید کر کے انگلستان کے بنے ہوئے کپڑے کا تحفظ کیا جائے۔اس کو دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی کپڑے کو ممنوع قرار دے دیا جائے۔اگر ایسا نہ کیا جاتا،اگر امتناعی محاصل واحکام نہ موجود ہوتے تو پیزلے (Paisly) اور مانچسٹر (Manchester) کے کارخانے شروع ہوتے ہی رک جاتے اور بھاپ کی طاقت بھی انہیں دوبارہ حرکت میں نہ لا سکتی۔ہندوستانی مصنوعات کو قربان کر کے انہیں وجود میں لایا گیا ہے۔اگر ہندوستان آزاد ہوتا تو وہ انتقامی کارروائی کرتا، برطانوی مصنوعات پر امتناعی محاصل عائد کرتا اور اس طرح اپنی پیداواری صنعت کو تباہ ہونے سے بچا لیتا۔حفاظت خود اختیاری کی اسے اجازت نہیں دی گئی۔وہ اجنبی کے رحم وکرم پر تھا۔برطانوی مال اس کے سر پر تھوپا گیا جس پر کوئی محصول نہیں ادا کیا جاتا تھا اور بدیسی صنعت کاروں نے اس مد مقابل کو دبانے اور آخر میں اُس کا گلا گھونٹنے کے لئے سیاسی ناانصافی کا سہارا لیا جس سے وہ برابر کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔"(9)

جب کہ ہندوستانی مصنوعات کی ہمت شکنی کرنے کے لئے انگلستان میں اس پالیسی پر عمل کیا جارہا تھا ہندوستان میں جو طریقہ اختیار کیا گیا اس سے حالات میں سدھار ممکن نہ تھا۔ملک کی آمدنی کمپنی کی سرمایہ کاری پر خرچ کی جارہی تھی یعنی ہندوستانی مال کی خرید پر صرف کی جارہی تھی جو یورپ برآمد کیا جاتا تھا، وہاں فروخت ہوتا تھا اور اس کا کوئی تجارتی معاوضہ نہیں ملا کرتا تھا۔ملک کا کتنا روپیہ اس طرح صرف کیا گیا یہ مندرجہ ذیل فہرست سے ظاہر ہوگا۔"(10)

| سال | صنعت کاری کی اصل قیمت، ہندوستان |
|---|---|
| 1793-94ء | 12,20,106 پاؤنڈ |
| 1794-95ء | 12,88,059 پاؤنڈ |
| 1795-96ء | 18,21,512 پاؤنڈ |
| 1796-97ء | 17,08,379 پاؤنڈ |
| 1797-98ء | 10,25,204 پاؤنڈ |
| 1798-99ء | 20,19,265 پاؤنڈ |
| 1799-1800ء | 16,65,689 پاؤنڈ |
| 1800-1801ء | 20,13,975 پاؤنڈ |
| 1801-1802ء | 14,25,168 پاؤنڈ |
| 1802-1803ء | 11,33,526 پاؤنڈ |
| 1803-4ء | 11,87,007 پاؤنڈ |
| 1804-5ء | 10,88,700 پاؤنڈ |
| 1805-6ء | 13,35,460 پاؤنڈ |
| 1806-7ء | 9,86,310 پاؤنڈ |
| 1807-8ء | 8,87,119 پاؤنڈ |
| 1808-9ء | 10,13,740 پاؤنڈ |
| 1809-10ء | 12,40,315 پاؤنڈ |
| 1810-11ء | 9,63,429 پاؤنڈ |
| 1811-12ء | 11,10,909 پاؤنڈ |
| **19 سال کا کل میزان** | **2,51,34,672 پاؤنڈ** |

اس سرمایہ کاری کا طریقہ حسب ذیل تھا۔ جب ڈائریکٹر مطلوبہ رقم کے متعلق اطلاع دیتے تھے تو ہندوستان کا تجارتی بورڈ کارخانوں کو اس حکم کی نقلیں بھیج دیا کرتا تھا جہاں مال بنایا جاتا تھا۔

کارخانوں کے تجارتی ریذیڈنٹ آرڈر کو مختلف ذیلی کارخانوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اور بنکروں کو ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ ایک معینہ دن پر کارخانوں میں حاضر ہو کر پیشگی روپیہ حاصل کر لیں۔

ہر بنکر کے نام پیشگی رقم درج کر دی جاتی تھی اور جو مال وہ مہیا کر دیتا تھا اس کی قیمت اس میں مجرا کر دی جاتی تھی۔ اگر بنکر شرح کے متعلق اعتراض کرتے تھے تو تجارتی بورڈ اپنی رائے کے مطابق اُس کا فیصلہ کر دیا کرتا تھا۔(11)

ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی نے 1813ء میں گواہوں کے جو بیانات قلمبند کئے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح اس طریقہ کا ناجائز استعمال کیا جاتا تھا۔ ٹامس منرو نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ بارہ محل میں کمپنی کے ملازمین خاص خاص بنکروں کو جمع کر کے اس وقت تک پہرہ میں رکھتے تھے جب تک وہ صرف کمپنی کو مال مہیا کرنے کا معاہدہ نہ کر لیں۔(12) جو بنکر ایک دفعہ پیشگی روپیہ لے لیا کرتا تھا پھر وہ مشکل ہی سے اپنا پیچھا چھڑا سکتا تھا۔ اگر وہ مال بھیجنے میں دیر کرتا تھا تو اس سے جلدی کام کروانے کے لئے ایک چپڑاسی تعینات کر دیا جاتا تھا اور اس کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کیا جا سکتا تھا۔ چپڑاسی تعینات کرنے کی صورت میں بنکر پر ایک آنہ یومیہ جرمانہ کیا جاتا تھا۔ چپڑاسی لاٹھی کے ذریعہ اکثر کام کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی بنکروں پر جرمانہ کیا جاتا تھا اور اس کو وصول کرنے کے لئے اُن کے بھرت کے برتنوں پر قبضہ کر لیا جاتا تھا۔(13) اس طرح گاؤں کے تمام بنکر کمپنی کے کارخانوں کے غلام بن گئے تھے۔ مسٹر کاکس نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ جس کارخانے کے وہ سربراہ تھے اس کے زیر اختیار 1,500 بنکر تھے۔ اس تعداد میں بنکروں کے خاندانوں کے افراد اور لواحقین شامل نہیں۔

بنکروں پر جو اختیار حاصل کر لیا گیا تھا وہ صرف ایک رواج نہیں تھا بلکہ ایک ریگولیشن کے ذریعے اس کو قانونی شکل دے دی گئی تھی۔ اس ریگولیشن کی رو سے کمپنی سے پیشگی روپیہ حاصل کرنے والا بنکر کسی حال میں کسی دوسرے شخص کے لئے، چاہے وہ یورپین ہو یا ہندوستانی، نہ اس قسم کا کام کر سکتا ہے جس کے لئے وہ کمپنی سے معاہدہ کر چکا ہو اور نہ وہ مال دے سکتا ہے جس کا کمپنی سے وعدہ کیا جا چکا ہو۔'' اگر وہ حسب وعدہ کپڑا مہیا نہ کر سکے تو '' تجارتی ریذیڈنٹ کو اختیار حاصل ہوگا کہ جلدی کام کروانے کے لئے اس پر چپڑاسی تعینات کر دے۔'' اگر بنکر اپنا کپڑا کسی اور شخص کے ہاتھ فروخت کر دے تو اس کے خلاف '' دیوانی عدالت میں مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔'' اگر '' وہ

بنکر جن کے پاس ایک سے زیادہ کرگھا ہو اور جو ایک یا ایک سے زیادہ کاریگر رکھتے ہوں تحریری معاہدے کے مطابق کپڑا مہیا نہ کرسکیں تو انہیں ہر اُس تھان کی معہودہ قیمت کا 35 فی صدی بطور جرمانہ ادا کرنا ہوگا جو وہ وقت پر نہ دے سکیں۔''

زمینداروں اور کسانوں کو ''ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ تجارتی ریذیڈنٹوں اور ان کے ملازمین کے بنکروں تک پہنچنے میں حارج نہ ہوں۔'' اور انہیں کمپنی کے ''تجارتی ریذیڈنٹوں کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی کے ساتھ پیش آنے سے سختی کے ساتھ منع کیا جاتا ہے۔'' (14)

اگر صنعت کار غلام بنا کر رکھا جائے تو مصنوعات نشو و نما نہیں پا سکتے۔ اس نظام کا بدترین نتیجہ یہ تھا کہ کمپنی کے ملازموں نے تو ہندوستان کے صنعت کاروں پر اختیار حاصل کر ہی لیا تھا لیکن دوسرے یورپیوں نے زیادہ اختیارات حاصل کر لئے تھے اور ان کے استعمال میں وہ زیادہ سختی برتتے تھے۔

وارن ہسٹنگز نے کہا تھا کہ ''ہندوستان میں انگریز کا کردار بدل جاتا ہے۔ انگریز کے نام سے خود اس کی حفاظت ہوتی ہے اور اس کو ایسے جرائم کے ارتکاب کے مواقع ملتے ہیں جن کے ارتکاب کی جرأت وہ انگلستان میں نہیں کرسکتا۔''

لارڈ ٹین ماؤتھ نے کہا تھا ''میرے خیال میں اس امر کا امکان ہے کہ ملک کے اندرونی حصوں میں یورپیوں کے داخلے اور مقامی لوگوں سے اُن کے میل ملاپ کا نتیجہ یہ ہو کہ مقامی لوگوں میں اعلیٰ صفات پیدا کرنے کی بجائے اُن کی نظروں میں یورپیوں کا عام کردار گر جائے۔''

ٹامس منرو نے کہا تھا ''مجھے اُن تاجروں میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا ہے جو اس ملک کو چھوڑتے وقت متین و سنجیدہ ہوتے ہیں یا اس کے برعکس وہ جب ایسے لوگوں کے درمیان پہنچ جاتے ہیں جو مزاحمت نہیں کر سکتے اور جن پر حکم چلایا جاسکتا ہے تو وہ مشکل سے اپنی متانت و سنجیدگی برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان جانے والے ہر تاجر کے لئے سمجھا جاتا ہے کہ وہ حکومت سے منسلک ہے۔ میں نے سنا ہے کہ پچھلے تین چار سال میں ---- میرے خیال میں 1810ء میں بنگال میں یہ واقعہ پیش آیا---- نجی تاجروں نے، جو نیل کی تجارت کرتے تھے، مقامی لوگوں کو کاٹھ میں ڈالا، اپنے ملازموں وغیرہ کو جمع کیا اور ایک دوسرے سے جنگ کی جس میں بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔''

ٹامس سیڈن ہیم (Thomas Sydenham) نے کہا تھا ''میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ دوسری قوموں کے مقابلے میں انگریز بدیسی ملکوں میں زیادہ تشدد سے کام لیتے ہیں اور میرے خیال میں ہندوستان کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔'' (15)

انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں یورپین تاجروں اور نیل کی کوٹھیوں کے مالکوں نے ملک کے اندرونی حصوں میں بہت زیادہ تشدد سے کام لیا۔ حکومت کو اس موضوع پر مجسٹریٹوں کو گشتی چٹھیاں بھیجنی پڑیں۔ گشتی چٹھی مورخہ 13- جولائی 1810ء میں کہا گیا تھا۔

''وہ جرائم جن کے متعلق مندرجہ ذیل باتیں کہی گئی تھیں اور جو نیل کی کوٹھیوں کے مالکوں کے خلاف انفرادی طور سے پوری طرح ثابت ہو گئے ہیں، مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کر دیئے جائیں۔''

''اول ۔۔۔۔ تشدد کے ایسے واقعات جو قانون کی رو سے قتل کی تعریف میں نہ آتے ہوں لیکن اُن کی وجہ سے مقامی لوگوں کی موت واقع ہوئی ہو۔''

''دوم ۔۔۔۔ اس بقایا رقم کی وصولیابی کے لئے جس کو واجب الوصول بتایا جاتا ہو یا دوسرے اسباب کی بنا پر مقامی لوگوں کا حبس بے جا خصوصاً انہیں کاٹھ میں ڈالنے کا جرم۔''

''سوم ۔۔۔۔ اپنے کارخانوں سے متعلق لوگوں کو اور دوسرے لوگوں کی شورش پسندانہ انداز سے جمع کرنا اور نیل کی کوٹھیوں کے دوسرے مالکوں کے ساتھ بلوہ کرنا۔''

''چہارم ۔۔۔۔ کسانوں اور دوسرے مقامی لوگوں کی غیر قانونی طریقے سے لاٹھی یا کسی دوسرے آلہ حرب وضرب سے زدوکوب کرنا۔''

گشتی چٹھی میں مجسٹریٹوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کاٹھ تلف کروادیں، کسانوں کے کوڑے مارنے اور دوسری جسمانی سزائیں دینے کی رپورٹ کریں اور نیل کی کوٹھیوں کے یورپین مالک جب تک حکومت کے احکامات کی پابندی نہ کریں انہیں ملک کے اندرونی حصوں میں آباد ہونے سے باز رکھیں۔ ایک اور گشتی چٹھی میں، جو 20- جولائی 1810ء کو جاری کی گئی تھی، مجسٹریٹوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ان واقعات کی رپورٹ کریں جہاں نیل کی کوٹھیوں کے مالک کسانوں کو پیشگی روپیہ لینے پر اور نیل کی کاشت کرنے پر غیر قانونی طریقوں سے مجبور کرتے ہیں۔ (16)

لیکن بنگال میں نیل کی کوٹھیوں کے مالکوں کے مظالم نصف صدی تک جاری رہے۔ یہاں

تک کہ بنگال کے لوگ بغاوت و مزاحمت پر مجبور ہو گئے۔ 1859ء کی نیل کی شورش کے بعد بنگال کے زیادہ تر حصوں میں یورپین باغداروں نے نیل کی کاشت ختم کر دی۔

بنگال کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار دین بندھو مترا نے اپنی یادگار تمثیل ''آئینہ نیل'' میں باغداروں کے مظالم کو پیش کیا ہے۔ کلکتہ ہائی کورٹ نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کے جرم میں ریورنڈ جیمس لانگ پر جرمانہ کیا اور اس کو قید کی سزا دی۔ لوگ اب بھی جذبہ احسان مندی کے ساتھ ایشلے ایڈن (Ashley Eden) کا نام یاد کرتے ہیں جو بعد میں بنگال کا لیفٹیننٹ گورنر ہو گیا تھا۔ اس نے ظلم کو ختم کرنے کے لئے مسلسل کوشش کی۔

آسام میں چائے کی کاشت کے لئے مزدور فراہم کرنے کی خاطر اب بھی ایک خصوصی قانون موجود ہے جس کو لوگ ''غلامی کے قانون'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ناواقف مرد اور عورتیں معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد فوجداری قانون کی دفعات کے تحت مجبور ہوتے ہیں کہ ایک معینہ مدت تک چائے کے باغوں میں کام کریں۔ آسام کے چیف کمشنر نے امسال (1801ء) ہر امکانی کوشش کی کہ باغات میں مجبوراً کام کرنے کے دوران غریب مزدوروں کو مناسب اجرت مل سکے لیکن وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ہمیں ایک دفعہ پھر 1813ء کے بیان کی طرف واپس آنا چاہئے۔

1813ء کی پارلیمانی تحقیقات سے ہندوستانی صنعت کاروں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ امتناعی محاصل میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ کمپنی کی سرمایہ کاری کو نہیں روکا گیا بلکہ پورے ایوان کی کمیٹی نے اس کو صاف صاف منظوری دے دی۔

''مذکورہ بالا لگانوں، مال گزاریوں یا منافعوں کی پوری یا جزوی بچت جو مختلف مدوں کی رقموں کا تعین کرنے کے بعد اور مذکورہ بالا مختلف اخراجات پورے کرنے کے بعد باقی بچے اس سے ہندوستان میں کمپنی کی سرمایہ کاری کی جا سکتی ہے، چین بھیجی جا سکتی ہے تاکہ وہاں سرمایہ کاری کی جا سکے یا ہندوستان میں قرض ادا کیا جا سکتا ہے یا کسی اور ایسے کام کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے، جس کی بورڈ آف کمشنرز کی منظوری کے بعد کورٹ آف ڈائریکٹرز وقتاً فوقتاً ہدایت کرے۔'' (17)

مورخ ایچ۔ ایچ۔ ولسن کا کہنا ہے کہ 1813ء کے پارلیمانی مباحثے میں ''یہ تو درست ہے

کہ ہندوستانی مفادات کے متعلق تشویش کا اظہار بہت کھل کے کیا گیا تھا لیکن اس بات کو ثابت کرنا ذرا مشکل ہوگا کہ جن لوگوں نے مباحثے میں حصہ لیا ان کی اکثریت شاہ کی ہندوستانی رعایا کی خوش حالی کے لئے بے لوث جذبے سے متاثر ہوئی تھی۔۔۔۔انگلستان کے تاجروں اور صنعت کاروں کی نظریں اپنے منافعوں پر تھیں۔(18)

1813ء کی پارلیمانی تحقیقات کا اصل مقصد انگلستان کے صنعت کاروں کے مفادات کو فروغ دینا تھا۔نپولین بوناپارٹ نے برطانوی صنعت کاروں کو یورپی بندرگاہوں سے بے دخل کر دیا تھا،انگلستان کے تاجر اور صنعت کار دشواریوں کا سامنا کر رہے تھے اور اس کی صنعتی پیداوار کو فروخت کرنے کے نئے راستے دریافت نہ کئے جاسکنے کی صورت میں ملک کو خطرات لاحق ہو سکتے تھے۔ان حالات نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری کے خلاف قومی مطالبے کو تقویت پہنچائی اور 1813ء میں جب چارٹر کی تجدید ہوئی تو ہندوستان کے ساتھ تجارت میں کمپنی کی اجارہ داری کو ختم کر دیا گیا۔اس طرح برطانوی تاجروں کو پہلی دفعہ ہندوستان تک پہنچنے کی آزادی نصیب ہوئی۔یہ بات انسانی فطرت کے خلاف تھی کہ وہ ہندوستانی صنعت کاروں کی خوش حالی کے لئے خود کو تشویش میں ڈالتے۔

## حوالہ جات


1- عام مراسلہ مورخہ 17-مارچ 1749ء۔

2- ہاؤس آف کامنز کی مناسب کارروائی کرنے کی ہدایت کا جواب مورخہ 4-مئی 1813ء۔

3- ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے متعلق شہادت وغیرہ کی روداد (1813ء) صفحہ 3
وارن ہسٹنگز نے ہندوستان کے لوگوں کے عام کردار کے متعلق ہاؤس آف لارڈز کی کمیٹی کے سامنے جو رائے دی تھی اس کا اقتباس باب 3 میں دیا جاچکا ہے۔

4- ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے متعلق شہادت وغیرہ کی روداد (1813ء)۔صفحات 54 اور 570۔

5- ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے متعلق شہادت وغیرہ کی روداد (1813ء) صفحہ 296۔

6- ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعلق شہادت وغیرہ کی روداد (1813ء) صفحات 23 اور 172۔

7- ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے متعلق شہادت وغیرہ کی روداد (1813ء) صفحات 463 اور 467۔

8- ہندوستانی حکومت کی یادداشتیں جو ہنری سینٹ جان ٹکر کے کاغذات کا انتخاب ہے۔ (لندن 1853ء) صفحہ 494۔

9- مل "History of British India" ولسن کا بدستور، جلد اول، باب 8، حوالہ

10- بیان مندرجہ صفحہ 487، ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے متعلق شہادت وغیرہ، 1813ء

11- ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے متعلق شہادت وغیرہ (1813ء) صفحہ 532۔

12- ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کے متعلق شہادت وغیرہ (1813ء) صفحہ 153۔

13- ایضاً، صفحات 537-539۔

14- 1793ء کا ریگولیشن نمبر 31۔

15- شہادت کی روداد وغیرہ (1813ء)، صفحات 2، 10، 138، 359۔

16- شہادت کی روداد وغیرہ (1813ء)، صفحہ 537۔

17- پورے ایوان کی کمیٹی کی تجویز، 1813ء۔

18- مل "History of British India" جس کو ولسن نے جاری رکھا، جلد اول، باب 8۔

❁❁❁❁❁

# لکھنے والوں کا تعارف

| | |
|---|---|
| 1- طاہر کامران: | گورنمنٹ کالج لاہور یونیورسٹی شعبہ تاریخ کے صدر |
| 2- ظفر علی خان: | سابق پروفیسر انگریزی، گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور |
| 3- پرویز وندل: | سابق پروفیسر، انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور، وزٹنگ پروفیسر لاہور یونیورسٹی آف منیجمنٹس اور نیشنل کالج آف آرٹس لاہور |
| 4- ندیم عمر: | اسسٹنٹ پروفیسر نیشنل کالج آف آرٹس لاہور |
| 5- حسین احمد خان: | ریسرچ اسکولر، ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز سیل، نیشنل کالج آف آرٹس لاہور |
| 6- ڈاکٹر محمد علی صدیقی: | اردو کے معروف تنقید نگار |
| 7- ڈاکٹر طاہر، خان: | صنفی موضوع پر ماہر معروف اسکالر |
| 8- سعود الحسن خان: | شعبہ فلسفہ، پنجاب یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے طالب علم |
| 9- پروفیسر ریاض صدیقی: | اردو کے مشہور ادیب، ریٹائرڈ پروفیسر اردو، گورنمنٹ سندھ |
| 10- بلال احمد: | جرنلسٹ |